ہم فکری سے ہم راہی تک
افکار و تحریر : سید جہانزیب عابدی
(جلد سوئم)

اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَ آلِ مُحَمَّد وعَجِّل فَرَجَهُم

انتساب

اس روشنی کے نام جو ہمارے تاریک ترین اوقات میں رہنمائی کرتی ہے،

امام زمانہ عج کے لیے، انسانوں کے نجات دہندہ، خدا کی نشانی حضرت بقیۃ اللہ،

اور اپنے والدین کے لیے، جو میرے وجود کی بنیاد ہیں، ظاہری اور فکری،

سید سرکار حیدر عابدی (مرحوم) اور سیدہ رفعت عابدی (حفظ اللہ تعالیٰ عنہا)

آپ کی محبت اور حکمت میرے رہنما ستارے رہے ہیں اور

ان سرپرستوں اور روحانی مربیوں کے نام جنہوں نے میرا راستہ روشن کیا، منزل کو واضح کیا۔۔۔

آیت اللہ سید حسین مرتضیٰ نقوی (حفظ اللہ تعالیٰ عنہ) اور ان کے اہل خانہ، اور

حجۃ الاسلام والمسلمین سید غلام عباس رضوی (حسین آغا) حفظ اللہ تعالیٰ عنہ

نیز آیت اللہ شیخ شبیر حسن میثمی، حجۃ الاسلام والمسلمین سید ظفر مہدی نقوی، حجۃ الاسلام والمسلمین سید علی سلمان نقوی، حجۃ الاسلام والمسلمین شیخ نور عالم، دامت توفیقاتہم

آپ حضرات کی تعلیمات نے زندگی کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے اور عقل و دانش سے فائدہ اٹھانے کے طریق واضح کیے،

میری پیاری بیوی سیدہ مہوش زہرہ، جن کی زحمتیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کیلئے ایک مقالہ لکھنا پڑے،

اور میرے نوجوان بیٹے،

سید محمد حسین مہدی، مستقبل کی روشن کرنوں میں سے ایک کرن،
آپ سب کی غیر متزلزل حمایت اور پشت پناہی میرے سفر کو تیز کرتی ہے۔
میرے پورے خاندان کے لیے، لامتناہی طاقت اور محبت کا ذریعہ،
برادران حجۃ الاسلام سید شعیب عابدی، عدیل عابدی، مصطفیٰ عابدی،
بہنیں اسرا اور فرحین، اور میرے پیارے سسرالی، ماں اور باپ اور بہنیں،
اے خدا تو میرے وجود کی جڑ ہے، زندگی کے طوفانوں میں مجھے مضبوطی سے تھامے ہوئے ہے،
میرے ساتھ چلنے والے دوستوں اور خیر خواہوں کے نام،
آپ کی ہمدردی اور حوصلہ افزائی میرے لیے باعث برکت ہے۔
عاجزی کے ساتھ، میں "ہم فکری سے ہم راہی تک" کتاب آپ سب کے نام کرتا ہوں۔
یہ کتاب یہ علمی و فکری لگن آپ میں سے ہر ایک کے لیے میری شکر گزاری اور پیار کا ایک چھوٹا سا نذرانہ ہے۔ آپ سب میرے آسمان میں بالائی برج ہیں، زندگی کے سفر میں میری رہنمائی کر رہے ہیں۔ آپ کی محبت، حکمت اور تعاون اس کتاب کے صفحات میں بنُے ہوئے ہیں اور میں اس کام کی تشکیل میں آپ کے کردار کے لیے ہمیشہ مقروض ہوں۔
دل کی گہرائیوں سے شکریہ اور اٹوٹ محبت کے ساتھ!

سید جہانزیب عابدی

فہرست

کچھ کتاب کے بارے میں

الحمد للہ، جو ہمیں عقل اور فہم کے اس راستے پر لے کر آیا ہے، جو ہمیں اسلامی اصولوں اور معاشرتی اصولوں کی روشنی میں زندگی کی راہنمائی کرتے ہیں۔ اسلامی اصولوں پر مبنی زندگی کے فکری اور علمی مسائل کو حل کرنے کا مقصد، ہمارے دین کے ثبوتی دلائل کو فراہم کرنا ہے۔

یہ کتاب مستقل فکری محنت اور مشاہدے اور اصلاح کے عمل کا نتیجہ ہے۔ یہ مضامین زندگی کے متفرق زندہ موضوعات پر مشتمل ہیں جو اس عرصے میں زیر قلم آئے، یہ ایک خود اونچ نیچ کا سفر ہے، جس میں میری زندگی کے مختلف مراحل کا تجربہ شامل ہے، جس نے میری فہم اور تجدید کو اضافی روشنی دی ہے۔

اس کتاب میں اسلامی اصولوں کو بنیاد بنا کر ایک خالص فکری کاوش پیش کی گئی ہے۔ اس سے اختلاف کا حق اختلاف کی اہمیت اور احترام کے باعث روا ہے ہر ایک کے پاس خود کے خیالات اور رائے کا حق ہوتا ہے اور وہ اپنے خیالات کو پیش کر سکتا ہے۔

اس کتاب میں قرآن، حدیث، تاریخ، علمیات، نفسیات، سیاسیات، معاشیات، ابلاغیات، اور دیگر سماجی علوم کی موٹی موٹی باتوں کو متعدد مواقع پر پیش کیا گیا ہے، تاکہ ہم اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سمجھ سکیں اور ان کو اپنی زندگی میں عمل میں لا سکیں۔

یہ کتاب خصوصی طور پر نوجوانوں کیلئے ہے، تاکہ وہ اس میں سے کام کی باتیں انتخاب کریں اور اپنے فکری جولان کو بڑھا سکیں۔ اس کتاب کی تیاری کے اسباب نے میری زندگی کو تبدیل کیا ہے، اور میری امید ہے کہ یہ اپنی مخصوص اہمیت کے ساتھ آپ کی زندگی کو بھی تبدیل کرے گی۔

کتاب میں موجود متن میرے اپنے افکار ہیں اور ان کی لکھائی میں تراش خراش اور نوک پلک کے سنوارنے کا کام چیٹ جی پی ٹی سے لیا گیا۔

اس کتاب کو پڑھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی امید کے ساتھ، میں آپ کو اسلامی اصولوں پر مبنی زندگی کے فکری اور علمی مسائل کو حل کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اس کتاب کو پڑھ کر، آپ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کا راستہ تلاش کر سکیں گے اور اپنے اصولوں کو مضبوط کرنے میں کافی کامیاب رہیں گے۔ ان شاء اللہ

عابدی

zaib.abidi.pk@gmail.com

اچھائی اور برائی کی انسانی فطرت

انسانی فطرت مثبت رویوں اور اعلیٰ اخلاقی صفات کو پسند کرتی ہے۔ یہ رجحان اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ انسان کی تخلیق ایک پاکیزہ فطرت پر ہوئی ہے، جو خوبیوں کی طرف مائل اور برائیوں سے دور رہنے کی خواہش رکھتی ہے۔ مثبت رویے جیسے سچائی، انصاف، محبت، اور رحم دلی انسانی دل میں خوشی اور سکون پیدا کرتے ہیں، کیونکہ یہ صفات معاشرتی اور انفرادی ترقی کے لیے ضروری ہیں۔

انسانی فطرت کی گہرائی میں مثبت رویوں کی محبت اور منفی رویوں سے بیزاری ایک ایسا خداداد اصول ہے جو انسان کی شخصیت اور اس کے طرزِ عمل کی بنیاد بنتا ہے۔ یہ رجحان اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اللہ نے انسان کو نہ صرف شعور اور سمجھ بوجھ دی ہے بلکہ اسے اچھائی کو پہچاننے اور اپنانے کی ایک اندرونی صلاحیت سے بھی نوازا ہے۔ جب انسان مثبت عادتوں، جیسے ایمانداری، صبر، اور ایثار کو اپناتا ہے، تو وہ اپنے اندر سکون اور اطمینان محسوس کرتا ہے۔ یہ سکون اس بات کی دلیل ہے کہ یہ صفات انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں۔

دوسری طرف، جب انسان برائیوں، جیسے لالچ، بددیانتی، یا ظلم کی طرف مائل ہوتا ہے، تو اس کے دل میں بے چینی اور اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ یہ بے اطمینانی اس بات کی علامت

ہے کہ اس کا رویہ اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برائی کے راستے پر چلنے والے لوگ بھی ایک نہ ایک وقت پر اپنے اعمال پر ندامت محسوس کرتے ہیں اور ان سے توبہ کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔

منفی رویے اور برائیاں، جیسے جھوٹ، ظلم، نفرت، اور خود غرضی، انسانی دل کو بوجھل اور معاشرتی ماحول کو زہر آلود کر دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان ان سے نفرت کرتا ہے اور فطری طور پر ان کے خاتمے کی خواہش رکھتا ہے۔ قرآن پاک بھی انسانی فطرت کے اس پہلو کو اجاگر کرتا ہے، جہاں نیکیوں کو اپنانے اور برائیوں سے اجتناب کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس کی وضاحت اس بات سے ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اچھائی اور برائی کی پہچان عطا کی اور اسے اختیار دیا کہ وہ اپنی فطرت کے مطابق مثبت راستہ اختیار کرے۔

یہ اصول معاشرتی سطح پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں اچھائی اور انصاف کی اقدار کو فروغ دیا جائے، وہاں امن اور خوشحالی کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جہاں برائیاں غالب ہوں، وہاں فساد، اختلاف، اور بے چینی عام ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی تاریخ میں تمام بڑے مصلحین اور انبیاء نے لوگوں کو اچھائیوں کی طرف مائل کرنے اور برائیوں سے روکنے کی جدوجہد کی ہے۔

یہ حقیقت ہمیں یہ سمجھاتی ہے کہ اگر انسان برائیوں میں مبتلا ہوتا بھی ہے تو اس کی فطرت کبھی مطمئن نہیں ہوتی، اور وہ اچھائی کی طرف واپسی کے لیے بے چین رہتا ہے۔ لہٰذا، انسانی

معاشرہ بھی ان اصولوں پر قائم ہوتا ہے جہاں مثبت اقدار کو فروغ دیا جاتا ہے اور برائیوں کو روکنے کے لیے اجتماعی کوششیں کی جاتی ہیں۔

انسانی فطرت کے اس پہلو کا ادراک ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ اگر ہم اپنی زندگی میں حقیقی خوشی اور کامیابی چاہتے ہیں، تو ہمیں اپنی فطرت کے مطابق مثبت عادتوں کو اپنانا ہوگا اور برائیوں سے اجتناب کرنا ہوگا۔ یہ نہ صرف ہمارے اپنے لیے فائدہ مند ہوگا بلکہ ہمارے ارد گرد کے لوگوں اور پورے معاشرے کے لیے بھی۔

اختلاف کے باوجود اتحاد سے رہنا

نکتہ نظر کے اختلاف کے ساتھ مل جل کر رہنے کا مطلب ہے کہ مختلف خیالات اور آراء کو تسلیم کرتے ہوئے باہمی احترام اور رواداری کے ساتھ زندگی گزاری جائے۔ یہ زندگی میں نہایت اہم اور ضروری ہے، خاص طور پر ایک متنوع اور مختلف الثقافتی معاشرے میں۔ اختلافات کو برداشت کرنے اور دوسروں کی رائے کو سمجھنے سے سماجی ہم آہنگی اور مثبت تعلقات کو فروغ ملتا ہے۔

اختلاف کے باوجود دوسروں کی رائے اور خیالات کا احترام ضروری ہے۔ یہ سوچنا غلط ہے کہ صرف اپنی ہی رائے درست ہے۔ اختلاف کرتے وقت نرم لہجہ استعمال کرنا اور دوسروں کی بات کو مکمل طور پر سننا اہم ہے۔ دوسروں کی بات کو بغیر کسی تعصب کے سننا چاہیے اور ان کے خیالات کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہر کسی کا نکتہ نظر ان کے تجربات اور پس منظر کی وجہ سے مختلف ہو سکتا ہے، اور جب آپ دوسروں کی رائے کو توجہ سے سنتے ہیں تو یہ ان کو قبولیت کا احساس دیتا ہے۔

اگر کوئی مسئلہ پیدا ہو تو اس پر تحمل سے بات چیت کی جائے اور مل جل کر کوئی درمیانی راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی جائے۔ اختلافات کو دلیل اور منطقی بات چیت سے حل کرنا بہتر ہے، نہ کہ غصے یا جذبات کے ذریعے۔ دوسروں کی رائے کے بارے میں پہلے سے رائے قائم

نہ کی جائے بلکہ کھلے ذہن سے سوچا جائے اور اپنے خیالات کو بہتر بنانے کے لیے مختلف زاویوں کو بھی مد نظر رکھا جائے۔ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ہر شخص مختلف پس منظر اور تجربات سے آیاہوتا ہے، جس کی وجہ سے اس کے خیالات آپ سے مختلف ہوسکتے ہیں۔

گفتگو کا ادب بھی نہایت ضروری ہے۔ اختلاف کے دوران شائستگی اور صبر کا مظاہرہ کریں اور کبھی بھی دوسرے کی ذاتی حیثیت پر تنقید نہ کریں، بلکہ صرف موضوع تک محدود رہیں۔ اختلافات کے باوجود یہ یاد رکھیں کہ آپ کے اور دوسرے شخص کے درمیان کئی مشترکہ پہلو بھی ہو سکتے ہیں۔ مشترکہ اہداف اور دلچسپیوں پر توجہ مرکوز کرنے سے اختلافات کم ہوسکتے ہیں۔

نکتہ نظر کے اختلاف کے ساتھ مل جل کر رہنے کی اہمیت یہ ہے کہ یہ سماجی ہم آہنگی کو فروغ دیتاہے اور مختلف طبقوں کے بیچ بہتر تعلقات قائم کرتا ہے۔ دوسروں کے خیالات کو سمجھنے سے ہم اپنی معلومات اور فہم میں اضافہ کرتے ہیں، اور دنیا کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کا موقع ملتاہے۔ مختلف نقطہ ہائے نظر ہمیں مسائل کے نئے اور مؤثر حل تلاش کرنے میں مدد دیتے ہیں، اور جب لوگ مختلف خیالات اور تجربات کو اکٹھا کرتے ہیں تو بہتر اور جامع حل نکالے جاسکتے ہیں۔

اختلافات کے باوجود مل جل کر رہنے سے صبر، رواداری، اور برداشت جیسی خصوصیات کو فروغ ملتا ہے، جو ہماری اخلاقی ترقی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ ایک پرامن اور مثبت

ماحول پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے، جہاں لوگ آزادانہ طور پر اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ سکون سے رہ سکتے ہیں۔ یہ معاشرتی ترقی اور خوشحالی کا ذریعہ بنتا ہے۔

نکتہ نظر کے اختلاف کے ساتھ مل جل کر رہنا ہمیں رواداری، احترام، اور دوسروں کے خیالات کو تسلیم کرنے کی راہ سکھاتا ہے۔ یہ معاشرتی ہم آہنگی، مسائل کے بہتر حل، اور ایک مثبت و پرامن ماحول کے لیے بہت ضروری ہے۔

اختلافات کو تسلیم کرنے کے لیے سب سے پہلے اپنی انا کو قابو میں رکھنا ضروری ہے۔ اختلافات کا مطلب کسی کی عزت کم کرنا نہیں، بلکہ یہ تسلیم کرنا ہے کہ ہر شخص کی سوچ، علم، اور پس منظر مختلف ہے۔ اپنی بات منوانے کے بجائے دوسروں کی بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہ رویہ نہ صرف ایک مضبوط معاشرتی ڈھانچہ تشکیل دیتا ہے بلکہ دلوں کو قریب لانے میں بھی مددگار ہوتا ہے۔

اختلافات کے دوران تحمل اور برداشت کا مظاہرہ کرنا انتہائی اہم ہے۔ کبھی کبھی دوسرے کی بات کو سننا ہی کافی ہوتا ہے، کیونکہ سننے کا عمل ہی تعلقات کو مضبوط بنانے کا ایک ذریعہ ہے۔ قرآن مجید ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم اچھے انداز میں بات کریں اور اگر کوئی بات ہمارے دل کو نہ بھائے تو اسے حکمت اور نرمی سے حل کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" :مؤمن

وہ ہے جو دوسروں کے لیے آسانی پیدا کرے اور سختی سے پرہیز کرے۔"

یہ بھی ضروری ہے کہ اختلافات کو ایک مثبت موقع کے طور پر لیا جائے، نہ کہ دشمنی یا ناچاقی کی بنیاد کے طور پر۔ اختلافات درحقیقت سیکھنے اور نئے نقطہ نظر کو سمجھنے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ جب مختلف خیالات اور آراء ایک جگہ جمع ہوتی ہیں تو بہتر فیصلے اور تخلیقی حل سامنے آتے ہیں۔

معاشرے میں مختلف مذاہب، زبانوں، اور ثقافتوں کے افراد کے ساتھ رہنے کے لیے بین المذاہب ہم آہنگی کو فروغ دینا ضروری ہے۔ قرآن ہمیں حکم دیتا ہے کہ " :اور نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی میں مدد نہ کرو۔ " (سورہ مائدہ: 2)۔ یہ اصول معاشرتی تعلقات کو مضبوط بنانے اور مختلف گروہوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

اختلافات کو ختم کرنے کے لیے مشترکہ انسانی اقدار کو اہمیت دینا ضروری ہے۔ انصاف، احسان، اور انسانیت کی خدمت وہ اصول ہیں جو ہر معاشرے میں یکساں طور پر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان اقدار کو فروغ دے کر ہم اختلافات کے باوجود ایک مضبوط اور پرامن معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں۔

آج کے دور میں، جہاں ڈیجیٹل میڈیا اور سوشل نیٹ ورکس نے اختلافات کو بڑھاوا دیا ہے، ضروری ہے کہ لوگ اختلافی موضوعات پر گفتگو میں اخلاقیات اور حکمت کو مد نظر رکھیں۔ اختلافات کو بڑھانے کے بجائے ایسے مواقع پیدا کریں جہاں مکالمے اور ہم آہنگی کے ذریعے مسائل حل ہوں۔

نکتہ نظر کے اختلاف کے ساتھ مل جل کر رہنا نہ صرف ایک معاشرتی ضرورت ہے بلکہ یہ دین اسلام کا ایک عظیم درس بھی ہے۔ رسول اکرم ﷺ اور اہل بیت علیہم السلام نے اپنے عملی نمونوں سے ہمیں سکھایا کہ کس طرح اختلافات کے باوجود دوسروں کے ساتھ حسنِ سلوک کیا جائے۔ امام علی علیہ السلام کا قول ہے" :لوگ تمہارے بھائی ہیں، یا تو دین میں یا پھر انسانیت میں۔"

یہ درس ہمیں سکھاتا ہے کہ اختلافات کو دشمنی کے بجائے رحمت سمجھا جائے اور اپنی زندگی کو ایک دوسرے کے لیے آسان بنایا جائے۔ یوں ہم نہ صرف اپنے دلوں کو سکون دے سکتے ہیں بلکہ ایک مثالی اور خوشحال معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں۔

احساس کمتری سے باہر نکلیں

خود ترسی کی صفت انسان کی زندگی میں ایک نہ ختم ہونے والا منفی چکر پیدا کرتی ہے، جس میں وہ اپنی مشکلات اور چیلنجز پر ضرورت سے زیادہ توجہ دیتا ہے، جس سے وہ مزید کمزوری کا شکار ہو جاتا ہے۔ جب انسان اپنی مشکلات کو اپنے وجود کا حصہ سمجھ کر ان پر مسلسل روناروتا ہے، تو وہ اپنے آپ کو کمزور اور بے بس محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس خود ترسی کے احساس میں غرق ہو کر، وہ اپنی صلاحیتوں اور امکانات کو نظر انداز کرتا ہے، اور اس کے دل و دماغ میں امید کی جگہ مایوسی بڑھتی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مسائل کے حل کی کوشش کرنے کے بجائے، ان میں غم اور پریشانی کا شکار ہو جاتا ہے۔

اسلامی تعلیمات میں خود ترسی کو ایک منفی رویہ سمجھا گیا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا" : جو شخص خود پر ترس کھاتا ہے، وہ اپنے دشمن سے زیادہ نقصان پہنچاتا ہے "۔ اس قول کا مفہوم یہ ہے کہ اگر انسان اپنے حالات میں ہمیشہ خود کو غمگین اور کمزور سمجھے گا، تو وہ اپنی تقدیر بدلنے کے بجائے، اپنے آپ کو مزید مشکلات میں پھنسائے گا۔ خود ترسی کی حالت میں، انسان اپنی مشکلات کو اتنا بڑھا چڑھا کر دیکھتا ہے کہ وہ اپنے اندر کی طاقتوں کو پہچاننے میں ناکام ہو جاتا ہے۔

خود ترسی کی حالت میں، انسان یہ سوچتا ہے کہ اس کی مشکلات اس کی تقدیر کا حصہ ہیں اور وہ ان سے چھٹکارا حاصل کرنے میں بے بس ہے۔ یہ سوچ اس کی ذہنی سکون کو برباد کر دیتی ہے اور وہ اپنی زندگی میں تبدیلی لانے کی کوشش نہیں کرتا۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا" :مشکلوں کا مقابلہ کرنے والے ہی عظیم ہوتے ہیں، جو ان سے گزر کر کامیابی حاصل کرتے ہیں"۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ مشکلات کا سامنا کرنا ہماری شخصیت کو مضبوط بناتا ہے اور ہمیں اپنی مشکلات سے لڑنے کی طاقت فراہم کرتا ہے۔ ہر انسان کی زندگی میں مشکلات آتی ہیں، لیکن یہ ضروری ہے کہ ہم ان کا مقابلہ کرنے کی بجائے ان میں غمگین نہ ہو جائیں۔

خود ترسی کی حالت سے نکلنے کا پہلا قدم یہ ہے کہ انسان اپنے ذہن کو مثبت سوچ کی طرف مائل کرے۔ وہ اپنی مشکلات کو چیلنج کے طور پر دیکھے اور ان کے حل پر توجہ مرکوز کرے۔ جب ہم اپنے مسائل کو ایک حل کی ضرورت سمجھ کر دیکھتے ہیں، تو ہم ان کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا کرتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی زندگی کے ہر پہلو میں امید کی روشنی دیکھیں اور اس بات پر یقین رکھیں کہ اللہ کی مدد ہمیشہ ہمارے ساتھ ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا" :تو یقین رکھ، اللہ تمہارے ساتھ ہے، جو بھی مشکلات آئیں، اللہ تمہیں ان سے نکالنے کا راستہ دکھائے گا "(سورہ الطلاق، 65:2-3)۔

دوسری طرف، انسان کو یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر مشکل میں ایک سبق چھپا ہوتا ہے۔ جب ہم خود ترسی میں غرق ہو جاتے ہیں، تو ہم اس سبق کو نہیں دیکھ پاتے۔ حضرت امام علی علیہ

السلام نے فرمایا" : مشکلات کا سامنا کرنے والے کو علم و حکمت حاصل ہوتی ہے، جو اسے کامیابی کی راہ پر گامزن کرتا ہے "۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مشکل انسان کو ترقی اور سیکھنے کے لیے ایک موقع فراہم کرتی ہے۔ جب ہم مشکلات کا سامنا کرتے ہیں، تو ہم اپنی طاقتوں اور صلاحیتوں کو بہتر طریقے سے سمجھتے ہیں، جو کہ ہماری شخصیت کی تکمیل میں مدد دیتی ہیں۔

خود ترسی کی حالت سے نکلنے کے لیے ایک اور اہم قدم یہ ہے کہ ہم اپنے اندر خود اعتمادی کو پیدا کریں۔ جب ہم اپنے آپ پر یقین رکھتے ہیں اور اپنے اندر طاقت محسوس کرتے ہیں، تو ہم مشکلات کا سامنا زیادہ مضبوطی سے کرتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں اپنے آپ کو مثبت طریقے سے دیکھنا ہو گا اور اپنی کامیابیوں کو یاد رکھنا ہو گا۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا" : اپنے آپ پر ایمان رکھو، تم وہ کر سکتے ہو جو تم چاہو "۔ اس حدیث سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر انسان اپنے اندر ایمان پیدا کرتا ہے، تو وہ اپنی مشکلات کا سامنا بہادری سے کر سکتا ہے۔

خود ترسی سے بچنے کے لیے انسان کو اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرنی چاہیے اور ہر حالت میں اپنے آپ کو مضبوط اور خود مختار سمجھنا چاہیے۔ جب ہم اپنی مشکلات کو ایک عبور کرنے والے مرحلے کے طور پر دیکھیں گے اور ان میں حل کی تلاش کریں گے، تو ہم نہ صرف ان پر قابو پا لیں گے بلکہ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کی سمت میں بھی آگے بڑھیں گے۔

نتیجتاً، خود ترسی کا جال ہمیں اپنی مشکلات کے حل سے دور کرتا ہے اور ہمیں کمزوری کے احساس میں غرق کر دیتا ہے۔ لیکن جب ہم مثبت سوچ اپناتے ہیں اور خود اعتمادی کے ساتھ اپنے مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں، تو ہم نہ صرف اپنی زندگی کو بہتر بناتے ہیں بلکہ اپنی روحانی اور ذہنی سکونت کو بھی مستحکم کرتے ہیں۔

خود ترسی کا جال انسان کی زندگی میں ایک سنگین رکاوٹ بن سکتا ہے، کیونکہ یہ انسان کو اپنے مسائل میں اتنا غرق کر دیتا ہے کہ وہ اپنے اندر کی طاقتوں کو پہچاننے میں ناکام رہتا ہے۔ اس جال میں پھنس کر انسان نہ صرف اپنے حالات کو بہتر بنانے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ وہ زندگی کے دیگر پہلوؤں میں بھی اپنی توانائیوں کو ضائع کر دیتا ہے۔ انسان جب اپنی مشکلات کو اپنے پورے وجود کا حصہ سمجھ کر ان پر مسلسل توجہ دیتا ہے، تو وہ اپنی طاقت اور صلاحیتوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کی مشکلات کو بڑھا چڑھا کر دیکھنے لگتا ہے اور اس کی نظر میں کوئی حل نہیں ہوتا۔

اسلامی نقطہ نظر سے، خود ترسی کی حالت میں رہنا اللہ کی رضا کے خلاف ہے۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" : اللہ اس بندے کو پسند کرتا ہے جو اپنی مشکلات کو صبر اور شجاعت کے ساتھ برداشت کرتا ہے"۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان اپنے مشکلات کا سامنا صبر سے کرتا ہے اور ان پر رونے کے بجائے ان کا حل تلاش کرتا ہے، تو اللہ کی مدد اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ خود ترسی میں غرق ہونے کے بجائے انسان کو اپنی

مشکلات کے ساتھ جینا سیکھنا چاہیے اور اللہ کی رضا پر راضی رہنا چاہیے۔ اس سے انسان کی روح میں سکون آتا ہے اور اس کے دل میں امید کا چراغ روشن رہتا ہے۔

خود ترسی کی حالت میں انسان اپنی ناکامیوں کو اتنی بڑی حقیقت سمجھنے لگتا ہے کہ وہ کبھی آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کی تقدیر میں صرف مشکلات اور غم ہی لکھے ہیں، لیکن یہ حقیقت نہیں ہے۔ اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ مشکلات اور چیلنجز زندگی کا حصہ ہیں، اور ان کا سامنا کرنا انسان کی ترقی اور مضبوطی کا سبب بنتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا" : جو شخص مشکلات کا سامنا کرتا ہے، وہ زندگی میں کامیاب ہوتا ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم اپنی مشکلات کا صحیح طریقے سے سامنا کریں تو وہ ہمیں کامیابی کی راہ دکھاتی ہیں۔

خود ترسی کا ایک اور نقصان یہ ہے کہ یہ انسان کی ذاتی ترقی میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ جب ہم اپنے مسائل پر فوکس کرتے ہیں اور ہمیشہ اپنے آپ کو غمگین اور بے بس سمجھتے ہیں، تو ہم اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام کا کہنا ہے" : اگر تم خود کو کسی بات پر مجبور نہ کرو، تو تم کبھی عظیم نہیں بن پاؤ گے "۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اپنے آپ پر اعتماد کرنا چاہیے اور اپنے اندر کی طاقتوں کو پہچان کر ان کا استعمال کرنا چاہیے تاکہ وہ اپنے مسائل کا حل نکال سکے۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب انسان خود ترسی سے باہر نکل کر اپنے اندر کی قوتوں کو پہچاننے کی کوشش کرے۔

خود ترسی سے نجات پانے کے لیے انسان کو سب سے پہلے اپنے ذہن کو مثبت سوچ کی طرف مائل کرنا چاہیے۔ ہمیں اپنی زندگی کے ہر پہلو میں حل کی تلاش کرنی چاہیے اور مشکلات کو ایک نیا سبق سمجھنا چاہیے۔ جب ہم اپنی مشکلات کو ایک چیلنج سمجھ کر ان کا مقابلہ کرتے ہیں تو نہ صرف ہم ان پر قابو پاتے ہیں بلکہ ہم اپنی شخصیت کو بھی نکھارتے ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا" : اللہ کسی شخص کو اس کی استطاعت سے زیادہ ذمہ داری نہیں دیتا " (سورہ البقرہ، 2:286)۔ اس آیت میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اللہ ہمیں جو بھی مشکلات دیتا ہے، وہ ہماری طاقت کے مطابق ہوتی ہیں۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم ان مشکلات کا بہتر طریقے سے سامنا کر سکتے ہیں۔

دوسری طرف، خود ترسی میں مبتلا شخص اپنی کامیابیوں کو نظر انداز کرتا ہے اور ہمیشہ ماضی کی ناکامیوں یا موجودہ مشکلات پر فوکس کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ اپنی موجودہ زندگی میں چھوٹی کامیابیوں کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی توانائیوں کا ضیاع کرتا ہے اور اپنی صلاحیتوں کو پہچاننے میں ناکام رہتا ہے۔ حضرت امام علی علیہ السلام نے فرمایا" : اگر تم اپنی کامیابیوں کا شکر ادا کرو گے، تو اللہ تمہیں مزید کامیاب کرے گا"۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ انسان کو اپنی کامیابیوں کا شکر ادا کرنا چاہیے تاکہ اللہ کی مزید برکات اس پر نازل ہوں۔

خود ترسی سے باہر نکلنے کے لیے انسان کو ایک دوسرے کی مدد لینے کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ جب ہم اپنی مشکلات کا سامنا کرتے ہیں، تو بعض اوقات ہمیں دوسرے لوگوں کی

رہنمائی اور مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی دوست، رشتہ دار، یا مشیر سے بات کرنے سے ہمیں اپنی مشکلات کا حل مل سکتا ہے اور ہم اپنی سمت درست کر سکتے ہیں۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا" : مسلمانوں کے درمیان سب سے بہترین وہ شخص ہے جو دوسروں کی مدد کرے "۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو دوسروں کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے، اور اس مدد سے وہ اپنے مسائل کا حل تلاش کر سکتا ہے۔

آخر کار، خود ترسی سے بچنے کے لیے انسان کو اپنی زندگی کے ہر پہلو میں امید اور شکر گزاری کا رویہ اپنانا چاہیے۔ جب ہم اپنی زندگی میں خوشی، سکون اور کامیابی کی تلاش کرتے ہیں، تو ہم اپنی مشکلات پر غمگین ہونے کے بجائے ان کا حل نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے نہ صرف ہم اپنے مسائل پر قابو پاتے ہیں بلکہ ہماری زندگی کی کوالٹی بھی بہتر ہوتی ہے۔

اسلام اور حکومتی واقتصادی نظام

مغربی معاشی ماہرین کے نظریات جو موجودہ معاشی نظام کی ناکامی کی جانب اشارہ کرتے ہیں، ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ موجودہ سرمایہ داری اور مارکیٹ پر مبنی نظام نے معاشی عدم مساوات کو جنم دیا ہے اور وسائل کی تقسیم میں گہرے فرق پیدا کر دیے ہیں۔ اس نظام کی بنیاد پر معیشت میں بے تحاشا منافع کا لالچ اور ذاتی مفاد کو اہمیت دی جاتی ہے، جس کے نتیجے میں دولت کا ارتکاز ایک چھوٹی سی اشرافیہ کے ہاتھوں میں آجاتا ہے، اور عام آدمی کی حالت بدتر ہوتی جاتی ہے۔

مغربی معاشی ماہرین نے یہ بھی کہا ہے کہ موجودہ نظام میں قدرتی وسائل کا بے دریغ استعمال اور ماحولیاتی نقصان نے دنیا کو شدید ماحولیاتی بحران کا شکار بنا دیا ہے۔ یہ نظام ماحولیات کے تحفظ اور پائیدار ترقی کے اصولوں کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔ مزید یہ کہ عالمی سطح پر قرضوں کا بوجھ بھی مسلسل بڑھ رہا ہے، جس نے مالی بحرانوں کی صورت میں عالمی معیشت کو کئی بار متاثر کیا ہے۔

اسلامی اقتصادیات کی طرف رجوع اس لیے کیا جا رہا ہے کیونکہ یہ ایک متوازن اور انسانیت کی فلاح کے اصولوں پر قائم ہے۔ اسلامی نظام میں مالیات اور معیشت کا جو تصور ہے، وہ

لوگوں کے مابین وسائل کی منصفانہ تقسیم کی بنیاد پر قائم ہے۔ اسلامی معاشی اصول جیسے سود کا خاتمہ، زکات کا نظام، اور معاشی انصاف کی کوششیں اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ اسلامی اقتصادیات نہ صرف فرد بلکہ پورے معاشرتی نظام کو مضبوط کرتی ہے۔ اس نظام میں دولت کا ارتکاز کسی فرد یا گروہ تک محدود نہیں ہوتا، بلکہ اس کا مقصد لوگوں کی معاشی حالت بہتر بنانا اور ایک منصفانہ معاشرہ قائم کرنا ہے۔ اس کے علاوہ، اسلام میں قدرتی وسائل کا تحفظ، ماحولیات کی حفاظت اور اقتصادیات میں فلاحی اقدامات کو اولین ترجیح دی جاتی ہے۔ اسلامی اقتصادی نظام مالی بحرانوں کے دور سے بھی بچاتا ہے کیونکہ یہ سود اور غیر متوازن قرضوں سے بچاتا ہے، اور اس میں کسی بھی قسم کی اقتصادی استحصال کی گنجائش نہیں ہوتی۔

مغربی اقتصادی ماہرین جنہوں نے عالمی معاشی نظام کی ناکامی کا اشارہ دیا ہے، وہ اس بات پر متفق ہیں کہ موجودہ معاشی نظام میں عدلیہ، معاشی اداروں اور حکومتی پالیسیوں کے درمیان یکجہتی کی کمی ہے، جس کی وجہ سے وسائل کی تقسیم غیر منصفانہ اور معاشی بحران گہرے ہو چکے ہیں۔ ان ماہرین کا یہ خیال ہے کہ موجودہ نظام نے دولت کا ارتکاز چند ہاتھوں میں کر دیا ہے، جس کی وجہ سے عوام کی اکثریت کو غربت اور معاشی عدم استحکام کا سامنا ہے۔

تاہم، سوال یہ ہے کہ کیا یہ معاشی نظام بغیر کسی مضبوط سیاسی اور حکومتی نظام کے کامیاب ہو سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب اسلامی نظام حکومت کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ اسلامی اقتصادی نظام کا نفاذ اس کے سیاسی نظام کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ اسلامی اقتصادیات دراصل اسلامی حکومت کے ایک حصے کے طور پر عمل کرتی ہے، جو اس بات کو

یقینی بناتی ہے کہ معاشی اصول صرف کتابی علم تک محدود نہ رہیں، بلکہ انہیں عملی طور پر بھی نافذ کیا جائے۔

اسلامی سیاسی نظام میں معاشی انصاف، وسائل کی منصفانہ تقسیم، معاشرتی فلاح، اور عوام کے حقوق کا تحفظ ایک مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسلامی حکومتی ڈھانچہ، جس میں شوریٰ، عدلیہ، اور انتظامیہ کا آپس میں تعاون شامل ہے، ایک ایسا مضبوط فریم ورک فراہم کرتا ہے جو اسلامی معاشی اصولوں کو کامیابی کے ساتھ نافذ کرنے کے قابل بناتا ہے۔ اس نظام میں حکومت کا کردار بہت اہم ہوتا ہے کیونکہ یہ عوامی فلاح کے لیے ایک منصفانہ معیشت قائم کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔

اسلامی نظام حکومت کے بغیر اسلامی اقتصادیات کا صحیح نفاذ ممکن نہیں، کیونکہ اسلامی اقتصادی اصول جیسے سود کا خاتمہ، زکات کا نظام، اور عدلیہ میں انصاف کا تقاضا کرتے ہیں کہ حکومت ان اصولوں پر عمل کرنے کے لیے موجود ہو۔ اس کے علاوہ، اسلامی حکومت کا مقصد صرف معیشت کو سنبھالنا نہیں ہوتا، بلکہ ایک جامع سیاسی، سماجی اور اخلاقی نظام فراہم کرنا ہوتا ہے جو معاشرتی فلاح کے تمام پہلوؤں کو یکجا کرتا ہے۔

لہذا، اسلامی اقتصادی نظام کو عالمی سطح پر کامیاب بنانے کے لیے ایک مکمل اسلامی حکومتی نظام کا قیام ضروری ہے تاکہ یہ نظام نہ صرف معاشی ترقی کو فروغ دے، بلکہ انسانی وقار، انصاف اور فلاح کی حقیقت کو بھی عملی طور پر قائم کرے۔

استعماری طاقتوں کے ہوتے ہوئے اسلامی نظام حکومت کو نافذ کرنے کے لیے جمہوری یا انقلابی طریقہ اختیار کرنے کی بات کی جائے تو دونوں طریقوں کے اپنے فوائد اور چیلنجز ہیں، اور دونوں میں ابتدائی مراحل میں فکری و شعوری ارتقاء کی اہمیت زیادہ ہے، تاکہ افراد کے عقائد مضبوط ہوں اور وہ اسلامی نظام کے اصولوں کو سمجھ کر ان کی حمایت کر سکیں۔ اس کے لیے مکی مرحلہ یعنی دعوت و تبلیغ، بنیادی عقائد کی استحکام اور فکری و شعوری ارتقاء کی ضرورت ہے تاکہ لوگ اس تبدیلی کے لیے تیار ہوں اور ان کے دل و دماغ میں تبدیلی کی پذیرائی ہو۔

جمہوری طریقہ ایک ایسا راستہ ہے جس میں عوامی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور حکومتی اداروں کے ذریعے تبدیلی لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس طریقے میں عوام کی رائے اور حمایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ جمہوری طریقہ اختیار کرنے کے لئے ابتدائی طور پر مکی مرحلے کی طرح فکری اور شعوری ارتقاء ضروری ہوگا تاکہ عوام اسلامی اقدار اور نظام کو سمجھ سکیں، اور انہیں یہ باور کرایا جاسکے کہ اسلامی نظام کی ضرورت ہے۔

مکی مرحلے میں، جیسا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمل کیا، تبلیغ اور دعوت کا مقصد لوگوں کو بنیادی عقائد، جیسے توحید، رسالت اور آخرت پر ایمان، پر بیدار کرنا تھا۔ یہی وہ عقائد ہیں جو اسلامی حکومت کے بنیادی ستون ہیں۔ اس مرحلے میں لوگوں کی ذہن سازی اور ان کے اندر اجتماعی تبدیلی کی صلاحیت پیدا کرنا بہت ضروری ہے، تاکہ جب وہ انتخابی

عمل میں حصہ لیں یا حکومتی نظام کو متاثر کریں تو ان کے انتخاب اسلامی اصولوں کے مطابق ہوں۔

جمہوری طریقہ میں، اس کے ساتھ ساتھ ایک قانونی اور آئینی اصلاحات کی ضرورت ہوگی تاکہ اس نظام کو استحکام مل سکے۔ اس کے لیے عوام کو تیار کرنا اور اسلامی اصولوں کی اہمیت کو اجاگر کرنا ضروری ہے۔

انقلابی طریقہ اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب موجودہ نظام میں اصلاحات ممکن نہیں رہتیں یا عوام میں اتنی بیداری ہو کہ وہ موجودہ سیاسی اور معاشی نظام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ انقلابی طریقہ میں زیادہ تیزی اور طاقت کا استعمال کیا جاتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ عوامی حمایت بھی اہمیت رکھتی ہے۔ اس طریقہ میں، فکری و شعوری ارتقاء کا مرحلہ پہلے سے زیادہ اہم ہوتا ہے تاکہ لوگ انقلاب کی بنیاد کو سمجھ سکیں اور اس کی حمایت کر سکیں۔

انقلابی طریقہ میں مکی مرحلے کی دعوت اور تبلیغ کا حصہ بنیادی عقائد اور اسلامی فلسفے کی وضاحت کرتا ہے، تاکہ لوگ نظام کی تبدیلی کے لئے تیار ہو سکیں۔ انقلابی طریقے میں عوام کو بیدار کرنے کے لئے سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل پر توجہ مرکوز کرنا ضروری ہے تاکہ یہ باور کرایا جاسکے کہ موجودہ نظام فلاحی نہیں ہے اور ایک اسلامی نظام کی ضرورت ہے۔

اسلامی انقلابی تحریکیں، جیسے ایران میں 1979 کا انقلاب، اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ انقلابی راستہ اس وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب عوام میں اسلامی نظام کے حوالے سے گہری

سمجھ اور بیداری ہو۔ انقلابی طریقہ میں فکری ارتقاء کا مقصد صرف عقائد کی اصلاح نہیں بلکہ ایک مکمل معاشی، سیاسی اور سماجی نظام کی تبدیلی ہوتا ہے۔

چاہے جمہوری طریقہ ہو یا انقلابی طریقہ، ابتدائی مراحل میں جو سب سے اہم کام ہے، وہ ہے لوگوں کے ذہنوں میں اسلامی نظام کی بنیادوں کی حقیقت کو واضح کرنا۔ مکی مرحلے کی طرح، دعوت و تبلیغ کا مقصد لوگوں کو اسلامی عقائد کی اہمیت اور ان کے فائدے کے بارے میں آگاہ کرنا ہے، تاکہ وہ نظام کی تبدیلی کی اہمیت کو سمجھیں۔ اس کے علاوہ، قرآن، سنت اور اسلامی اصولوں پر مبنی فکری و شعوری تحریک چلانا ضروری ہے۔

مکی مرحلے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کے عقائد کو مضبوط کرنے اور انہیں اسلام کی حقیقت سے آگاہ کرنے پر زور دیا۔ اسی طرح، آج کے دور میں بھی، اسلامی نظام حکومت کے نفاذ کے لئے لوگوں کو اس نظام کی حقیقت اور اس کے فوائد سے آگاہ کرنا ضروری ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ دونوں طریقوں میں، ابتدائی مراحل میں فکری اور شعوری ارتقاء کا عمل بہت اہم ہے۔ اس کے بغیر نہ جمہوری طریقہ کامیاب ہو سکتا ہے نہ انقلابی طریقہ، کیونکہ دونوں طریقوں کا مقصد لوگوں کی حمایت حاصل کرنا اور انہیں اسلامی نظام کے فوائد سے آگاہ کرنا ہے۔

اسلامی پروفیشنل ازم اور کارپوریٹ کلچر

اسلامی اقتصادی ثقافت اور جدید اقتصادی ثقافت کے مابین بنیادی فرق ان کے تصورات، مقاصد، اور اثرات میں پوشیدہ ہے۔ اسلامی اقتصادی ثقافت کی بنیاد روحانیت، اخلاقیات، اور اجتماعی فلاح و بہبود پر ہے، جبکہ جدید اقتصادی ثقافت زیادہ تر مادیت، انفرادیت، اور منافع پر مرکوز ہے۔ ان دونوں کے تقابلی تجزیے سے یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ اسلامی پروفیشنل ازم نہ صرف موجود ہے بلکہ انسانی فلاح کے لیے ایک جامع اور متوازن طریقہ فراہم کرتا ہے۔

اسلامی اقتصادی ثقافت کا محور یہ ہے کہ ہر عمل کو اللہ کی رضا کے لیے انجام دیا جائے۔ تجارت، ملازمت، اور پروفیشنل سرگرمیوں میں دیانت، انصاف، اور انسانیت کی بھلائی جیسے اصولوں کو فوقیت دی جاتی ہے۔ اسلامی پروفیشنل ازم میں کام کرنے والے شخص کو یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اس کا کام صرف اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ معاشرتی بھلائی کے لیے ہے۔ اس میں رزقِ حلال، خدمتِ خلق، اور مساوات جیسے تصورات کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ ملازمت کے دوران نہ صرف پیشہ ورانہ مہارت پر توجہ دی جاتی ہے بلکہ اخلاقی کردار اور نیت کو بھی اہمیت دی جاتی ہے۔ اسلامی اقتصادی ثقافت فرد کی انفرادیت کو ایک بڑی اجتماعی بھلائی کے دائرے میں پروان چڑھاتی ہے۔

دوسری طرف جدید اقتصادی ثقافت میں، خاص طور پر کارپوریٹ کلچر میں، مادیت کا غلبہ ہے۔ یہاں کامیابی کی تعریف زیادہ تر منافع، اہداف کی تکمیل، اور مالی فوائد تک محدود ہوتی ہے۔ ملازمت کا ماحول اکثر ایسی اقدار کو فروغ دیتا ہے جو انسان کو صرف ایک پیداواری مشین کے طور پر دیکھتی ہیں۔ جدید پروفیشنل ازم میں لباس، بات چیت، اور دیگر سماجی عادات کو بھی اسی تناظر میں ترتیب دیا جاتا ہے تاکہ وہ کارپوریٹ دنیا کے مادہ پرستانہ مقاصد کی تکمیل کر سکیں۔ یہاں اخلاقیات یا روحانی اقدار کو اکثر غیر اہم سمجھا جاتا ہے اور افراد کی خودغرضی یا انفرادیت کو بڑھاوا دیا جاتا ہے۔

یہ کہنا کہ اسلامی پروفیشنل ازم موجود نہیں یا غیر عملی ہے، ایک غلط فہمی ہے جو جدید اقتصادی کلچر کے غلبے کے سبب پیدا ہوئی ہے۔ اسلامی پروفیشنل ازم نہ صرف ایک حقیقت ہے بلکہ یہ ایک ایسا متوازن نظام پیش کرتا ہے جس میں فرد اور معاشرہ دونوں کی فلاح پوشیدہ ہے۔ اسلامی پروفیشنل ازم میں پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور روحانی تربیت پر بھی زور دیا جاتا ہے، جو کہ کسی بھی کامیاب پروفیشنل زندگی کے لیے ضروری ہے۔ اسلامی ثقافت میں کام کرنے والے کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کا کردار اس کے دنیاوی اور اخروی دونوں نتائج پر اثرانداز ہو گا، جو کہ جدید کلچر کی مادہ پرستی کے برعکس ایک جامع اور با مقصد نظریہ ہے۔

یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ جدید اقتصادی ثقافت صرف مادیت کو فروغ دینے تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا اثر افراد کی ذاتی زندگی، ان کے لباس، بات چیت کے انداز، اور طرزِ زندگی پر بھی پڑتا ہے۔ کارپوریٹ کلچر میں ظاہری نمائندگی اکثر اتنی اہم ہو جاتی ہے کہ افراد اپنے حقیقی اقدار اور شناخت کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ جدید پروفیشنل ازم کا یہ پہلو

نہ صرف مادہ پرستی کو بڑھاوا دیتا ہے بلکہ روحانی اور اخلاقی قدروں کو بھی متاثر کرتا ہے، جس کے نتیجے میں انسان ایک مشینی اور غیر متوازن زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اسلامی اقتصادی ثقافت اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ مادیت کو زندگی کے مقصد کے طور پر نہیں بلکہ ایک وسیلہ کے طور پر دیکھا جائے۔ اسلامی پروفیشنل ازم میں کام کا مقصد صرف مالی فوائد حاصل کرنا نہیں بلکہ اللہ کی رضا اور انسانیت کی خدمت ہے۔ اس کلچر میں ایک پروفیشنل اپنی شخصیت، مہارت، اور کردار کو ایک ایسی سطح پر لے جاتا ہے جہاں وہ نہ صرف اپنی ذات بلکہ معاشرے کے لیے بھی فائدہ مند ثابت ہو۔ یہ کلچر انسان کے دل و دماغ میں توازن پیدا کرتا ہے، جہاں روحانیت اور مادیت ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ جدید اقتصادی ثقافت کی مادہ پرستی کے برعکس اسلامی اقتصادی ثقافت ایک مکمل اور جامع نظام پیش کرتی ہے۔ اسلامی پروفیشنل ازم نہ صرف موجود ہے بلکہ ایک مثالی نظام ہے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں توازن، انصاف، اور بھلائی کو فروغ دیتا ہے۔ یہ کہنا کہ اسلامی پروفیشنل ازم کچھ نہیں ہوتا، ایک محدود سوچ کی علامت ہے، کیونکہ اسلامی تعلیمات کے مطابق ایک پیشہ ور فرد نہ صرف اپنی مہارت میں ترقی کرتا ہے بلکہ اپنی اخلاقیات، نیت، اور خدمت کے جذبے سے بھی ایک نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔

اسلامی و غیر اسلامی تجارت کی اقسام

اسلامی تجارت کی اقسام:

اسلامی تجارت میں مختلف اقسام ہیں جو شرعی اصولوں کے مطابق سرمایہ کاری اور تجارت کو یقینی بناتی ہیں۔ ان کا مقصد ایسے طریقے فراہم کرنا ہے جن میں سود (ربا) سے بچا جا سکے اور لین دین شفاف اور اخلاقی اصولوں کے مطابق ہو۔ یہاں اسلامی تجارت کی چند بنیادی اقسام دی گئی ہیں:

1۔ مشارکہ (شراکت داری)

مشارکہ میں دو یا زیادہ افراد مل کر ایک کاروبار میں سرمایہ کاری کرتے ہیں اور کاروبار کے منافع اور نقصان کو متعین شرائط کے مطابق تقسیم کرتے ہیں۔ اس میں تمام شریک افراد کا سرمایہ اور محنت شامل ہوتی ہے، اور سب کو ان کی سرمایہ کاری کے تناسب سے منافع ملتا ہے۔

2۔ مضاربہ (منافع پر شراکت)

مضاربہ میں ایک شخص یا ادارہ سرمایہ فراہم کرتا ہے (رب المال) اور دوسرا شخص یا ادارہ اپنی محنت یا مہارت لگاتا ہے (مضارب)۔ اگر کاروبار میں منافع ہو تو دونوں فریقین پہلے سے طے شدہ شرح کے مطابق منافع میں شریک ہوتے ہیں، جبکہ نقصان کی صورت میں سرمایہ

کار (رب المال) کو نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے، مگر محنت کرنے والا نقصان کی ذمہ داری سے آزاد ہوتا ہے۔

3۔ اجارہ (کرایہ داری)

اجارہ کا مطلب کرایہ پر دینا یا اجرت پر استعمال دینا ہے۔ یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب ایک فریق اپنا اثاثہ یا جائیداد دوسرے فریق کو متعین مدت اور معاوضہ پر استعمال کے لئے دیتا ہے۔ اجارہ میں اثاثے کی ملکیت فراہم نہیں کی جاتی، بلکہ صرف اس کا استعمال دیا جاتا ہے۔

4۔ مرابحہ (قیمت پر فروخت)

مرابحہ اس صورت میں ہوتی ہے جب ایک چیز کی خرید و فروخت میں اصل قیمت اور منافع پہلے سے طے شدہ ہوں۔ بینک یا ادارہ کسی چیز کو خریدتا ہے اور پھر اس پر کچھ منافع شامل کر کے گاہک کو فروخت کرتا ہے۔ مرابحہ میں خریدار کو پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز کس قیمت پر خرید رہا ہے۔

5۔ سلام (پیشگی خریداری)

سلام ایسی تجارت ہے جس میں خریدار پیشگی قیمت ادا کرتا ہے اور سامان یا جنس بعد میں فراہم کی جاتی ہے۔ یہ طریقہ خاص طور پر زرعی پیداوار یا ایسی چیزوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جو بعد میں مہیا کی جائیں گی۔

6۔ استصناع (آرڈر پر بنائی گئی چیز)

استصناع ایک قسم کا معاہدہ ہے جس میں ایک چیز کو آرڈر پر بنایا یا تیار کیا جاتا ہے اور پھر متعین وقت پر فراہم کی جاتی ہے۔ یہ تعمیرات یا آرڈر پر بننے والی مصنوعات میں استعمال ہوتی ہے، جہاں قیمت اور شرائط پہلے سے طے کی جاتی ہیں۔

7۔ تکافل (اسلامی بیمہ)

تکافل میں شریک افراد باہمی طور پر خطرات کی ذمہ داری اٹھاتے ہیں۔ ہر شریک ایک فنڈ میں رقم جمع کراتا ہے اور اگر کسی کو نقصان ہو تو اسے اس فنڈ سے مدد فراہم کی جاتی ہے۔ یہ روایتی بیمہ کا اسلامی متبادل ہے۔

8۔ وکالت (ایجنسی)

وکالت میں ایک فریق دوسرے فریق کو اپنا وکیل یا ایجنٹ مقرر کرتا ہے تاکہ وہ اس کی طرف سے مالی یا تجارتی معاملات میں سرگرمیاں انجام دے سکے۔ اس میں وکیل (ایجنٹ) کی خدمات کا معاوضہ طے ہوتا ہے، اور وہ اپنے موکل کی جانب سے مقررہ شرائط کے مطابق کام کرتا ہے۔

9۔ مساوات (پروفٹ اینڈ لوس شیئرنگ)

مساوات ایک شراکت داری کا معاہدہ ہے جس میں تمام شریک افراد اپنے سرمائے کے تناسب سے کاروبار میں شریک ہوتے ہیں اور منافع و نقصان کو برابر بانٹتے ہیں۔

10۔ قرض حسنہ (بلا سود قرض)

قرض حسنہ اسلامی مالیات کا ایسا قرض ہے جس میں قرض دینے والا سود نہیں لیتا بلکہ نیک نیتی سے مدد کے لئے قرض دیتا ہے۔ قرض دار اسے واپس کر دیتا ہے اور اس پر کوئی اضافی چارج نہیں ہوتا۔

یہ مختلف اسلامی تجارتی اصول اور معاہدے اسلامی مالیاتی نظام میں استعمال ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد شریعت کے اصولوں کے مطابق لین دین کو یقینی بنانا اور انصاف، شفافیت، اور ذمہ داری کے ساتھ مالیاتی سرگرمیوں کو فروغ دینا ہے۔

غیر اسلامی تجارت کی اقسام:

غیر اسلامی تجارت کی اقسام وہ ہیں جو شریعت اسلامی کے اصولوں کے خلاف ہوتی ہیں، خاص طور پر وہ جو سود (ربا)، جوا (قمار)، یا دھوکہ دہی پر مبنی ہوتی ہیں۔ اسلامی مالیات میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ تجارت اور لین دین شفاف، منصفانہ، اور اخلاقی اصولوں کے مطابق ہو، تاکہ معاشرت میں انصاف قائم ہو۔ غیر اسلامی تجارت کی چند بنیادی اقسام درج ذیل ہیں:

1۔ ربا (سود)

- ربا وہ اضافی رقم ہے جو قرض پر لی جاتی ہے، اور یہ شریعت کے مطابق حرام ہے۔ اس میں قرض دینے والے کو اصل رقم کے علاوہ اضافی رقم وصول ہوتی ہے۔ سودی لین دین

میں ایک طرف کا فائدہ دوسرے طرف کے نقصان پر ہوتا ہے، جو کہ اسلامی اصولوں کے خلاف ہے۔

- مثال: بینکوں کا وہ کاروبار جو قرض دینے پر سود وصول کرتا ہے، جیسے کہ ہاؤسنگ لون، کار لون، یا پرسنل لون۔

2۔ قمار (جوا)

- قمار یا سٹہ ایسی تجارت ہے جو محض قسمت، اندازے یا غیر یقینی پر مبنی ہو۔ اس میں جیت یا ہار کا فیصلہ ایک غیر متوقع عنصر پر ہوتا ہے اور اس میں کوئی حقیقی سرمایہ کاری یا محنت شامل نہیں ہوتی۔

- مثال: جوا کھیلنا، کیسینو یا آن لائن گیمز جہاں افراد غیر یقینی طور پر پیسہ کماتے ہیں یا کھوتے ہیں۔

3۔ دھوکہ دہی اور فریب

- اس قسم کی تجارت میں ایک فریق دوسرے فریق کو غلط معلومات فراہم کرتا ہے تاکہ وہ فائدہ اٹھا سکے۔ دھوکہ دہی کا مقصد کسی کو غلط بیانی سے نقصان پہنچانا ہوتا ہے۔

- مثال: کسی مال یا خدمات کی فروخت میں حقیقت چھپانا، قیمتوں میں دھوکہ دینا، یا غیر معیار کی چیز کو معیار کے طور پر پیش کرنا۔

4۔ غیر یقینی یا جوا پر مبنی تجارت (غرر)

- غرروہ تجارت ہوتی ہے جس میں غیر یقینی یا مبہم شرائط ہوتی ہیں۔ اس میں ایک فریق کو دوسرے فریق کے بارے میں مکمل علم نہیں ہوتا کہ اس کا نفع یا نقصان کیا ہوگا۔

- مثال: ایسی تجارت جہاں اشیاء کی قیمت یا معیار غیر واضح ہو، جیسے کہ کسی شے کی خریداری کی جارہی ہو لیکن اس کا معیار یا فراہمی کی شرائط واضح نہ ہوں۔

5۔ حرام مصنوعات کی خرید و فروخت

- اسلامی شریعت میں ان مصنوعات کی خرید و فروخت بھی حرام ہے جو خود ہی حرام ہوں، جیسے کہ شراب، سور کا گوشت، یا غیر شرعی سرگرمیوں سے متعلق مصنوعات۔

- مثال: شراب کی دکانوں کا کاروبار یا ایسی کمپنیوں میں سرمایہ کاری کرنا جو غیر اسلامی مصنوعات تیار کرتی ہوں۔

6۔ غیر اخلاقی کاروبار

- یہ وہ کاروبار ہوتے ہیں جو اخلاقی طور پر غلط یا غیر ذمہ دارانہ طریقوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان میں کارکنوں کا استحصال، ماحولیاتی آلودگی، یا کمزور طبقات کے حقوق کی خلاف ورزی شامل ہو سکتی ہے۔

- مثال: مزدوروں کے ساتھ بدسلوکی یا غیر انسانی حالات میں کام کرنے کی وجہ سے فائدہ اٹھانا۔

7۔ ڈومینینٹ مارکیٹنگ (پرامننٹ مارکیٹنگ)

- بعض اوقات مارکیٹ میں کسی مصنوعات کی قیمت غیر اخلاقی طریقے سے بڑھادی جاتی ہے، یاضرورت سے زیادہ منافع حاصل کرنے کے لئے لوگوں کو جھانسہ دیاجاتاہے۔
- مثال: مارکیٹ میں قیمتوں کو مصنوعی طور پر بڑھاکر لوگوں سے زیادہ قیمت وصول کرنا۔

8۔ پونزی اسکیم یاہائی اسکیم

- یہ وہ اسکیمیں ہوتی ہیں جو سرمایہ کاروں کو ابتدائی طور پر منافع دیتی ہیں لیکن بعد میں نیا پیسہ لاکر پچھلے سرمایہ کاروں کو ادائیگی کی جاتی ہے۔ یہ اسکیمیں آخر کار دھوکہ دہی کے طور پر ختم ہوجاتی ہیں اور سرمایہ کاروں کو نقصان ہوتا ہے۔
- مثال: پونزی اسکیمزیادیگر سرمایہ کاری فراڈ جو نئے سرمایہ کاروں سے پیسہ لے کر پرانے سرمایہ کاروں کو ادائیگی کرتے ہیں۔

9۔ خودکار تجارت(Automated Trading)

- اس میں کمپیوٹر پروگرام یا الگورتھمز کا استعمال کیا جاتا ہے تاکہ سرمایہ کاری کے فیصلے خودبخود کیے جائیں، خاص طور پر جب اس کا مقصد کسی کے مالی نقصان پر فائدہ اٹھاناہو۔
- مثال: فاریکس ٹریڈنگ میں خودکار سسٹمز جو غیر اخلاقی طریقے سے مارکیٹ کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

غیر اسلامی تجارت ان سرگرمیوں پر مشتمل ہوتی ہے جو اسلامی مالیاتی اصولوں کے خلاف ہوں، جیسے سود، جوا، دھوکہ دہی، غیر اخلاقی کاروبار، یا حرام مصنوعات کی تجارت۔ اسلامی

نظام میں کاروبار اور تجارت کے اصولوں کی بنیاد اخلاقی شفافیت، انصاف، اور محنت پر ہے تاکہ مالی لین دین دونوں فریقین کے لئے فائدہ مند اور برابری پر مبنی ہو۔

اصالۃ الاحتیاط اور اصالۃ البرائت اور فقیہ کی ذمہ داری

اصالۃ الاحتیاط اور اصالۃ البرائت کی تعریف

اصالۃ الاحتیاط (اصلِ احتیاط):

یہ اصول اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کسی مسئلے میں شرعی حکم واضح نہ ہو یا فقہی دلیل مکمل طور پر واضح نہ ہو۔ اس اصول کے مطابق، احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ایسے عمل سے پرہیز کرے جو ممکنہ طور پر حرام ہو یا کسی واجب کو ترک نہ کرے۔

مثال: اگر یہ معلوم نہ ہو کہ کوئی کھانا حلال ہے یا حرام، تو احتیاط کا تقاضا یہ ہوگا کہ اس کھانے سے اجتناب کیا جائے۔

اصالۃ البرائت (اصلِ براءت):

یہ اصول اس بات پر مبنی ہے کہ اگر کسی عمل کے حرام ہونے یا کسی حکم کے واجب ہونے پر واضح دلیل موجود نہ ہو تو انسان اس عمل کو جائز سمجھے اور کسی قسم کی شرعی ذمہ داری سے بری ہو جائے۔

مثال: اگر یہ واضح نہ ہو کہ کوئی مخصوص عمل واجب ہے یا نہیں، تو اصلِ براءت کے تحت وہ عمل ترک کرنے میں کوئی حرج نہیں ہو گا۔

ان دونوں اصولوں کے معین اصول:

فقہاء کے ہاں یہ دونوں اصول عقل، شرعی دلائل، اور اصولِ فقہ کے قواعد کی بنیاد پر طے کیے گئے ہیں۔ ان کا انتخاب کسی فقیہ کی ذاتی پسند یا نفسیاتی رجحان پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ ان اصولوں کو معین ضوابط اور قواعد کے تحت استعمال کیا جاتا ہے۔

1۔ اصول کے تعین کے عوامل:

دلیل کی موجودگی یا عدم موجودگی:

اگر کوئی واضح دلیل موجود ہو تو فقیہ اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ اگر دلیل واضح نہ ہو تو اصولِ احتیاط یا براءت میں سے مناسب اصول کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

علم اجمالی یا شک کی حالت:

اگر کسی چیز کے حرام یا واجب ہونے کا علم اجمالی ہو (یعنی کچھ حد تک یقین ہو لیکن تفصیل معلوم نہ ہو) تو اصالۃ الاحتیاط کا اطلاق ہو گا۔

اگر شک ہو اور کوئی واضح دلیل موجود نہ ہو، تو اصالۃ البرائت کا اطلاق کیا جائے گا۔

2۔ شرعی قاعدے:

قواعدِ احتیاط:

جان اور دین کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو احتیاط کا حکم دیا جاتا ہے۔

جہاں حلال و حرام یا واجب و غیر واجب کے درمیان شک ہو، وہاں احتیاط افضل ہے۔

قواعدِ براءت:

قاعدہ: "ما حکم به العقل حکم به الشرع": اگر عقل کسی چیز کو جائز سمجھے اور کوئی شرعی دلیل اس کے خلاف نہ ہو تو شرع بھی اسے جائز سمجھتی ہے۔

"اصل براءت" کی بنیاد قرآن و سنت کی وہ تعلیمات ہیں جو بندوں پر آسانی اور سہولت کے اصول کو فروغ دیتی ہیں، مثلاً:

" ما جعل علیکم فی الدین من حرج "(سورہ حج:78)

(اللہ نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔)

فقیہ کے انتخاب میں نفسیاتی رجحان کا کردار؟

فقیہ کے انتخاب میں نفسیاتی رجحان کا براہِ راست کردار نہیں ہوتا۔ ان اصولوں کا اطلاق معروضی بنیادوں پر کیا جاتا ہے اور یہ درج ذیل امور پر مبنی ہوتا ہے:

فقیہ کی علمی تحقیق:

فقیہ اپنی تحقیق میں اصولِ فقہ، قرآن، احادیث، اور عقل کے اصولوں کو مد نظر رکھ کر فیصلہ کرتا ہے۔

اجتہاد کے اصول:

اجتہاد کے دوران، فقیہ دلائل کا وزن اور ان کی وضاحت کی بنیاد پر فیصلہ کرتا ہے۔ کسی بھی فقیہ کو اپنی ذاتی پسند یا رجحان کے مطابق فیصلہ کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

سماجی یا شرعی ضرورت:

کسی خاص وقت یا معاشرے کی ضروریات کے مطابق احتیاط یا براءت کا انتخاب کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ بھی شرعی حدود کے اندر ہوتا ہے۔

اصالۃ الاحتیاط اور اصالۃ البرائت دونوں اصول معین قواعد پر مبنی ہیں، اور ان کا انتخاب کسی فقیہ کی ذاتی پسند یا نفسیاتی رجحان کے تحت نہیں ہوتا۔

یہ اصول شرعی دلائل، عقل، اور اصولِ فقہ کے قواعد کی روشنی میں طے کیے جاتے ہیں۔

فقیہ کا کام شرعی دلائل کی روشنی میں ان اصولوں کا درست اطلاق کرنا ہے، اور نفسیاتی یا ذاتی رجحانات کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔

ایک فقیہ مختلف معاملات میں اصالۃ الاحتیاط اور اصالۃ البرائت دونوں کا اطلاق کر سکتا ہے، اور یہ مکمل طور پر ان مسائل کی نوعیت اور دستیاب شرعی دلائل پر منحصر ہوتا ہے۔ فقہاء کسی ایک اصول کو ہر مسئلے پر لاگو نہیں کرتے بلکہ ان اصولوں کو مخصوص حالات میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ عمل شرعی قواعد اور اجتہادی اصولوں کے مطابق ہوتا ہے، نہ کہ ذاتی رجحانات یا پسند پر۔

احتیاط اور براءت کا بیک وقت اطلاق کیسے ممکن ہے؟

1۔ اصول کی نوعیت کے مطابق فیصلہ

اصالۃ الاحتیاط کا اطلاق:

جب کسی معاملے میں غلطی کا امکان سنگین نتائج پیدا کر سکتا ہو، جیسے عبادات یا حرام چیزوں سے اجتناب، وہاں فقیہ احتیاط کا حکم دیتا ہے۔

مثال: اگر کوئی کھانے کی چیز حلال یا حرام ہونے میں مشکوک ہو اور اس کا کوئی متبادل موجود ہو تو احتیاطاً اسے ترک کرنے کا حکم دیا جائے گا۔

اصالۃ البرائت کا اطلاق:

جب کسی معاملے میں واضح دلیل موجود نہ ہو اور اس کی عدمِ موجودگی میں انسان پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوتی ہو، تو اصلِ براءت کا اصول لاگو ہو گا۔

مثال: اگر کسی خاص عبادت کے واجب ہونے پر کوئی واضح دلیل نہ ہو، تو اصلِ براءت کے تحت اس عبادت کو انجام دینا ضروری نہیں ہو گا۔

2۔ مختلف مسائل میں مختلف اصولوں کا اطلاق

فقیہ بعض اوقات مختلف اصول استعمال کرتا ہے کیونکہ:

عبادات میں: احتیاط کو زیادہ ترجیح دی جاتی ہے، کیونکہ عبادات کا تعلق اللہ کے حقوق اور بندے کی ذمہ داری سے ہے۔

معاملات (معاشرتی امور) میں: براءت کو زیادہ ترجیح دی جاتی ہے، تاکہ لوگوں پر غیر ضروری سختی نہ ہو۔

3۔ شریعت کے عمومی قواعد کے تحت توازن

اسلامی شریعت میں توازن اور سہولت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے:

جہاں دین میں آسانی فراہم کرنا ممکن ہو، وہاں اصلِ براءت کا اصول اپنایا جاتا ہے:

" یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر "(البقرہ:185)

(اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا۔)

جہاں معاملہ مشکوک ہو یا دینی تقاضے زیادہ اہم ہوں، وہاں اصلِ احتیاط کو اپنایا جاتا ہے:

" فاتقوا اللہ ما استطعتم "(التغابن:16)

(اللہ سے ڈرو جتنا تمہارے لیے ممکن ہو).

عملی مثالیں:

عبادت کا معاملہ:

اگر کوئی شخص شک کرے کہ وضو ٹوٹا ہے یا نہیں، تو احتیاط کا تقاضا ہو گا کہ وضو دوبارہ کیا جائے۔

معاشرتی معاملہ:

اگر کسی کے ذمہ قرض واجب ہونے کی واضح دلیل موجود نہ ہو، تو اصلِ براءت کے مطابق وہ شخص قرض ادا کرنے کا پابند نہیں ہو گا۔

فقیہ بعض معاملات میں احتیاط اور بعض میں براءت کا اصول اختیار کر سکتا ہے، اور یہ فیصلہ شرعی اصولوں، عقل، اور مسئلے کی نوعیت پر منحصر ہوتا ہے۔

شریعت میں سختی اور آسانی دونوں کا توازن موجود ہے، اور یہی توازن ان اصولوں کے اطلاق میں نظر آتا ہے۔
یہ تمام فیصلے اجتہاد، اصولِ فقہ، اور دلائل کی روشنی میں کیے جاتے ہیں، نہ کہ ذاتی پسند یا نفسیاتی رجحانات پر۔

اصل کامیابی اور کامیابی کے نام پر دھوکہ

زندگی میں کامیابی کے اصول اور راز جو قرآن، احادیث معصومینؑ، اور ان تعلیمات کی بنیاد پر تخلیق کیے گئے علوم میں موجود ہیں، وہ انسانی فطرت کے ساتھ مکمل ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ قرآن مجید بارہا انسان کو غور و فکر، عملِ صالح، اور تقویٰ کی دعوت دیتا ہے۔ یہ اصول زندگی کے ہر پہلو کو محیط ہیں، چاہے وہ انفرادی ترقی ہو، معاشرتی بہبود، یا روحانی کمال۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہم نے ان اصولوں کو اپنی زندگی کا حصہ بنایا ہے؟ کیا ہم نے قرآن و احادیث کو اپنے عمل کا سرمشق قرار دے کر دنیا و آخرت میں کامیابی حاصل کرنے کی سنجیدہ کوشش کی ہے؟

مغرب، جو بظاہر مادی ترقی کا علمبردار ہے، اپنی کامیابی کی بنیادوں میں اسلامی متون سے اخذ کردہ حکمتوں کو شامل کر چکا ہے۔ انہوں نے غور و فکر، تدبیر، اور تحقیق کے اصول اسلامی

ورثے سے اخذ کیے، لیکن ان اصولوں کو اپنی مادّی نیت اور دنیاوی مقاصد کے لیے ڈھال لیا۔ یہ عمل انہیں ایک غیر متوازن سمت کی طرف لے گیا۔ وہ اخلاقی، روحانی، اور انسانی اقدار کو نظر انداز کر کے صرف مادی فوائد کے پیچھے دوڑنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب ایک ایسانظام تخلیق کرنے میں کامیاب ہوا جو بظاہر مضبوط نظر آتا ہے، لیکن اس کی بنیادیں کھوکھلی ہیں۔ مغرب کا زوال آج واضح ہو رہا ہے، جہاں مادّی ترقی کے باوجود اخلاقی بحران، خاندانی نظام کی تباہی، اور ذہنی سکون کی کمی نے ان کی زندگیوں کو بے سمت بنا دیا ہے۔

ہم، جو قرآن و سنت کے حقیقی وارث ہیں، نے اپنی اس میراث کو کماحقہ اپنانے میں غفلت برتی۔ قرآن مجید ہمیں "واعتصموا بحبل الله جميعاً ولا تفرقوا" کی تعلیم دیتا ہے، یعنی اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور فرقہ واریت سے بچو۔ لیکن ہم نے اس رسی کو چھوڑ کر ذاتی مفادات، فرقہ واریت، اور بیرونی اثرات کے پیچھے چلنے کو ترجیح دی۔ احادیث معصومینؑ ہمیں علم، عمل، اور اخلاق کی دعوت دیتی ہیں، لیکن ہم نے ان تعلیمات کو زبانی جمع خرچ تک محدود کر دیا ہے۔ ہم نے دنیاوی کامیابی کو مغربی اصولوں میں تلاش کیا، جبکہ ہماری کامیابی کا راستہ ہمیشہ سے ہمارے اپنے دین میں موجود تھا۔

قرآن ہمیں بارہا تاکید کرتا ہے کہ دنیاوی زندگی عارضی ہے اور اصل کامیابی وہ ہے جو آخرت میں ملے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ دنیاوی زندگی کو ترک کر دیا جائے۔ بلکہ اسلام ایک متوازن زندگی کی تعلیم دیتا ہے، جہاں دنیا اور آخرت دونوں کو اہمیت دی جائے۔ مغرب کی مادّی ترقی ہمیں اس بات کا درس دیتی ہے کہ عمل اور تحقیق کے بغیر ترقی

ممکن نہیں، لیکن اگر یہ عمل تقویٰ اور اخلاق سے خالی ہو تو وہ ترقی تباہی میں بدل جاتی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم مغرب کے زوال سے سبق لیں اور اپنی کھوئی ہوئی میراث کو دوبارہ زندہ کریں۔

ہمیں اپنی زندگیوں کو قرآنی اصولوں کے مطابق ڈھالنا ہو گا۔ قرآن ہمیں صدق، عدل، امانت، اور شکر گزاری کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ وہ اصول ہیں جو زندگی کے ہر شعبے میں کامیابی کی ضمانت دیتے ہیں۔ احادیث معصومینؑ ہمیں بتاتی ہیں کہ بہترین انسان وہ ہے جو دوسروں کے لیے بھلائی کرے اور اپنے کردار سے دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔ ہمیں ان تعلیمات کو عملی جامہ پہنانا ہو گا تاکہ ہم دنیا و آخرت میں کامیاب ہو سکیں۔

یہ وقت ہے کہ ہم اپنی شناخت کو پہچانیں اور اپنی اصل میراث کی طرف رجوع کریں۔ دنیا و آخرت کی سرخروئی صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم قرآن و سنت کو اپنی زندگی کا محور بنالیں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ہمیں اپنے زوال کے لیے کسی بیرونی دشمن کی ضرورت نہیں ہو گی، ہم خود اپنے دشمن بن جائیں گے۔ لیکن اگر ہم نے ان اصولوں پر عمل کیا، تو نہ صرف ہم اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو بحال کر سکیں گے بلکہ دنیا کے لیے بھی ایک مثال بن جائیں گے۔

اصل کی جگہ نقل بنانا اور ھیگل کا نظریہ

تاریخ میں فکری یا نظریاتی احیاء کے بعد اس سے ملتے جلتے مغالطوں یا چیلنجز کے ابھرنے کا مسئلہ ایک اہم پہلو ہے۔ یہ مسئلہ نہ صرف اسلامی تاریخ میں بلکہ دنیا کے مختلف فکری، سماجی اور سیاسی احیاؤں میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ واقعات اور موجودہ حالات میں ایسی نوعیت کی چیزیں سامنے آتی ہیں جہاں ایک تبدیلی یا انقلابی نظریہ کے بعد اس سے وابستہ افراد یا گروہ اپنے مفادات یا سست روی کی وجہ سے اس کا اصل مقصد کم کر دیتے ہیں یا اس میں جمود پیدا کر دیتے ہیں۔

.1 مسجد نبوی اور مسجد ضرار کا معاملہ

- جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ کے حکم سے مسجد نبوی کی بنیاد رکھی، تو اس کا مقصد ایک ایسی جماعت کو تشکیل دینا تھا جو اسلامی اصولوں پر قائم

ہو اور اللہ کے راستے پر چلتے ہوئے ترقی کرے۔ تاہم، مسجد ضرار جیسے عناصر سامنے آئے جنہوں نے اس مقصد کو پس پشت ڈال کر اپنی سازشوں اور مفادات کو ترجیح دی۔

- یہاں ایک بنیادی مسئلہ مفہوم کے انحراف کا تھا؛ یعنی جو نیا نظام آرہا تھا، اس میں لوگوں نے نظریاتی سطح پر تبدیلیاں کرنے کی کوشش کی، جس سے مقصد کا اصل پیغام گم ہو گیا۔

.2 قرآن کی اہمیت اور صفین کا واقعہ

- صفین کے میدان میں، جب امام علی علیہ السلام اور معاویہ کے درمیان جنگ ہوئی، تو قرآن کا پرچم اٹھا کر ایک نئی قسم کی مغالطہ کی بنیاد رکھی گئی۔ حقیقت میں، معاویہ کے پیروکاروں نے قرآن کے نام کو سیاسی فائدے کے لیے استعمال کیا، اور اس میں وہ سچائی نہیں تھی جو اصل میں قرآن کی تعلیمات میں موجود تھی۔
- اس وقت مفہوم کا انحراف اور سیاسی مقاصد کے لیے دینی اصولوں کا استحصال ہوا، جو ہمیں آج بھی مختلف تاریخی اور سیاسی حالات میں نظر آتا ہے۔

.3 انقلاب اسلامی ایران اور "ایران رامدرسہ کنیم"

- ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد، ایک نیا اور انقلابی نعرہ تھا کہ "ایران را مدرسہ کنیم"، جس کا مقصد اسلامی معاشرتی اصلاحات اور تعلیم کی اہمیت تھی۔ تاہم، جیسے ہی انقلاب نے جڑ پکڑی، فکسڈ مائنڈ سیٹ افراد نے انقلابی تعلیمات کو سست یا غیر موثر طریقے سے اپنانا شروع کر دیا۔
- اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیم کے حوالے سے کچھ افراد نے نعرہ تو لگایا مگر اس کے عملی اقدامات میں گہری تبدیلی نہیں لائی۔ اس کی وجہ سے معاشرے میں وہ تبدیلی اور اصلاحات نہیں آئیں جن کی توقع تھی۔

.4 اسلامی معاشرے کی اصلاح اور فکسڈ مائنڈ سیٹ افراد

- انقلاب کے بعد فکسڈ مائنڈ سیٹ افراد نے انقلابی سوچ کو اصلاحی سوچ میں بدلنے کی کوشش کی۔ انہوں نے انقلابی نظریات کو عملی طور پر اس انداز میں نہیں اپنایا جس سے اسلامی معاشرہ مکمل طور پر پھلے پھولے۔
- ان افراد نے مفادات اور حالات کی سادگی کے تحت انقلابی اصولوں کو ایک مخصوص سمت میں موڑنے کی کوشش کی، جس سے اصل مقصد کو نقصان پہنچا۔ ان کی کوششیں تحریف کی صورت میں سامنے آئیں اور اسلامی انقلاب کی روح کو مفاداتی سیاست میں ڈھال دیا۔

.5 اسلامی اصولوں کے مفہوم کا انحراف

- جب بھی اسلامی اصولوں اور نظریات کی پیشکش کی جاتی ہے، تو ایک بڑا مسئلہ ان اصولوں کے مفہوم کا انحراف ہے۔ یہ انحراف اس وقت ہوتا ہے جب افراد یا گروہ نظریاتی سطح پر استحصال کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جیسے کہ سیاسی مقاصد یا ذاتی مفادات کے لیے دینی اصولوں کا استعمال۔
- اس نوعیت کے مغالطے اکثر سامنے آتے ہیں جب افراد کسی نئے فکری یا انقلابی نظام کو اپنانا چاہتے ہیں، لیکن اس کے اصل مقاصد کو نظر انداز کرتے ہیں۔

.6 سیاسی مفادات اور انقلابی پیغامات کا انحراف

- تاریخ میں ہمیشہ منافقت اور سیاسی مفادات کی وجہ سے انقلابی پیغامات میں انحراف دیکھنے کو ملتا ہے۔ انقلابی رہنما اکثر اپنے پیغامات کے ذریعے معاشرتی تبدیلی لانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر فکسڈ مائنڈ سیٹ کے حامل افراد اس کو نظریاتی سطح پر نہیں سمجھ پاتے، اور نتیجتاً وہ ان اصلاحات کو کمزور یا غیر مؤثر بنا دیتے ہیں۔

.7 نئے فرقے اور نظریات کا قیام

- جیسے جیسے ہر نیا فکری یا انقلابی نظریہ ابھرتا ہے، اس کے ساتھ متوازی فرقے یا فکری انحراف بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ فرقے یا گروہ جدید نظریات کو اپنے مفادات کے مطابق موڑ کر ان کا غلط استعمال کرتے ہیں۔

- اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصل پیغام کمزور پڑ جاتا ہے اور ایک نیا تنازعہ یا مغالطہ جنم لیتا ہے۔

یہ ایک فطری حقیقت ہے کہ ہر نئے فکری یا انقلابی نظریے کے ساتھ اس سے ملتے جلتے مغالطے اور انحرافات سامنے آتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ مفادات کی کشمکش اور فکسڈ مائنڈ سیٹ کا غلبہ ہے، جس کے نتیجے میں اصل مقصد یا نظریہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ افراد اور گروہ نظریاتی لچک اور اصولوں کی سچائی کے ساتھ ان انحرافات کو روکنے کی کوشش کریں تاکہ اصل پیغام زندہ رہ سکے اور انسانیت کے لیے حقیقی تبدیلی ممکن ہو سکے۔

(نئے فکری یا انقلابی نظریات کے بعد مغالطوں کا جنم) کو ھیگل کی فکر میں بیان کردہ تھیسز، اینٹی تھیسز، اور سینتھیسز کے تصور سے مماثل کیا جا سکتا ہے۔ ھیگل کی فکر کا یہ تین مراحل پر مشتمل تصور فلسفے میں ایک بنیادی مقام رکھتا ہے، جسے ڈایلیکٹک (Dialectic) کہا جاتا ہے، اور یہ بنیادی طور پر سوچ کے ارتقاء اور تبدیلی کی وضاحت کرتا ہے۔ اس بیان کو اس فینامینا کے ساتھ منسلک کرنے کا طریقہ کچھ یوں ہو سکتا ہے:

1. تھیسز (Thesis)

- ھیگل کی تھیسس: ایک خاص نظریہ یا حقیقت کی ابتدائی حالت کو ظاہر کرتی ہے، جو موجودہ یا غالب سماجی، فکری، یا سیاسی تناظر کے مطابق ہوتی ہے۔ اس میں اس وقت کا موجودہ نظام یا اصول شامل ہوتا ہے۔
- فینامینا میں تھیسس: یہاں پر وہ وقت ہے جب کوئی انقلابی یا نئے فکری نظریہ پیش آتا ہے، جیسے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک اللہ اور ایک نبی پیش کرنا، یا امام علی علیہ السلام کا صحیح سیاسی، اجتماعی نظام پیش کرنا۔ یہ تبدیلی یا نظریہ شروع میں ایک نئی تحریک کی شکل میں آتی ہے جو فلاحی معاشرت کی طرف گامزن ہوتی ہے۔

.2اینٹی تھیسز: (Antithesis)

- ھیگل کی اینٹی تھیسز: تھیسز کا ردیا اس کے خلاف ایک مخالف نظریہ یا حقیقت کی تشکیل ہے۔ یہ عام طور پر تھیسز کی کمزوریوں، تضادات یا حدود کو ظاہر کرتا ہے اور اس کے ذریعے تنقید کی جاتی ہے۔ اینٹی تھیسز فطری طور پر تھیسز کے نظریات کو چیلنج کرتی ہے، اور اس کے اندر اصلاح یا تضاد کی پوزیشن ہوتی ہے۔
- فینا مینا میں اینٹی تھیسز: جب انقلابی یا نئے نظریات کو پیش کیا جاتا ہے، تو مفادات کی کشمکش، منافقت، اور فکسڈ مائنڈ سیٹ والے افراد یا گروہ ان نظریات کا استحصال کرتے ہیں، یا ان میں انحرافات پیدا کرتے ہیں۔ جیسے صفین میں قرآن کا پرچم اٹھا کر امام علی علیہ السلام کے خلاف جنگ کرنا، یا ایران میں

انقلاب کے بعد انقلابی پیغامات میں مفادات کی آڑ میں تبدیلیاں کرنا۔ اس وقت اینٹی تھیسز وہ ردعمل ہوتا ہے جو ان نظریات یا تبدیلیوں کے خلاف ابھرتا ہے، اور اس میں مفاداتی سیاست یا رکاوٹ نظر آتی ہے۔

3. سینتھیسز (Synthesis)

- ھیگل کی سینتھیسز تھیسز اور اینٹی تھیسز کے تصادم سے پیدا ہونے ولی ایک نئ حقیقت یا نظریہ ہے، جو ان دونوں کے تضاد کو حل کرنے کی کوشش کرتی ہے اور ایک نئ سطح پر ان کی اصلاح یا ارتقاء کرتی ہے۔ یہ تصادم کے بعد ایک متوازن اور جامع حقیقت کی طرف گامزن ہوتا ہے۔
- فینامینا میں سینتھیسز: جب اینٹی تھیسز یعنی انقلابی پیغامات کا غلط استعمال اور ان میں انحرافات پیدا ہونے لگتے ہیں، تو اس کے نتیجے میں ایک نیا نظریہ یا تبدیلی پیدا ہوتی ہے جو دونوں کی تکمیل کرتی ہے۔ اس میں اصلاحات اور نئے زاویے شامل ہوتے ہیں، جو نظریات یا تحریکوں کو صحیح سمت میں گامزن کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، ایران میں انقلاب کے بعد اسلامی معاشرت کی طرف جدوجہد جاری رہی، اور اس کے نتیجے میں انقلابی اصولوں کو بہتر طور پر اپنانے کے لیے نئ اصلاحات کی ضرورت محسوس ہوئی۔

ھیگل کی تھیسز، اینٹی تھیسز، اور سینتھیسز کا تصور دراصل ایک فکری ارتقاء اور تبدیلی کی تشریح کرتا ہے، جو ہر نئے نظریہ یا تحریک کے بعد ایک ردعمل اور اس کے تصادم سے پیدا

ہونے والی نئی حقیقت کے ذریعے سامنے آتا ہے۔ یہی اصول فینامینا میں بھی لاگو ہوتے ہیں جہاں انقلابی نظریات کے بعد ان سے وابستہ مغالطے اور انحرافات آتے ہیں، جنہیں وقت کے ساتھ ایک نئی اصلاحی سمت میں تبدیل کیا جاتا ہے، جس میں معاشرتی، سیاسی، یا فکری اصلاحات کی ضرورت ہوتی ہے۔

التقاط، التقاطی نظریات اور مکتب تشیع

مکتب تشیع میں "التقاط" سے مراد ہے کہ اسلامی تعلیمات میں غیر اسلامی، غیر مذہبی یا فلسفی مکاتیبِ فکر کے نظریات کو شامل کر لیا جائے، بغیر اس کے کہ ان نظریات کی اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق مکمل جانچ پڑتال اور تجزیہ کیا گیا ہو۔ التقاط کی صورت میں اسلامی افکار وعقائد میں خارجی نظریات اور ثقافتی اثرات کو ملانے کا رجحان پایا جاتا ہے، جس سے اسلامی تعلیمات کا خالص مفہوم بگاڑ کا شکار ہو سکتا ہے۔

شیعہ علماء اور معاصر فقہا کی ایک بڑی تعداد التقاط کو خطرناک تصور کرتی ہے، خاص طور پر جب یہ اسلام کے بنیادی اصولوں اور اقدار سے متصادم ہو۔ ان کا ماننا ہے کہ اسلام کی اپنی کامل اور جامع تعلیمات ہیں، اور دین کو باہر کے فلسفی یا مذہبی نظریات سے مخلوط کرنے سے اسلامی نظریہ اور فکر میں بگاڑ پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ فقہا اس بات کی تاکید کرتے ہیں کہ اسلامی

تعلیمات کو اسی طرح اپنانا اور سمجھنا چاہیے جس طرح اہل بیت علیہم السلام نے انہیں سمجھایا ہے، اور اس میں خارجی نظریات کی غیر ضروری آمیزش سے بچنا چاہیے۔

امام خمینی (رہ) اور علامہ مطہری جیسے معاصر شیعہ مفکرین التقاط کے بارے میں متنبہ کرتے رہے ہیں۔ ان کے مطابق مغربی فلسفہ اور نظریات کو اسلامی فکر میں بغیر کسی تنقیدی نظر کے شامل کرنا اسلامی فکر کی جامعیت اور اس کی اصل روح کے لئے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمیں جدید دنیا کے مسائل کو سمجھنا چاہیے، مگر ان کا حل تلاش کرتے ہوئے اسلامی اصولوں اور اقدار سے انحراف نہیں ہونا چاہیے۔

اسی طرح بعض شیعہ فقہا کا کہنا ہے کہ التقاط اسلامی معاشرت میں فکری ابہام، غلط فہمیاں، اور روحانی انحطاط کا باعث بنتا ہے۔ ان کا موقف ہے کہ ہمیں اسلام کے حقیقی اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے جدید مسائل کا حل پیش کرنا چاہیے، بجائے اس کے کہ ہم دوسروں کے افکار کو بلا سوچے سمجھے قبول کر لیں۔

التقاطی افکار کی مثالیں:

التقاطی افکار کی مثالیں وہ نظریات ہیں جو اسلامی تعلیمات کے بنیادی اصولوں کے ساتھ میل نہیں کھاتے لیکن بعض افراد انہیں اسلام میں شامل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ نظریات عموماً غیر اسلامی فلسفوں، مغربی خیالات یا دیگر مذاہب سے اخذ کیے جاتے ہیں اور ان کی اسلامی مفاہیم میں بے جا آمیزش کی جاتی ہے۔ یہاں چند اہم مثالیں دی گئی ہیں:

1۔ سیکولرزم(Secularism)

سیکولرزم ایک مغربی تصور ہے جس کے تحت مذہب کو زندگی کے سماجی، سیاسی اور حکومتی امور سے جدا رکھا جاتا ہے۔ کچھ افراد اس نظریے کو اسلامی معاشروں میں متعارف کرانے کی کوشش کرتے ہیں، یہ کہتے ہوئے کہ اسلام کو ذاتی اور روحانی سطح پر محدود رکھا جائے اور اسلامی ؁ یکیو لرازم کے تحت بہت سے معاملات میں دین کو دور رکھا جائے۔ تاہم، اسلام ایک مکمل دین ہے جو انسان کی زندگی کے ہر پہلو پر رہنمائی فراہم کرتا ہے، لہٰذا سیکولرزم کا نظریہ اسلامی طرزِ حیات کے خلاف ہے۔

2۔ مطلق آزادی کا تصور

مغربی معاشروں میں "فرد کی مطلق آزادی" ایک عام نظریہ ہے، جس میں ہر فرد کو بغیر کسی پابندی کے اپنی زندگی گزارنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں بھی انسان کو آزاد رکھا گیا ہے، لیکن اس آزادی کو اللہ کی حدود اور شریعت کے دائرے میں محدود رکھا گیا ہے۔ اسلام میں فرد کی آزادی اجتماعی فلاح اور اخلاقیات سے مشروط ہے، لہٰذا مطلق آزادی کا تصور اسلامی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتا۔

3۔ نسبیتِ اخلاقیات(Moral Relativism)

یہ نظریہ کہتا ہے کہ اخلاقیات کا کوئی مطلق معیار نہیں، بلکہ یہ ہر فرد، معاشرہ یا ثقافت کے لحاظ سے تبدیل ہوتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق، حلال اور حرام، صحیح اور غلط کی واضح

تعریف اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہے، اور اسے تبدیل یا بدلنے کی اجازت نہیں۔ اسلام کے بنیادی اصولوں میں اخلاقیات ایک مطلق اور غیر متبدل معیار پر مبنی ہیں۔

4۔ انسان مرکزیت(Humanism)

ہیومنزم ایک ایسا نظریہ ہے جس میں انسان کو زندگی کا مرکز قرار دیا جاتا ہے اور تمام امور میں اس کی فلاح اولین ترجیح ہوتی ہے، جبکہ اسلام میں اللہ کی عبادت اور اس کے احکام کی پابندی زندگی کا مقصد قرار دی گئی ہے۔ انسان مرکزیت میں انسان کی خواہشات اور مفادات کو مقدم سمجھا جاتا ہے، جو اسلامی عقیدہ توحید اور تقویٰ کے تصور سے متصادم ہے۔

5۔ مابعد جدیدیت(Postmodernism)

مابعد جدیدیت میں حقیقت، علم، اور اخلاقیات کو ذاتی اور نسبتی قرار دیا جاتا ہے، یعنی ہر شخص کا سچ الگ ہو سکتا ہے اور کوئی بھی چیز مطلق نہیں ہوتی۔ اس نظریے کے مطابق مذہب بھی ایک ذاتی تجربہ اور ذاتی سچائی ہے، جو اسلامی عقائد اور اللہ کی طرف سے نازل کردہ شریعت کے تصور کے خلاف ہے۔ اسلام میں اللہ کا دیا ہوا حق مطلق اور تبدیل نہ ہونے والا ہے۔

6۔ نیچرل ازم(Naturalism)

نیچرل ازم وہ نظریہ ہے جس کے مطابق کائنات کا وجود اور اس میں ہونے والے تمام مظاہر محض مادی اور قدرتی اسباب پر مبنی ہیں اور ان کے پیچھے کوئی روحانی یا الہامی پہلو نہیں ہے۔ اسلام کے مطابق کائنات کا خالق اللہ ہے اور اس کی ہر تخلیق میں الٰہی حکمت اور نشانی موجود ہے۔ لہذا نیچرل ازم کا تصور اسلامی تعلیمات سے متصادم ہے۔

7۔ قومی پرستی(Nationalism)

اسلامی تعلیمات میں پوری امت مسلمہ ایک واحد وحدت سمجھی جاتی ہے اور اسلامی اخوت کو فوقیت دی گئی ہے۔ لیکن بعض افراد قومی پرستی (نیچنلزم) کو اسلام میں شامل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسے اسلامی نظریہ کے طور پر پیش کرتے ہیں، جبکہ یہ تصور اسلامی تصورِ امت سے متصادم ہے۔

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ التقاطی نظریات کو اسلامی تعلیمات میں شامل کرنے کی کوششیں فکری انحرافات کا باعث بنتی ہیں اور اسلامی تعلیمات کی خالصیت کو متاثر کر سکتی ہیں اسی طرح اسلامی سوشلزم کی اصلاح بھی اختراع کی گئی۔ شیعہ علماء اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اسلامی اصولوں کو خالص حالت میں سمجھا جائے اور ان میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش سے گریز کیا جائے۔

اہل تشیع کا پر خلوص عمل

شیعہ مسلمانوں کے خلوص کو ثابت کرنے کے لیے تاریخ، عقائد، اور موجودہ زمانے میں ان کے کردار کو گہرائی سے سمجھنا ضروری ہے۔ شیعہ اسلام کا مرکز محبت، ایثار، اور حق کے لیے قربانی کے جذبات پر قائم ہے، جو کہ اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات سے واضح ہوتا ہے۔ اہل بیتؑ نے ہمیشہ انسانیت، عدل، اور باطل کے خلاف کھڑے ہونے کی مثالیں قائم کی ہیں۔ کربلا کا واقعہ شیعہ اخلاص کا سب سے بڑا مظہر ہے، جہاں حضرت امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں نے جانوں کا نذرانہ پیش کیا تاکہ دین اسلام کی بقا ہو اور ظالم کے خلاف کھڑے ہونے کا اصول قیامت تک زندہ رہے۔

شیعہ تاریخ کے اوراق اٹھا کر دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ شیعوں نے نہ صرف باطل قوتوں کے خلاف لڑائی لڑی بلکہ مسلمانوں کے اتحاد کے لیے بھی ہمیشہ کوششیں کیں۔ امام علیؑ کی

خلافت کے دور میں انہوں نے امت کی بھلائی کے لیے صبر کا مظاہرہ کیا اور اختلافات کے باوجود امت کے اتحاد کو ترجیح دی۔ یہ وہی جذبہ تھا جو بعد میں امام جعفر صادقؑ کے علمی کردار میں نظر آتا ہے، جب انہوں نے ہزاروں شاگردوں کی تربیت کی، جن میں اہل سنت کے بڑے بڑے ائمہ بھی شامل تھے۔ شیعہ علماء اور زعما نے ہمیشہ اسلامی تعلیمات کو پھیلانے اور انسانیت کی خدمت کو اپنی اولین ترجیح بنایا۔

موجودہ دور میں بھی شیعہ مسلمانوں کا خلوص واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ فلسطین کی آزادی کے لیے شیعہ رہنماؤں نے ہمیشہ کھل کر آواز اٹھائی، جبکہ اسرائیلی مظالم کے خلاف عملی اقدامات بھی کیے۔ حزب اللہ جیسے گروہوں نے لبنان کے دفاع میں اپنی جانوں کا نذرانہ دیا اور غاصب طاقتوں کے خلاف جدوجہد کی، جو صرف شیعہ مسلمانوں کا نہیں بلکہ تمام امت کا دفاع تھا۔ عراق اور شام میں داعش جیسی دہشت گرد تنظیموں کے خلاف شیعہ مجاہدین نے میدان میں اتر کر نہ صرف اپنے مقدس مقامات کا دفاع کیا بلکہ پورے خطے کو دہشت گردی کے ناسور سے بچایا۔

شیعہ مسلمانوں کے عقائد میں اخلاص کا جوہر بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اہل بیتؑ کی محبت کے ذریعے شیعہ مسلمان نہ صرف اللہ سے قربت حاصل کرتے ہیں بلکہ انسانیت کی خدمت اور مظلوموں کے دفاع کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ہر سال عاشورہ کے موقع پر دنیا بھر میں شیعہ مسلمان اپنے خون کا عطیہ دے کر اور مظلوموں کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کر کے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ان کا مقصد انسانیت کی خدمت اور دین اسلام کی سربلندی ہے۔

شیعہ مسلمان اس عقیدے پر ایمان رکھتے ہیں کہ امام مہدیؑ کے ظہور کے بعد دنیا میں عدل کا قیام ہوگا، لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ظہور سے پہلے ظلم کے خلاف کوئی جدوجہد نہ کی جائے۔ بلکہ شیعہ عقائد کے مطابق، ہر مؤمن پر واجب ہے کہ وہ اپنے وقت کے ظالم کے خلاف کھڑا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ سے لے کر آج تک شیعہ مسلمانوں نے ہمیشہ مظلوموں کا ساتھ دیا اور ظالم کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھی۔

شیعہ مسلمانوں کے خلوص کو سمجھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے عزاداری کے عمل کو صحیح تناظر میں دیکھا جائے۔ ہر سال دنیا بھر میں شیعہ مسلمان امام حسینؑ کی قربانی کو یاد کرتے ہیں اور لوگوں کو ظلم کے خلاف کھڑے ہونے کا درس دیتے ہیں۔ عزاداری کا مقصد صرف گریہ نہیں بلکہ ظلم کے خلاف شعور بیدار کرنا اور مظلوموں کے حق میں آواز اٹھانا ہے۔ یہ وہ پیغام ہے جو شیعہ مسلمان دنیا کے ہر خطے میں پھیلا رہے ہیں۔

یہ کہنا کہ شیعہ مسلمان صرف مسائل پیدا کرتے ہیں یا مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں ملوث ہیں، تاریخی حقائق اور موجودہ صورتحال سے سراسر لاعلمی ہے۔ شیعہ مسلمانوں کا اخلاص ان کی قربانیوں، ان کے عقائد، اور ان کے اعمال سے جھلکتا ہے۔ وہ ہمیشہ اتحاد کے داعی رہے ہیں اور انسانیت کی خدمت کو دین اسلام کا لازمی جزو سمجھتے ہیں۔ دنیا بھر میں جب بھی مظلوموں پر ظلم ہوا، چاہے وہ فلسطین ہو، یمن ہو، یا کشمیر، شیعہ مسلمانوں نے ہمیشہ مظلوموں کے ساتھ کھڑے ہو کر یہ ثابت کیا کہ وہ صرف اپنے فرقے کا نہیں بلکہ پوری

امت کا درد رکھتے ہیں۔ ان کا اخلاص نہ صرف مذہبی بنیادوں پر بلکہ انسانیت کے لیے ان کی بے لوث خدمات سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

جہالت سے روایت پھر عقیدہ

"ایک نسل کی جہالت دُوسری نسل کی روایت اور پھر تیسری نسل کا عقیدہ بن جاتی ہے" یہ قول نہ صرف انسان کی فکری ترقی اور معاشرتی ارتقاکے بارے میں ایک عمیق تجزیہ پیش کرتا ہے، بلکہ اس کی گہرائی انسان کی ذہنی ساخت اور سماجی رویوں کی تشکیل کو بھی واضح کرتا ہے۔ یہ قول ہمیں ایک ایسے عمل کے بارے میں آگاہ کرتا ہے جس میں جہالت، روایت اور عقیدہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر ثقافتی ڈھانچے کی بنیاد بن جاتے ہیں، اور پھر یہ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہو جاتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی غلط یا غیر مستند بات کو بغیر کسی تحقیق اور سوچ بچار کے اپنایا جائے، تو وہ ایک دن ایک تسلیم شدہ

حقیقت بن سکتی ہے، جس پر سوال کرنا یا اس کی حقیقت پر روشنی ڈالنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

یہ عمل معاشرت میں جہالت کی ابتدا سے شروع ہوتا ہے۔ جب فرد یا گروہ کسی معاملے کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا اور صرف دوسروں کے کہنے پر کچھ چیزیں قبول کر لیتا ہے، تو یہ جہالت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ زیادہ تر اوقات یہ جہالت کسی خاص موضوع کے بارے میں آگاہی نہ ہونے کے باعث جنم لیتی ہے، اور جب افراد بغیر کسی استناد کے غیر صحیح معلومات یا عقائد کو اپنے ذہنوں میں جگہ دیتے ہیں، تو یہ معاملہ زیادہ پیچیدہ اور نقصان دہ بن جاتا ہے۔ لیکن جہاں انفرادی سطح پر یہ عمل نقصان دہ ہوتا ہے، وہاں یہ اجتماعی سطح پر ایک بڑی ثقافتی تبدیلی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

جب ایک نسل اپنے بزرگوں سے حاصل شدہ معلومات یا تجربات کو بلا کسی سوال یا تحقیق کے تسلیم کرتی ہے، تو یہ معلومات ایک روایت کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ اس روایت کو اس قدر مضبوطی سے اپنایا جاتا ہے کہ کسی نئی سوچ یا تحقیق کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ دوسری نسل اپنے بزرگوں کی باتوں کو اس سچائی کے طور پر قبول کر لیتی ہے کہ اس پر سوال کرنا گناہ سمجھا جاتا ہے، یا کم از کم اس کا فائدہ نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ تیسری نسل تک پہنچتے پہنچتے یہ روایت اتنی مستحکم ہو جاتی ہے کہ یہ ایک عقیدہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے، جس پر کوئی سوال کرنا نہ صرف مشکل بلکہ بعض اوقات بے ادبی یا توہین سمجھا جاتا ہے۔

یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ اس کی حقیقت اور اصل شکل کی کھوج کرنا ناممکن نہ ہو جائے۔ جب معاشرتی سطح پر کوئی عقیدہ یا روایت حقیقت یا حقائق سے ہٹ کر بن جاتی ہے تو اس کی جڑیں اتنی گہری ہو جاتی ہیں کہ اسے رد کرنا یا اس کی حقیقت کو بے نقاب کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہ بے بنیاد روایات اور عقائد صرف فرد کے ذہن تک محدود نہیں رہتے، بلکہ پورے معاشرے میں رائج ہو کر ایک جزو بن جاتے ہیں۔

اس تمام عمل کو روکنے کا واحد طریقہ سوال کرنے، تحقیق کرنے اور علم کے حصول کو اپنے روزمرہ کے معمولات میں شامل کرنا ہے۔ جب معاشرتی سطح پر سوال کرنے کی آزادی کو فروغ دیا جائے اور فرد کو نئے خیالات اور سوچوں کی جانب راغب کیا جائے، تو وہ جہالت کی اس سرنگ سے نکل سکتا ہے جس میں اس نے اپنے آبا اجداد کی روایات کو بلا تحقیق اپنایا تھا۔ اگر ثقافت میں اندھی تقلید کو فروغ دیا جائے، یا سوال کرنے کے حق کو سلب کیا جائے، تو نہ صرف موجودہ نسل بلکہ آئندہ آنے والی نسلیں بھی ان غلطیوں کا شکار ہو جاتی ہیں، جو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہو جاتی ہیں۔

اس لئے یہ بہت ضروری ہے کہ ہم اپنی روایات اور عقائد کو ہر وقت علم اور حکمت کی روشنی میں پرکھیں۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو ہم نہ صرف اپنی فکری آزادی سے محروم ہو جاتے ہیں بلکہ ہم ایک ایسی ثقافت کو فروغ دیتے ہیں جس میں غلط عقائد نسل در نسل منتقل ہوتے رہتے ہیں، جو حقیقت سے بہت دور ہوتے ہیں۔ اس سے معاشرت میں ایک ایسی فضا قائم ہو جاتی ہے جس میں تبدیلی یا ترقی کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔

اس قول کی روشنی میں ہمیں اپنی زندگی میں غور و فکر، تحقیق اور خود احتسابی کو فروغ دینا چاہیے تا کہ ہماری ثقافت اور عقائد حقیقت اور علم کی بنیاد پر استوار ہوں، نہ کہ جہالت یا اندھی تقلید کی وجہ سے۔ ہمیں اس بات کا ادراک ہونا چاہیے کہ ایک صحت مند معاشرہ وہی ہے جہاں سوالات کیے جاتے ہیں، جہاں علم کا حصول ایک مستقل عمل ہے اور جہاں عقائد اور روایات کو ہمیشہ چیلنج کیا جاتا ہے تا کہ وہ حقیقت کے قریب ہوں اور فرد و معاشرت کی ترقی میں مدد فراہم کریں۔ اس طرح ہم اپنی ثقافت کو مضبوط اور متوازن بنا سکتے ہیں اور اسے ایک فکری آزادی کی بنیاد پر ترقی کی راہ پر گامزن کر سکتے ہیں۔

بدگمانی اور غلط فہمی ذہنی پریشانی کا اہم سبب

غلط فہمیوں کا شکار ہونا انسانی نفسیات کا ایک عام پہلو ہے، لیکن یہ عادت ہمارے فیصلوں اور تعلقات پر گہرے منفی اثرات ڈال سکتی ہے۔ جب ہم کسی بات یا صورتحال کا مکمل جائزہ لیے بغیر فوری نتیجہ نکالتے ہیں، تو یہ رویہ نہ صرف ہمارے فہم و شعور کی کمی کو ظاہر کرتا ہے بلکہ ہمارے تعلقات، پیشہ ورانہ زندگی اور خود اعتمادی کو بھی متاثر کرتا ہے۔ ایسے فیصلے جو جلدبازی میں کیے جائیں، اکثر ندامت اور پچھتاوے کا باعث بنتے ہیں۔
اسلامی تعلیمات میں غور و فکر کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں" :وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ "ؕ (اور کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ چلو جس کا تمہیں علم نہیں)۔ یہ آیت ہمیں یاد دلاتی ہے کہ کسی معاملے پر رائے قائم کرنے سے پہلے

ہمیں مکمل علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ جلد بازی اور سطحی سوچ نہ صرف ہمیں حقائق سے دور لے جاتی ہے بلکہ ہمارے اعمال کو غیر مؤثر اور غیر منصفانہ بھی بنا سکتی ہے۔

غلط فہمیوں سے بچنے کے لیے سب سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اپنے جذبات کو قابو میں رکھیں۔ اکثر اوقات، ہمارے جذبات ہمیں حقیقت کو دیکھنے سے روکتے ہیں اور ہم جلدی میں فیصلے کر لیتے ہیں۔ کسی بھی بات یا صورتحال پر رائے دینے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اپنے جذبات کو پر سکون کریں اور حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اپنائیں۔ ایک حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا" : جلد بازی شیطان کا کام ہے، اور ٹھہراؤ اللہ کا حکم ہے۔ "اس حدیث میں جلد بازی سے پرہیز اور ٹھہراؤ کے ساتھ عمل کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

غور و فکر کے عمل میں دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ ہم مختلف ذرائع سے معلومات حاصل کریں اور ہر پہلو کا تجزیہ کریں۔ ایک طرفہ کہانی پر یقین کرنا اکثر ہمیں گمراہ کر دیتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ہر ممکن پہلو پر غور کریں، حقائق کو پرکھیں، اور اپنے فیصلے کو تعصب سے پاک رکھیں۔ جب ہم کسی معاملے میں دوسرے فریق کی بات سنتے ہیں اور اس کے دلائل پر غور کرتے ہیں، تو ہمیں حقیقت تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے۔

غلط فہمیوں سے بچنے کے لیے ہمیں اپنے اندر سوال کرنے کی عادت کو فروغ دینا چاہیے۔ سوالات کرنے سے نہ صرف ہماری فہم و بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ یہ عمل ہمیں جلد بازی سے روک کر ایک متوازن اور محتاط فیصلہ کرنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔ امام علیؑ نے فرمایا" : جو شخص غور و فکر کے بغیر عمل کرتا ہے، وہ خود کو ہلاکت میں ڈال دیتا ہے۔ "یہ قول اس بات کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے کہ ہر عمل اور فیصلہ کرنے سے پہلے غور و فکر ضروری ہے۔

غلط فہمیوں کا شکار ہونے کی ایک اہم وجہ دوسروں کے بارے میں جلدی منفی رائے قائم کرنا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم دوسروں کی نیت پر شک کرنے کے بجائے حسن ظن رکھیں۔ کسی کی بات یا عمل کے پیچھے چھپی نیت کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اسے مثبت انداز سے دیکھیں۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے" :مسلمان کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ اپنے بھائی کے بارے میں حسن ظن رکھے۔ "یہ تعلیم ہمیں دوسروں کے بارے میں مثبت رویہ اختیار کرنے اور غلط فہمیوں سے بچنے کی راہ دکھاتی ہے۔

آخری بات یہ کہ غلط فہمیوں سے بچنے کے لیے ہمیں تحمل اور صبر کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ جلدی نتیجہ نکالنا اکثر جلد بازی اور بے صبری کی علامت ہوتا ہے۔ اگر ہم اپنے فیصلوں کو وقت دیں اور ہر پہلو پر غور کریں، تو ہمارے فیصلے نہ صرف درست ہوں گے بلکہ وہ انصاف اور حکمت پر مبنی بھی ہوں گے۔ تحمل کے ساتھ سوچنا اور فیصلہ کرنا نہ صرف ہماری ذاتی زندگی بلکہ ہمارے تعلقات اور پیشہ ورانہ زندگی کو بھی بہتر بناتا ہے۔

غلط فہمیوں سے بچنے کا عمل وقت اور محنت طلب ہو سکتا ہے، لیکن یہ ہماری شخصیت اور ذہنی سکون کے لیے بے حد ضروری ہے۔ جب ہم ہر بات پر غور و فکر کرتے ہیں اور حقائق کی روشنی میں فیصلے کرتے ہیں، تو ہم اپنی زندگی میں مثبت تبدیلی لا سکتے ہیں اور دوسروں کے ساتھ مضبوط اور خوشگوار تعلقات قائم کر سکتے ہیں۔ یہی وہ رویہ ہے جو نہ صرف ہمیں بہتر انسان بناتا ہے بلکہ ہمیں اللہ کی خوشنودی اور معاشرے میں عزت و وقار کا مستحق بھی بناتا ہے۔

غلط فہمیوں کا شکار ہونے کی عادت کو ختم کرنا انسان کی شخصیت سازی اور معاشرتی ہم آہنگی کے لیے انتہائی اہم ہے۔ اس عادت کے خاتمے کے لیے درج ذیل پہلو مزید وضاحت طلب ہیں تا کہ زندگی میں مزید مثبت تبدیلیاں لائی جا سکیں:

غلط فہمیوں کا ایک بنیادی سبب تعصب اور ذاتی رائے کو حقائق پر فوقیت دینا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اپنے ذہن کو کھلا رکھیں اور دوسروں کی رائے اور نظریات کو سننے اور سمجھنے کی کوشش کریں۔ تعصب سے پاک ذہن نہ صرف ہماری سوچ کو بہتر بناتا ہے بلکہ ہمیں سچائی تک پہنچنے میں بھی مدد دیتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿سورۃ﴾: وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ﴿سورۃ﴾ (جب بات کرو تو انصاف سے کرو، خواہ معاملہ قریبی عزیز کا ہی کیوں نہ ہو)۔ یہ آیت ہمیں یاد دلاتی ہے کہ حقائق پر مبنی رائے قائم کرنا انصاف اور دیانت داری کا تقاضا ہے۔

ایک اور پہلو یہ ہے کہ ہمیں جذباتی ردعمل دینے سے پہلے خود کو ٹھنڈا رکھنے کی مشق کرنی چاہیے۔ اکثر اوقات، فوری غصہ یا خوشی ہمیں حقیقت سے دور کر دیتی ہے، اور ہم ایسی باتوں یا اقدامات کا سہارا لیتے ہیں جو نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس کے برعکس، اگر ہم جذبات کے دباؤ سے باہر نکل کر صورتحال کو ٹھنڈے دماغ سے سمجھیں، تو ہم زیادہ متوازن اور حقیقت پسندانہ فیصلے کر سکیں گے۔ امام جعفر صادقؑ کا قول ہے" :جو شخص غصے کے وقت صبر کرے، وہ حکمت کے دروازے کھول لیتا ہے۔"

غلط فہمیوں کا ایک اور سبب افواہوں اور غیر مصدقہ معلومات پر بھروسا کرنا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم کسی بھی بات پر یقین کرنے سے پہلے اس کی تصدیق کریں۔ موجودہ دور میں،

جہاں معلومات کی بہتات ہے، افواہیں اور جھوٹے بیانات بہت آسانی سے پھیل جاتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم ہر خبر یا بات کو تحقیق کے بغیر قبول نہ کریں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں" :یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُو "(اے ایمان والو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کرو)۔

مزید برآں، غلط فہمیوں کا خاتمہ دوسروں کے ساتھ کھلے اور مثبت مکالمے کے ذریعے بھی ممکن ہے۔ جب ہم اپنی شکایات اور سوالات کا اظہار براہ راست متعلقہ شخص سے کرتے ہیں، تو ہم زیادہ بہتر انداز میں حقیقت جان سکتے ہیں اور مسائل کو فوری حل کر سکتے ہیں۔ خاموشی اختیار کرنا یا غیر ضروری قیاس آرائیاں کرنا غلط فہمیوں کو بڑھاتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے سوالات کے جواب لینے کے لیے مناسب اور مؤثر طریقہ اختیار کریں تاکہ تنازعات اور الجھنوں کو ختم کیا جا سکے۔

غلط فہمیوں سے بچنے کا ایک اہم پہلو اپنے اندر تحمل اور برداشت پیدا کرنا ہے۔ دوسرے لوگوں کے رویوں اور باتوں کو برداشت کرنے اور ان کے پس منظر کو سمجھنے کی کوشش کرنا ہمیں زیادہ پر امن اور بہتر انسان بناتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے" :مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ "یہ تعلیم ہمیں سکھاتی ہے کہ ہم اپنی رائے اور عمل سے دوسروں کو نقصان پہنچانے سے گریز کریں اور دوسروں کے بارے میں اچھے گمان رکھیں۔

آخری اور اہم بات یہ ہے کہ غلط فہمیوں سے بچنے کے لیے خود شناسی ضروری ہے۔ جب ہم اپنی کمزوریوں اور غلطیوں کو تسلیم کرتے ہیں، تو ہم دوسروں کے بارے میں جلد بازی سے

نتیجہ اخذ کرنے سے بچتے ہیں۔ خود احتسابی ہمیں سکھاتی ہے کہ ہم اپنے خیالات اور افعال کو بہتر بنائیں اور دوسروں کو بھی وہی احترام دیں جو ہم اپنے لیے چاہتے ہیں۔
غلط فہمیوں کا خاتمہ ایک مسلسل عمل ہے جو وقت اور محنت طلب کرتا ہے، لیکن اس کا نتیجہ ہماری ذاتی اور سماجی زندگی میں گہرے مثبت اثرات کے طور پر سامنے آتا ہے۔ یہ عمل نہ صرف ہمیں بہتر انسان بناتا ہے بلکہ ہمیں اللہ کے قریب بھی کرتا ہے، جو انصاف اور سچائی کو پسند کرتا ہے۔

بغض، تعصب، اور حسد

بغض، تعصب، اور حسد وہ منفی جذبات ہیں جو نہ صرف انسان کی اندرونی دنیا کو متاثر کرتے ہیں بلکہ اس کی شخصیت، سوچ، اور رویوں کو بھی منفی طور پر ڈھال دیتے ہیں۔ ان جذبات کا تجزیہ مختلف زاویوں سے کیا جا سکتا ہے، بشمول نفسیاتی، سماجی، اور روحانی پہلو۔ یہ جذبات انسان کی فطری جبلتوں اور داخلی کشمکش کا نتیجہ ہوتے ہیں اور ان کا اثر انسان کے داخلی سکون اور بیرونی تعلقات پر گہرا ہوتا ہے۔

نفسیاتی طور پر، بغض اور حسد اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب انسان خود کو دوسروں سے کمتر محسوس کرتا ہے یا دوسروں کی کامیابیوں، نعمتوں، یا خصوصیات کو اپنی کامیابی کے لیے خطرہ سمجھنے لگتا ہے۔ یہ احساس انسان کے اندر خود اعتمادی کی کمی، ماضی کی ناکامیوں یا ذاتی عدم اطمینان سے جنم لیتا ہے۔ جب کوئی فرد اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلے میں کمتر محسوس کرتا ہے، تو وہ دفاعی نظام کے طور پر بغض اور حسد کے جذبات اپناتا ہے۔ اس عمل میں وہ دوسروں کی کامیابیوں کو نہ صرف نظر انداز کرتا ہے بلکہ ان کے خلاف نفرت اور عداوت کو بھی جنم دیتا ہے۔ تعصب بھی اسی ذہنی کیفیت کا نتیجہ ہو سکتا ہے، جہاں انسان اپنی شناخت یا عقائد کو محفوظ رکھنے کے لیے دوسروں کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اس کا رویہ دوسروں کے ساتھ اجنبیت، تنقید اور دشمنی کی شکل اختیار کرتا ہے۔

سماجی طور پر، بغض اور تعصب کا اثر معاشرتی بگاڑ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایسے افراد اپنے ارد گرد منفی ماحول پیدا کرتے ہیں، جہاں رشتہ اور تعلقات نہ صرف زہر آلود ہو جاتے ہیں بلکہ سماجی ہم آہنگی بھی متاثر ہوتی ہے۔ بغض رکھنے والے افراد اکثر دوسروں کے بارے میں منفی باتیں کرتے ہیں، ان کی غلطیاں تلاش کرتے ہیں، اور ان کی کامیابیوں کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح کے رویے نہ صرف ان کے اپنے سماجی تعلقات کو نقصان پہنچاتے ہیں بلکہ اس سے پورے معاشرتی نظام میں فاصلہ، عدم اعتماد اور اختلافات بڑھتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں معاشرتی ہم آہنگی اور اشتراک کی جگہ نفرت اور کشمکش کی فضا پیدا ہو جاتی ہے، جو کسی بھی معاشرتی یا ثقافتی ترقی کے لیے مضر ثابت ہو سکتی ہے۔

روحانی طور پر، بغض، تعصب، اور حسد اللہ کی نعمتوں کی تقسیم پر عدم اطمینان اور ناشکری کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ جذبات اس حقیقت کا انکار کرتے ہیں کہ اللہ ہی ہر چیز کا مالک اور تقسیم کرنے والا ہے، اور ہر انسان کو وہی ملتا ہے جو اس کے لیے بہتر ہے۔ جب کوئی فرد اپنے دل میں ان منفی جذبات کو پال لیتا ہے، تو وہ دراصل اللہ کی مرضی کے خلاف ایک منفی جنگ میں مصروف ہو جاتا ہے، جس سے اس کی روحانیت متاثر ہوتی ہے۔ ایسے جذبات رکھنے والے لوگ اپنی دعاؤں اور عبادات میں سکون اور اطمینان کا احساس نہیں پاسکتے، کیونکہ وہ اندرونی طور پر ایک تنازعے کا شکار ہوتے ہیں، جو انہیں اللہ کے قریب نہیں آنے دیتا۔ یہ جذبات روح کے اندر ایک خلا پیدا کرتے ہیں، جو انسان کو سکون اور اطمینان سے محروم کر دیتا ہے۔

بغض، تعصب، اور حسد کا علاج ممکن ہے، لیکن اس کے لیے انسان کو اپنی اندرونی کمزوریوں کو تسلیم کرنا ہوگا اور ان پر قابو پانے کی کوشش کرنی ہوگی۔ خود احتسابی کا عمل ان جذبات پر قابو پانے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے، جہاں انسان اپنے رویوں اور نیتوں کا جائزہ لیتا ہے۔ اس عمل کے ذریعے وہ نہ صرف اپنی روحانی حالت کو بہتر بنا سکتا ہے بلکہ اپنے معاشرتی تعلقات کو بھی صاف اور مثبت بناسکتا ہے۔ اللہ کے ساتھ تعلق مضبوط کرنے، نعمتوں پر شکر گزار ہونے، اور دوسروں کے لیے دل سے خیر خواہی رکھنے سے بغض، تعصب، اور حسد جیسے منفی جذبات کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ قرآن اور سنت میں بار بار معاف کرنے، محبت

کرنے، اور دوسروں کے لیے خیر خواہی رکھنے کی ترغیب دی گئی ہے، جو ان منفی جذبات کے خلاف ایک مضبوط ڈھال فراہم کرتی ہیں۔

بغض اور تعصب رکھنے والے افراد کو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ جذبات نہ صرف دوسروں کے لیے نقصان دہ ہیں بلکہ خود ان کی اپنی شخصیت، زندگی، اور آخرت کے لیے بھی تباہ کن ہیں۔ ایسے جذبات کا حامل فرد اپنی زندگی میں اضطراب، عدم سکون اور داخلی کشمکش کا سامنا کرتا ہے۔ ایسے رویوں کا خاتمہ کرنے سے انسان اپنے آپ کے ساتھ بہتر تعلق قائم کر سکتا ہے، جو اسے ایک متوازن، پر سکون، اور بامقصد زندگی گزارنے کا موقع دیتا ہے۔ یہ عمل انسان کو دوسروں کے ساتھ محبت، احترام، اور ہمدردی کے جذبات پیدا کرنے کی ترغیب دیتا ہے، جو ایک بہتر معاشرتی اور روحانی زندگی کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

آخرکار، بغض، تعصب، اور حسد جیسے منفی جذبات انسان کی روح، ذہن، اور معاشرتی تعلقات پر سنگین اثرات مرتب کرتے ہیں۔ ان جذبات سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے اندر احتساب کا عمل جاری رکھیں، اللہ کی رضا کو مقدم رکھیں، اور اپنی زندگی میں محبت، ہمدردی، اور خیر خواہی کے جذبات کو فروغ دیں تاکہ ہم اپنے آپ اور دوسروں کے ساتھ بہتر تعلقات قائم کر سکیں اور ایک سکونت بھری زندگی گزار سکیں۔

پاکستان میں فیملی سسٹم کا زوال اور اس کا ممکنہ حل

پاکستان میں فیملی سسٹم کے زوال کی وجوہات کئی پہلوؤں سے جڑی ہوئی ہیں جنہیں سمجھنا اور حل نکالنا ضروری ہے۔ ماضی میں خاندان کے افراد کے درمیان قریبی تعلقات، باہمی تعاون اور سادگی پر مبنی زندگی عام تھی۔ خاندانوں میں بچے زیادہ ہوتے تھے، اور ہر بچہ اپنے حصے کا کام کر کے گھر کے اخراجات میں مدد فراہم کرتا تھا۔ والدین کے لیے بچوں کی پرورش

زیادہ بوجھ نہیں ہوتی تھی کیونکہ تعلیم کا زیادہ رجحان نہیں تھا اور سادہ زندگی میں بچوں کو خود مختار بننے کی تربیت دی جاتی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ، سماجی اور معاشی حالات میں بڑی تبدیلیاں آئیں۔ دیہی زندگی سے شہروں کی طرف نقل مکانی، مغربی طرزِ زندگی کا فروغ، اور تعلیم میں بڑھتے ہوئے مقابلے نے روایتی خاندانی نظام کو متاثر کیا۔ والدین نے بہتر مستقبل کے لیے اپنی زندگی کی قربانیاں دیں، لیکن اولاد سے بے جا توقعات اور ان پر ضرورت سے زیادہ دباؤ نے تعلقات میں دوریاں پیدا کیں۔ تعلیم، جو پہلے زندگی کو بہتر بنانے کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی، اب والدین اور بچوں کے درمیان اختلافات کا سبب بن گئی۔

معاشی دباؤ اور والدین کی غیر موجودگی نے بچوں کو احساسِ محرومی میں مبتلا کر دیا۔ اس کے نتیجے میں دونوں نسلوں میں فرسٹریشن بڑھ گئی۔ اولاد کے بگڑتے رویوں اور والدین کی سختیوں نے محبت کے تعلقات کو تلخی میں بدل دیا۔ جب والدین اپنی عمر بھر کی کمائی کو اپنی اولاد پر خرچ کرتے ہیں، تو وہ بدلے میں ان سے تابعداری اور توقعات پوری ہونے کی امید رکھتے ہیں، جو اکثر تعلقات میں تنازع کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

خاندانی سیاست، رشتے داری میں بداعتمادی، اور والدین کے غیر منصفانہ رویے نے اس بحران کو مزید بڑھاوا دیا۔ اولاد کی شادی کے بعد والدین اور بہو یا داماد کے درمیان اختلافات بڑھ جاتے ہیں، جس کا اثر بچوں کی تربیت پر بھی پڑتا ہے۔ خاندانی سیاست اور جھگڑوں نے رشتوں کو کمزور کر دیا، اور اب برادری سسٹم صرف رسمی شناخت تک محدود ہو چکا ہے۔

ان مسائل کا حل والدین اور بچوں کے درمیان اعتماد، محبت، اور سمجھداری کے تعلقات کو فروغ دینا ہے۔ والدین کو چاہیے کہ وہ بچوں کی تعلیم اور تربیت کو بوجھ کے بجائے ان کی ذاتی نشوونما کا ذریعہ سمجھیں۔ بچوں کی کامیابی یا ناکامی پر انہیں سرزنش کرنے کے بجائے ان کی حوصلہ افزائی کریں۔ خاندانی تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ والدین اپنی توقعات کو حقیقت پسندانہ بنائیں اور بچوں کو ان کی اپنی زندگی کے فیصلے کرنے دیں۔

والدین اور اولاد کے درمیان کھلے دل سے بات چیت اور تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے وقت دینا ضروری ہے۔ خاندانی نظام کو بچانے کے لیے پرانی روایات اور اخلاقیات کو جدید دور کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنا ہوگا۔ صرف اسی صورت میں ہم فیملی سسٹم کو زوال سے بچاسکتے ہیں اور دوبارہ مضبوط خاندانی تعلقات قائم کرسکتے ہیں۔

ان مسائل کے حل کو عملی طور پر نافذ کرنے کے لیے ایک جامع حکمت عملی درکار ہے جو معاشرتی، مذہبی، اور معاشی پہلوؤں کو مدنظر رکھے۔ ماضی میں جو خاندان قریبی تعلقات اور سادگی پر مبنی تھے، ان کے بکھرنے میں کئی عوامل نے کردار ادا کیا ہے، لیکن یہ مسئلہ ناقابلِ حل نہیں۔ اس کو تھوڑا توضیح کے ساتھ بیان کرتے ہیں اس کا حل تعلقات کی تجدید، معاشرتی رویوں میں تبدیلی، اور مذہبی و اخلاقی اصولوں کی پاسداری سے ممکن ہے۔

والدین اور بچوں کے درمیان اعتماد اور محبت کا تعلق اس نظام کی بنیاد ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ والدین بچوں کی تعلیم اور تربیت کو محض ذمہ داری نہ سمجھیں بلکہ اسے ان کی شخصیت سازی اور خودمختاری کا ذریعہ بنائیں۔ بچوں پر ضرورت سے زیادہ توقعات یا دباؤ

ڈالنے سے گریز کریں اور ان کی کامیابیوں اور ناکامیوں کو یکساں اہمیت دیں۔ والدین کو بچوں کے ساتھ اپنے تعلق کو ایک رشتے کے بجائے ایک دوستی کے طور پر استوار کرنا ہو گا، جہاں بچے اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار آزادی سے کر سکیں۔

خاندانی سیاست اور رشتوں میں عدم اعتماد کو ختم کرنے کے لیے والدین کو انصاف پر مبنی رویہ اپنانا ہو گا۔ بہو یا داماد کے ساتھ تعلقات میں والدین کی مثبت سوچ اور خلوص بہت اہم ہے۔ اختلافات کو بڑھاوا دینے کے بجائے انہیں حل کرنے کی کوشش کریں اور بچوں کے ازدواجی تعلقات میں مداخلت کرنے سے گریز کریں۔ خاندانی نظام کی مضبوطی کے لیے ضروری ہے کہ ہر فرد کو اس کے حقوق دیے جائیں اور ہر رشتہ عزت و احترام کی بنیاد پر قائم ہو۔

معاشی مسائل اور سماجی دباؤ، جو خاندانی زوال کی بڑی وجوہات میں شامل ہیں، ان کا حل مل جل کر زندگی گزارنے کی تربیت میں ہے۔ والدین اور بچوں کو فضول خرچی سے بچنا چاہیے اور زندگی کے سادہ اصول اپنانے چاہییں۔ تعلیم کو محض کیریئر بنانے کے لیے نہیں بلکہ کردار سازی اور خاندانی اقدار کی پاسداری کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے۔

اسلامی تعلیمات اور اخلاقیات کو دوبارہ معاشرتی زندگی کا حصہ بنانا ہو گا۔ قرآن و سنت ہمیں رشتوں کی اہمیت، ذمہ داریوں، اور انصاف کے اصول سکھاتے ہیں، جو مضبوط خاندانی نظام کی بنیاد ہیں۔ والدین کو چاہیے کہ وہ اپنی تربیت میں اسلامی اقدار کو شامل کریں اور بچوں کو بھی ان کے حقیقی معنی سمجھائیں۔

حل کے نفاذ میں کچھ رکاوٹیں ضرور آئیں گی۔ والدین کی پرانی روایات اور بچوں کی جدید سوچ کے درمیان فرق، معاشرتی دباؤ، اور خاندانی سیاست کو ختم کرنا آسان نہیں ہو گا۔ ان رکاوٹوں کا مقابلہ کرنے کے لیے والدین کو اپنی سوچ میں لچک پیدا کرنی ہو گی اور بچوں کو بھی روایات کی اہمیت سکھانی ہو گی۔ معاشرتی شعور بیدار کرنے کے لیے تعلیمی نظام اور میڈیا کو اپنا کردار ادا کرنا ہو گا تاکہ خاندانی نظام کی اہمیت کو اجاگر کیا جا سکے۔

اگرچہ یہ عمل وقت طلب ہے، لیکن والدین اور بچوں کے درمیان محبت، اعتماد، اور باہمی تعاون کا رشتہ مضبوط ہو جائے تو خاندانی نظام کو زوال سے بچایا جا سکتا ہے۔ ہمیں اپنے رویوں میں تبدیلی لانی ہو گی، اور خاندانی اقدار کو مذہبی اصولوں اور جدید تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنا ہو گا تاکہ معاشرہ دوبارہ ایک مضبوط خاندانی ڈھانچے کی بنیاد پر کھڑا ہو سکے۔

تبلیغ و تربیت کے ثقافتی طریقے

انسانی فطرت اور اس کے معاشرتی رویے ہمیشہ ایک حساس موضوع رہے ہیں، کیونکہ انسان پر اثر انداز ہونا اور اسے کسی چیز کی طرف مائل کرنا ایک نازک عمل ہے۔ ایسے میں مذہبی، سیاسی اور معاشی عقائد کو مؤثر انداز میں پیش کرنا بہت اہم ہے۔ اگر ان نظریات کو خوبصورت ثقافتی انداز میں پیش کیا جائے، جیسے کھانے کی دعوت، تحائف یا دیگر دلچسپ اور خوشگوار طریقے، تو لوگ ان پر غور کرنے اور ان کو سمجھنے کے لیے زیادہ تیار ہوتے ہیں۔ صدر اسلام کے معاشروں میں تحفے دینے اور دیگر معاشرتی تقریبات کا رواج اسی حکمت عملی کا عکاس ہے، جہاں محبت اور خوش اخلاقی کے ذریعے لوگوں کو قریب لایا جاتا ہے۔

محبت اور انسانی تعلق کی بنیاد پر پیغام رسانی نہ صرف دلوں میں جگہ بناتی ہے بلکہ معاشرتی ہم آہنگی کو فروغ دیتی ہے۔ جب افراد کو احساس ہوتا ہے کہ ان کے جذبات اور ضروریات کا

احترام کیا جارہا ہے تو وہ خود بخود غور و فکر کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس، اگر پیغام سختی، تنقید یا زبردستی کے انداز میں دیا جائے تو دلوں میں نفرت پیدا ہوتی ہے اور لوگ اپنی دفاعی دیواریں کھڑی کر لیتے ہیں۔ ایسے رویے معاشرے میں تقسیم اور اختلاف کو بڑھاوا دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں نہ صرف عقائد کی قبولیت مشکل ہوتی ہے بلکہ سماجی امن بھی متاثر ہوتا ہے۔

ثقافتی ذرائع کو ایک حکمت عملی کے طور پر استعمال کرتے ہوئے، ہم نہ صرف اپنے پیغام کو مؤثر بنا سکتے ہیں بلکہ ایک ایسا ماحول بھی تخلیق کر سکتے ہیں جہاں لوگ خوشی سے شرکت کریں۔ مثال کے طور پر، تعلیمی پروگرام، آرٹ اور موسیقی کی تقریبات، اور خاندانی میل ملاپ کے مواقع ایسے پلیٹ فارم فراہم کرسکتے ہیں جہاں لوگوں کو تفریح اور علم دونوں میسر ہوں۔ یہ حکمت عملی ایک نرم اور غیر محسوس انداز میں لوگوں کو حقائق کے قریب لے آتی ہے۔

ہمیں یہ سمجھنا ہو گا کہ دعوت اور تربیت کا مطلب صرف پیغام پہنچانا نہیں بلکہ یہ دیکھنا بھی ہے کہ پیغام کس انداز میں دیا جارہا ہے۔ خوش اخلاقی، صبر، اور حکمت کا استعمال ایک کامیاب دعوت کی بنیاد ہے۔ انسانوں کے ساتھ محبت اور ہمدردی کے ساتھ پیش آنا ان کے دلوں میں اعتماد پیدا کرتا ہے اور ان کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ جب افراد محسوس کرتے ہیں کہ ان کے خیالات اور احساسات کی قدر کی جارہی ہے، تو وہ خود بخود اپنی رائے پر نظر ثانی کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

لہٰذا، عقائد کو پیش کرنے کا انداز نرم، محبت بھرا اور ثقافتی ہونا چاہیے، تاکہ لوگ ان نظریات کو نہ صرف قبول کریں بلکہ ان کو اپنی زندگی کا حصہ بھی بنائیں۔ حقیقی تبدیلی ہمیشہ

دلوں کو جیتنے سے آتی ہے، اور دل محبت، حکمت اور خوش اخلاقی کے ذریعے جیتے جاسکتے ہیں۔

محبت اور انسانی تعلق کی بنیاد پر پیغام رسانی نہ صرف دلوں میں جگہ بناتی ہے بلکہ معاشرتی ہم آہنگی کو فروغ دیتی ہے۔ جب افراد کو احساس ہوتا ہے کہ ان کے جذبات اور ضروریات کا احترام کیا جارہا ہے تو وہ خود بخود غور و فکر کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ جب کہ سخت و درشت رویے معاشرے میں تقسیم اور اختلاف کو بڑھاوا دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں نہ صرف عقائد کی قبولیت مشکل ہوتی ہے بلکہ سماجی امن بھی متاثر ہوتا ہے۔ انسانوں کے ساتھ محبت اور ہمدردی کے ساتھ پیش آنا ان کے دلوں میں اعتماد پیدا کرتا ہے اور ان کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ جب افراد محسوس کرتے ہیں کہ ان کے خیالات اور احساسات کی قدر کی جارہی ہے، تو وہ خود بخود اپنی رائے پر نظر ثانی کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

لہٰذا، عقائد کو پیش کرنے کا انداز نرم، محبت بھرا اور ثقافتی ہونا چاہیے، تاکہ لوگ ان نظریات کو نہ صرف قبول کریں بلکہ ان کو اپنی زندگی کا حصہ بھی بنائیں۔ حقیقی تبدیلی ہمیشہ دلوں کو جیتنے سے آتی ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ انسانی معاشروں میں اصلاح اور رہنمائی کا عمل ہمیشہ نرمی اور محبت کے ذریعے زیادہ کامیاب رہا ہے۔ انسان کی فطرت اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ وہ سختی اور درشتگی سے دور بھاگتا ہے اور نرمی اور محبت کے قریب آتا ہے۔ تبلیغ و تربیت کے میدان میں بھی یہی اصول کارفرما ہیں۔ جب ہم اپنے پیغام کو ثقافتی طریقوں کے ذریعے لوگوں تک پہنچاتے ہیں تو وہ اس پیغام کو زیادہ آسانی سے قبول کرتے ہیں۔

ثقافت ایک ایسا ذریعہ ہے جو انسانی جذبات، احساسات اور شعور کو ایک ہی وقت میں مخاطب کرتی ہے۔ ثقافتی طور پر پیش کیا گیا پیغام انسان کے دل میں جگہ بناتا ہے اور اس کے ذہن میں سوالات پیدا کرتا ہے۔ یہ سوالات انسان کو غور و فکر کرنے پر مجبور کرتے ہیں، اور یہی غور و فکر وہ راہ ہموار کرتا ہے جو حق کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کے برعکس، سختی اور زبردستی انسان کو باغی بنا دیتی ہے اور وہ حق کی روشنی سے دور ہو جاتا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اس بات کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہے کہ نرمی اور محبت کے ذریعے کیسے دل جیتے جاسکتے ہیں۔ آپؐ نے ہمیشہ اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی حسنِ سلوک سے پیش آنے کا درس دیا۔ جب آپؐ نے طائف کے لوگوں کی سختیوں کے باوجود ان کے لئے دعا کی، تو یہ اس بات کی دلیل تھی کہ محبت اور نرمی ہی وہ طاقت ہے جو انسان کے دل کو بدل سکتی ہے۔

آج کے دور میں بھی، جب ہم اسلام کے پیغام کو عام کرنا چاہتے ہیں، تو ہمیں اس بات کو سمجھنا ہو گا کہ درشتگی اور سختی کے ذریعے ہم لوگوں کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتے۔ بلکہ ہمیں ان کی زبان، ثقافت اور روایات کو سمجھتے ہوئے ان کے دلوں میں اپنے پیغام کے لئے جگہ بنانی ہو گی۔ اس مقصد کے لئے، ہمیں ایسے مواقع پیدا کرنے چاہییں جہاں ہم ان کے ساتھ محبت اور بھائی چارے کا مظاہرہ کریں اور ان کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کریں۔

ثقافت کے ذریعے تبلیغ کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ یہ انسان کو احساساتی طور پر متوجہ کرتی ہے۔ انسان کے جذبات اس کی عقل پر اثر انداز ہوتے ہیں، اور جب کوئی پیغام اس کے دل کو چھوتا ہے تو وہ اس پر غور کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں بھی بارہا نرم رویے اور حکمت کے ساتھ دعوت دینے کی تلقین کی گئی ہے۔

باطل اور فیک گروہ اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لئے سختی اور زور زبردستی کا سہارا لیتے ہیں، مگر یہ طریقہ ہمیشہ وقتی ثابت ہوتا ہے۔ حق اور سچائی کی قوت ہمیشہ نرمی اور حکمت میں مضمر ہوتی ہے۔ جب ہم اس روش کو اپناتے ہیں تو باطل خود بخود اپنی اہمیت کھو دیتا ہے اور لوگ حق کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

لہذا، تبلیغ و تربیت کے لئے نرمی اور محبت ہی بہترین راستہ ہے۔ ثقافتی طریقے اس عمل کو مزید موثر بناتے ہیں کیونکہ یہ انسان کے دل و دماغ کو ایک ساتھ مخاطب کرتے ہیں۔ نبی اکرمؐ کی سیرت اور قرآنی تعلیمات ہمیں اس بات کی تلقین کرتی ہیں کہ ہم سختی کے بجائے نرمی کے ذریعے اپنے پیغام کو پھیلائیں تاکہ انسان نہ صرف حق کو قبول کرے بلکہ اس پر عمل پیرا بھی ہو۔

تقلید کریں مگر اندھی نہیں

اندھی تقلید ایک ایسا رویہ ہے جو انسانی شعور اور آزادیٔ فکر کو محدود کر دیتا ہے۔ یہ وہ حالت ہے جہاں انسان بغیر غور و فکر کے دوسروں کے خیالات اور اعمال کو اپناتا ہے، چاہے وہ خیالات درست ہوں یا غلط۔ اندھی تقلید کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ یہ ہماری عقل اور سمجھ بوجھ کو غیر فعال کر دیتی ہے، اور ہمیں ایک ایسی زندگی کی طرف لے جاتی ہے جہاں ہم اپنی مرضی کے بغیر دوسروں کے خیالات اور روایات کے تابع ہو جاتے ہیں۔

قرآن مجید اور اسلامی تعلیمات میں کئی مواقع پر اس رویے کی مذمت کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں متعدد بار ایسے لوگوں کی تنبیہ کی ہے جو اپنے آباء و اجداد کی روایات کو بغیر سوچے سمجھے اپناتے ہیں، چاہے وہ روایات گمراہی پر مبنی ہوں۔ ایک مشہور آیت میں فرمایا: "وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللّٰهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا "(اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے نازل کردہ حکم کی پیروی کرو، تو وہ کہتے ہیں: ہم تو اس طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا)۔ یہ رویہ ظاہر کرتا ہے کہ انسان اگر

اپنی عقل کا استعمال نہ کرے تو وہ صرف موروثی خیالات پر انحصار کر کے اپنے آپ کو گمراہی کی طرف لے جا سکتا ہے۔

اندھی تقلید کے بر عکس، اسلام ہمیں غور و فکر، سوالات کرنے، اور عقل و دانش کے استعمال کی تلقین کرتا ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ہے" : **تفکر ایک گھنٹہ، ستر سال کی عبادت سے افضل ہے**"۔ یہ بات واضح کرتی ہے کہ دین میں اندھی تقلید کے بجائے سوچنے اور سمجھنے کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ ہم ہر بات کو پرکھیں، دلائل تلاش کریں، اور اس کے بعد ہی کسی بات یا عمل کو قبول کریں۔

سوالات کرنے اور خود فیصلے کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم دوسروں کی رہنمائی کو بالکل رد کر دیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم دوسروں کی باتوں کو سنیں، ان پر غور کریں، اور اپنی عقل کے ذریعے ان کا تجزیہ کریں۔ اگر وہ بات درست ہو، تو اسے اپنائیں، اور اگر وہ غلط ہو، تو اسے مسترد کر دیں۔

ہماری زندگی کے فیصلے، چاہے وہ مذہبی ہوں، معاشرتی ہوں، یا ذاتی، ہماری اپنی عقل و دانش پر مبنی ہونے چاہئیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم علم حاصل کریں، دلائل پر غور کریں، اور اپنی زندگی کو اس بنیاد پر ترتیب دیں جو حقائق اور عقل پر مبنی ہو۔ یہ رویہ نہ صرف ہمیں بہتر انسان بناتا ہے بلکہ ہمیں اس قابل بھی کرتا ہے کہ ہم دوسروں کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بن سکیں۔

اندھی تقلید کو ختم کرنے کا پہلا قدم یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی میں خود مختاری کو ترجیح دیں۔ ہم دوسروں کے خیالات کو محض اس لیے نہ اپنائیں کہ وہ ہمارے بڑے یا بااختیار ہیں، بلکہ ہم

اپنی عقل، علم، اور تجربے کے ذریعے ان خیالات کی جانچ کریں۔ یہی رویہ ہماری زندگی کو ایک مقصد اور سمت عطا کرتا ہے اور ہمیں انفرادی اور اجتماعی طور پر کامیاب بناتا ہے۔

اندھی تقلید کا مسئلہ صرف انفرادی زندگی تک محدود نہیں بلکہ اس کے معاشرتی اور قومی اثرات بھی گہرے اور دور رس ہوتے ہیں۔ جب ایک معاشرہ اندھی تقلید کا شکار ہو جاتا ہے، تو وہ تنقیدی سوچ، تخلیقی صلاحیت، اور ترقی کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ ایسا معاشرہ جمود کا شکار ہو کر اپنے ماضی کی روایات میں قید ہو جاتا ہے اور نئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی راہیں تلاش کرنے میں ناکام رہتا ہے۔

اسلامی تاریخ میں بھی اندھی تقلید کے نتائج ہمیں واضح نظر آتے ہیں۔ جب مسلمانوں نے علمی ترقی کے دور میں غور و فکر اور اجتہاد کو اپنایا، تو وہ دنیا کی قیادت کرنے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن جب اجتہاد کو ترک کر کے تقلید پر انحصار بڑھا دیا گیا، تو زوال شروع ہو گیا۔ اس لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ تقلید صرف اس وقت فائدہ مند ہو سکتی ہے جب وہ شعوری ہو اور علم و دلیل کی بنیاد پر کی جائے، نہ کہ محض روایت یا خوف کی بنیاد پر۔

اندھی تقلید کے خاتمے کے لیے تعلیم ایک بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ تعلیم کا مقصد صرف معلومات کی فراہمی نہیں ہونا چاہیے بلکہ افراد کو تنقیدی سوچنے، سوال کرنے، اور تجزیہ کرنے کی صلاحیت دینا چاہیے۔ ایک ایسا تعلیمی نظام جو افراد کو سوالات کرنے سے روکے اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو دبا دے، درحقیقت اندھی تقلید کو فروغ دیتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ تعلیمی نظام کو ایسے طریقوں پر استوار کیا جائے جو طلبہ کو آزادانہ سوچنے اور اپنے نظریات پیش کرنے کی آزادی دے۔

اندھی تقلید کو ختم کرنے کے لیے ایک اور اہم عنصر اخلاقی جرات ہے۔ بہت سے لوگ سچائی کو جانتے ہوئے بھی اندھی تقلید کرتے ہیں کیونکہ وہ معاشرتی دباؤ یا خوف کا شکار ہوتے ہیں۔ ایسے افراد کو یہ سمجھنا ضروری ہے کہ سچائی کا ساتھ دینا اور حقائق پر مبنی فیصلے کرنا ایک اخلاقی فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں " : وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ "(اور گواہی کو نہ چھپاؤ، اور جو اسے چھپائے گا، اس کا دل گناہگار ہو گا)۔ یہ آیت ہمیں یہ درس دیتی ہے کہ حق کے بارے میں خاموشی اختیار کرنا یا غلطی کو صرف خوف کی وجہ سے قبول کرنا گناہ ہے۔

اندھی تقلید کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے ایک اور اہم پہلو معاشرتی مکالمے کو فروغ دینا ہے۔ معاشرے میں ایسا ماحول پیدا کرنا ضروری ہے جہاں مختلف خیالات اور نظریات کا احترام کیا جائے اور افراد کو اپنی رائے پیش کرنے کا موقع دیا جائے۔ اختلافِ رائے کو تنقید یا دشمنی کے بجائے تعمیری مکالمے کا ذریعہ سمجھنا چاہیے۔

اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہر تقلید اندھی نہیں ہوتی۔ بعض اوقات ہم ایسے ماہرین اور رہنماؤں کی رہنمائی قبول کرتے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں علم اور تجربے کے ذریعے سچائی کو سمجھا ہو۔ ایسے رہنماؤں کی پیروی کرنا شعوری اور منطقی عمل ہوتا ہے۔ لیکن یہاں بھی شرط یہی ہے کہ ان کی رہنمائی پرکھنے اور سوال کرنے کے اصولوں پر پورا اترے۔

آخر میں، اندھی تقلید کے خاتمے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کریں۔ ہمیں یہ یقین ہونا چاہیے کہ ہم اپنی عقل، علم، اور تجربے کے ذریعے درست اور غلط

کا فرق سمجھ سکتے ہیں۔ اس یقین کے ساتھ، ہم اندھی تقلید سے آزاد ہو کر ایک ایسی زندگی گزار سکتے ہیں جو شعور، حکمت، اور سچائی پر مبنی ہو۔ یہ رویہ نہ صرف ہماری انفرادی زندگی کو بہتر بنائے گا بلکہ ایک متوازن، ترقی یافتہ، اور شعوری معاشرے کی تشکیل میں بھی مددگار ثابت ہو گا۔

تکفیری گروہ اور امت مسلمہ (نفسیاتی تجزیہ)

تکفیری گروہ اور باعمل مسلمانوں کے درمیان نفسیاتی فرق کو سمجھنے کے لیے ہمیں ان کی ذہنی حالتوں، اعتقادی اصولوں، اور ان کے معاشرتی اور ذاتی رویوں پر گہری نظر ڈالنی ہو گی۔ تکفیری گروہ وہ افراد یا گروہ ہیں جو کسی دوسرے مسلمان کو کافر قرار دیتے ہیں، یہ مخصوص فرقے یا مسلک سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے عقائد کو واحد درست عقیدہ سمجھتے ہیں۔ اس نفسیاتی رویے کی جڑیں کئی عوامل میں پوشیدہ ہوتی ہیں۔

تکفیری نفسیات کا بنیادی عنصر فرقہ واریت اور اپنے آپ کو حق پر سمجھنا ہے۔ تکفیری افراد اپنے عقائد میں اتنے پختہ ہوتے ہیں کہ وہ دوسرے مسلمانوں کو غلط اور غیر اسلامی سمجھتے ہیں، حتی کہ انہیں جنت سے بھی محروم تصور کرتے ہیں۔ اس نفسیاتی سطح پر تکفیری گروہ میں خود کو افضل سمجھنے کا عنصر غالب آتا ہے، اور انہیں یہ یقین ہوتا ہے کہ ان کا عقیدہ ہی واحد

صحیح عقیدہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے مسلمانوں کو نہ صرف گمراہ سمجھتے ہیں بلکہ انہیں دنیا و آخرت میں سزا دینے کے بھی خواہشمند ہوتے ہیں۔ اس سوچ کو تقویت دینے کے لیے وہ اپنے عقائد کی ترویج کے لیے ہر ممکنہ اقدام اٹھاتے ہیں، خواہ وہ تشدد ہو یا بدنامی پھیلانا۔

ایک اور نفسیاتی پہلو جو تکفیری گروہ میں دیکھا جا سکتا ہے، وہ ان کی کمزور نفسیاتی ساخت ہے۔ یہ افراد اکثر اپنی زندگی میں غیر متوازن ہوتے ہیں، اور انہیں کسی قسم کی ذہنی یا جذباتی تسکین کی ضرورت ہوتی ہے۔ تکفیری گروہ میں شامل افراد میں احساسِ کمتری، مایوسی اور عدم خود اعتمادی کی علامات عام ہیں۔ ان کے لیے تکفیری عقائد ایک طرح سے نفسیاتی تحفظ فراہم کرتے ہیں، کیونکہ اس طرح وہ اپنے آپ کو برتر اور محفوظ سمجھنے لگتے ہیں۔

دوسری طرف، باعمل مسلمان وہ ہیں جو اسلام کے اصولوں پر قائم رہنے کی کوشش کرتے ہیں، اور ان کی زندگی کا مقصد اس بات کو یقینی بنانا ہوتا ہے کہ وہ خدا کے احکام کے مطابق زندگی گزاریں۔ باعمل مسلمانوں کی نفسیات میں ایک نمایاں خصوصیت توازن اور اخلاقی اقدار کی اہمیت ہے۔ یہ افراد فرقہ وارانہ تنازعات سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے مذہب کی بنیادی تعلیمات پر عمل پیرا ہوتے ہیں جیسے کہ حسن سلوک، صبر، اور معاف کرنے کی اہمیت۔ ان کی زندگی میں امن اور سکون کی تلاش ہوتی ہے، اور وہ اپنے عمل کے ذریعے معاشرے کی فلاح و بہبود میں حصہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

باعمل مسلمانوں کی نفسیات میں ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اپنے عقائد کو دوسروں کے عقائد پر مسلط کرنے کی بجائے، ان کی سمجھ کو بڑھانے اور انہیں بہتر زندگی گزارنے کی ترغیب دینے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ افراد اپنے آپ کو دوسرے مسلمانوں کے ساتھ

ہم آہنگی میں دیکھتے ہیں اور فرقہ واریت کو نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ ان کی ذاتی زندگیوں میں اخلاقی اقدار کی پیروی، عبادات کی اہمیت، اور سماجی تعلقات میں حسن سلوک نمایاں ہوتے ہیں۔ وہ دوسروں کے ساتھ احترام اور برابری کی بنیاد پر تعلقات استوار کرتے ہیں، اور ان کے لیے اسلام ایک ذریعہ ہے جو انسانوں کو محبت، تعاون اور صلح کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔
تکفیری گروہوں اور باعمل مسلمانوں کے درمیان نفسیاتی فرق اس بات کو واضح کرتا ہے کہ کس طرح افراد اپنے مذہب کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے میں مختلف انداز اپناتے ہیں۔ تکفیری گروہ کی نفسیاتی حالت میں شدت، تعصب، اور تکفیر کے عناصر غالب ہیں، جبکہ باعمل مسلمانوں کی نفسیات میں توازن، اخلاقی اصولوں کی پاسداری، اور دوسروں کے ساتھ ہم آہنگی پر زور دیا جاتا ہے۔ یہ فرق نہ صرف ان کے عقائد میں بلکہ ان کی ذاتی زندگیوں میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔

جدت پسندی اور تہذیبی حدود

جدت پسندی کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کا مطلب محض اندھی تقلید یا سطحی رویے اپنانا نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ایسا رویہ ہے جو نئے خیالات، طریقوں اور اندازِ فکر کو اپنانے پر مبنی ہوتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ حدود اور اصولوں کی پاسداری بھی لازمی ہے۔ دین، ثقافت، اور دیگر علوم میں جدت پسندی کے مختلف پہلو ہیں جنہیں الگ الگ سمجھنا ضروری ہے۔

دین میں جدت پسندی کی بات کریں تو یہ ہمیشہ دین کے بنیادی اصولوں کے دائرے میں رہتی ہے۔ دین کے اصول ابدی اور غیر متغیر ہیں، لیکن ان اصولوں کا اطلاق ہر دور کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق کیا جاسکتا ہے۔ اس کی بہترین مثال اجتہاد ہے، جو دین کی روح کو زندہ رکھتے ہوئے نئے مسائل کا حل نکالتا ہے۔ اجتہاد ایک ایسا عمل ہے جو دین کے بنیادی ڈھانچے کو محفوظ رکھتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ انسان کے بدلتے ہوئے حالات اور ضروریات کو بھی مد نظر رکھتا ہے۔ یہ وہی رویہ ہے جو اجتہاد کے ذریعے دینی جدت پسندی میں اختیار کیا جاتا ہے۔

ثقافت میں جدت پسندی کا مطلب نئی روایات، طرزِ زندگی اور اظہار کے انداز کو اپنانا ہو سکتا ہے، لیکن یہ تبدیلی دینی اور اخلاقی اصولوں کے تحت ہونی چاہیے۔ اگر جدت پسندی سے مراد صرف لباس کے اختصار یا اخلاقی انحطاط ہو، تو یہ ترقی نہیں بلکہ پستی کی علامت ہے۔ اسلام ہمیں اپنی ثقافت اور اقدار کی حفاظت کی ترغیب دیتا ہے، اور جو جدت دینی اصولوں سے متصادم نہ ہو، وہی قابل قبول ہو سکتی ہے۔

جدت پسندی کے حوالے سے جو عمومی غلط فہمیاں موجود ہیں، وہ زیادہ تر مغربی تقلید یا نام نہاد ترقی پسندی پر مبنی ہیں۔ مختصر لباس، بے حیائی، یا غیر اخلاقی عادات کو جدت سمجھنا دراصل ثقافتی انحراف کی علامت ہے۔ انگریزی زبان یا دیگر مہارتیں سیکھنا ایک مثبت رویہ ہو سکتا ہے، لیکن یہ اس وقت نقصان دہ ہو جاتا ہے جب اس کے ساتھ اپنی زبان، ثقافت، یا دینی اقدار کو ترک کر دیا جائے۔ اسی طرح سگریٹ یا شراب پینا کسی بھی لحاظ سے جدت پسندی کے زمرے میں نہیں آتا، بلکہ یہ انسانی صحت اور اخلاقیات کو نقصان پہنچانے والی عادتیں ہیں۔

دین کے دائرے میں بیان کردہ اصول اور معیارات جدت پسندی کے حوالے سے متوازن اور شرعی حدود کے مطابق ہیں۔ ہم دین میں اجتہاد کو جدت پسندی کا ذریعہ سمجھتے ہیں، جو کہ ایک مثبت پہلو ہے۔ اجتہاد کے ذریعے دین کے اصولوں کو زمانے کے تقاضوں کے مطابق عملی طور پر نافذ کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ثقافت میں جدت پسندی اسی وقت قابل قبول ہے

جب وہ دینی اور اخلاقی حدود کے اندر ہو۔ فکری اور سائنسی جدت پسندی بھی تبھی حقیقی ترقی کا ذریعہ بن سکتی ہے جب یہ دینی اصولوں کے مطابق ہو۔

اسلام جدت پسندی کو ایک خاص معیار پر پرکھتا ہے۔ کسی بھی نئی چیز کو محض اس لیے قبول نہیں کیا جاتا کہ وہ نئی ہے، بلکہ اس کے پیچھے اخلاقی، روحانی اور فکری بنیاد ہونی چاہیے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "ان اللہ لایغیر مابقوم حتی یغیروا مابانفسہم"۔ یہ آیت اس بات پر زور دیتی ہے کہ تبدیلی ضروری ہے، لیکن یہ اپنی اقدار اور اصولوں کو ترک کر کے نہیں بلکہ ان کے دائرے میں رہ کر کی جائے۔ اسی طرح رسول اکرم ﷺ نے مختلف تہذیبوں کے اچھے پہلو اپنانے کی ترغیب دی، لیکن دین کی روح کو ہمیشہ محفوظ رکھا۔

جدت پسندی کا مطلب بے راہ روی یا مغربی تقلید ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ حقیقی جدت وہی ہے جو انسانی ترقی، اخلاقیات، اور دین کے دائرے میں رہتے ہوئے معاشرے کو بہتر بنائے۔ اس مورد میں اجتہادی معیارات اور نظریات اس تصور کے عین مطابق ہیں، اور یہی ایک متوازن اور عملی رویہ ہے جو دین، ثقافت اور معاشرت کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔

جدت پسندی بڑی عمر میں قدامت پسندی میں بدل جاتی ہے؟!!

عمومی طور پر کئی عوامل اس بات پر اثر انداز ہوتے ہیں کہ آیا ایک جدت پسند شخص بڑی عمر میں قدامت پسند بن جاتا ہے یا نہیں۔ یہ تبدیلی مختلف نفسیاتی، سماجی اور فلسفیانہ پہلوؤں کی بنیاد پر وقوع پذیر ہوتی ہے۔ عمر کے ساتھ ذہنی رویوں میں تبدیلی آتی ہے، اور استحکام کی خواہش بڑھ جاتی ہے۔ جوانی میں انسان زیادہ جستجو کرنے والا اور خطرات مول لینے کا رجحان رکھتا ہے، لیکن بڑی عمر میں اس کی ترجیحات بدل جاتی ہیں، اور وہ زیادہ استحکام اور سکون کا خواہاں ہو جاتا ہے۔ یہ رجحان اکثر قدامت پسندی کی طرف مائل کرتا ہے کیونکہ یہ روایتی اور محفوظ اقدار پر زور دیتا ہے۔

زندگی کے تجربات بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ عمر کے ساتھ بڑھتے تجربات افراد کی سوچ میں تبدیلی کا باعث بنتے ہیں، اور کچھ لوگ اپنی جوانی کی غلطیوں کو دیکھ کر زیادہ محتاط ہو جاتے ہیں اور قدامت پسند رویہ اپنانے لگتے ہیں۔ بڑی عمر میں لوگ تبدیلیوں کو غیر یقینی اور غیر ضروری سمجھنے لگتے ہیں کیونکہ وہ اپنے موجودہ ماحول اور روایات سے زیادہ جُڑ جاتے ہیں۔

سماجی عوامل بھی اس تبدیلی میں شامل ہیں۔ بڑی عمر میں افراد خاندانی اور سماجی ذمہ داریوں کے تحت آ جاتے ہیں جو انہیں روایتی اقدار کی پاسداری کرنے پر مجبور کر سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر، اپنے بچوں کی تربیت یا خاندانی روایات کو برقرار رکھنے کا دباؤ ان کے رویے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ، معاشرہ عام طور پر بڑی عمر کے افراد سے روایتی اور مستحکم رویے کی توقع کرتا ہے، جو ان کی سوچ کو متاثر کر سکتی ہے۔

فلسفیانہ طور پر بھی بڑی عمر میں قدامت پسندی کی طرف رجحان بڑھتا ہے۔ قدامت پسندی ایک حد تک سکون فراہم کرتی ہے کیونکہ یہ انسان کو ماضی کی حکمت اور روایات پر بھروسہ کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ جوانی میں انسان اختراع اور آزادی کا خواہاں ہوتا ہے، لیکن بڑھتی عمر کے ساتھ وہ پرانے خیالات میں حکمت تلاش کرنے لگتا ہے۔ بڑی عمر میں انسان اکثر فلسفیانہ احتیاط کا رجحان اپناتا ہے اور نئی چیزوں کو قبول کرنے سے پہلے ان کے اثرات پر غور کرتا ہے۔

حیاتیاتی اور نفسیاتی تبدیلیاں بھی اہم ہیں۔ جوانی میں دماغ زیادہ لچکدار ہوتا ہے اور نئی سوچ یا تبدیلیوں کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، لیکن عمر بڑھنے کے ساتھ دماغ کی یہ لچک کم ہو جاتی ہے، اور انسان اپنی موجودہ سوچ پر قائم رہنے کو ترجیح دیتا ہے۔ کچھ لوگ بڑی عمر میں جدت پسندی سے تھک جاتے ہیں اور سکون کے لیے قدامت پسند رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ یہ تبدیلی ہر فرد کے لیے لازم نہیں۔ کچھ افراد بڑی عمر میں بھی جدت پسند رہتے ہیں، اور یہ ان کی شخصیت، فکری تربیت اور ماحول پر منحصر ہوتا ہے۔ وہ افراد جو تعلیمی، سائنسی یا فکری میدان میں سرگرم رہتے ہیں، عام طور پر بڑی عمر میں بھی جدت پسندی کے حامل ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ عمر بڑھنے کے ساتھ قدامت پسندی اور جدت پسندی کا امتزاج بھی اختیار کرتے ہیں، جہاں وہ بنیادی اقدار کو برقرار رکھتے ہیں لیکن نئے خیالات اور ٹیکنالوجی کو قبول کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

عمومی طور پر بڑی عمر میں قدامت پسندی کی طرف رجحان ایک عام رویہ ہے جو نفسیاتی، سماجی اور حیاتیاتی عوامل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ تاہم، یہ تبدیلی ہر فرد پر یکساں طور پر لاگو نہیں ہوتی، اور کسی فرد کی جدت یا قدامت پسندی کا انحصار اس کے ذاتی تجربات، تربیت اور شخصیت پر ہوتا ہے۔

زندگی ایک مسلسل سفر ہے، اور ہر عمر کا ایک مخصوص جمال اور کمال ہوتا ہے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بڑی عمر کو محض ایک عددی حقیقت سمجھ کر اس پر قابو پا لیتے ہیں۔ وہ اپنے بڑھاپے کو جسم کی کمزوری سے تعبیر کرنے کے بجائے روح کی تازگی کا مقام سمجھتے ہیں۔ ان کے بال اگرچہ سفید ہو چکے ہوتے ہیں اور چہرے پر وقت کی لکیریں نقش ہو چکی ہوتی ہیں، لیکن ان کا دل، دماغ اور عزم جوانی سے بھی زیادہ بیدار ہوتا ہے۔ وہ جدت پسند رہتے ہیں، سیکھنے اور سکھانے کا شوق رکھتے ہیں، نئے خیالات سے مانوس ہوتے ہیں، اور زندگی کو ایک امتحان اور نعمت کی طرح برتتے ہیں۔ ان کی یہ زندگی دراصل اس بات کا ثبوت ہے کہ عمر کبھی بھی کسی کے جذبے، جستجو اور حوصلے کو محدود نہیں کر سکتی۔

ان افراد کے جدت پسند رہنے کا سب سے بڑا راز یہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے ہر لمحے کو ایک موقع سمجھتے ہیں — سیکھنے کا، اثر چھوڑنے کا، کچھ بہتر کرنے کا۔ جب بچے بڑے ہو جاتے ہیں، جب دفتر سے ریٹائرمنٹ ہو جاتی ہے، تو کئی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اب ان کی ذمہ داریاں ختم ہو گئی ہیں، اب آرام کا وقت ہے، اب دنیا سے کٹ کر فقط گزران کرنا ہے۔ یہی سوچ رفتہ رفتہ ان کو سست، بے ہدف اور بیمار بنا دیتی ہے۔ جسم کا ہر حصہ جو کبھی متحرک تھا، اب بیکار

اور بوجھ لگنے لگتا ہے۔ دل کا تعلق صرف دوائیوں اور ڈاکٹروں سے رہ جاتا ہے۔ نتیجتاً وہ دوسروں پر انحصار کرنے لگتے ہیں، کسی کے سہارے چلتے ہیں، کسی کے مشورے پر جیتے ہیں، اور خود کو بے مقصد محسوس کرنے لگتے ہیں۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ اصل زندگی تو وہ ہوتی ہے جو کسی ہدف کے ساتھ گزاری جائے۔ جس دن انسان کا کوئی مقصد ختم ہوتا ہے، اسی دن اس کا اندرونی نظام ٹوٹنے لگتا ہے۔ انسان وہی ہے جو خواب رکھے، جو مسلسل کچھ نیا کرنے کی جستجو میں رہے، چاہے وہ عمر کے کسی بھی مرحلے میں کیوں نہ ہو۔ جو لوگ بڑی عمر میں بھی نئے علوم سیکھتے ہیں، مطالعہ جاری رکھتے ہیں، دوسروں کو سکھاتے ہیں، نئی مہارتیں اپناتے ہیں یا اپنے تجربات سے دنیا کو نفع پہنچاتے ہیں، وہی اصل میں زندگی کی روح کو تھامے رکھتے ہیں۔ ان کے چہرے پر جھریاں ضرور ہوتی ہیں، مگر ان کی آنکھوں میں چمک باقی ہوتی ہے۔ ان کے قدم شاید آہستہ ہوں، لیکن ان کے ارادے جوان ہوتے ہیں۔

ایسے افراد ہمیں یہ سبق دیتے ہیں کہ اگر ہدف باقی ہو، تو زندگی ہمیشہ متحرک رہتی ہے۔ ایک بامقصد انسان خواہ وہ بزرگ ہو یا جوان، اپنے ہر دن کو ایک مشن کی طرح جیتا ہے۔ وہ صبح کو بیدار ہونے کے بعد محض وقت گزارنے کے لیے نہیں، بلکہ کسی نئی جستجو کے ساتھ اٹھتا ہے۔ وہ خود کو دوسروں کا محتاج نہیں بننے دیتا، بلکہ خود دوسروں کے لیے باعثِ تقویت بن جاتا ہے۔

لہٰذا، جو افراد ریٹائرمنٹ کے بعد خود کو زندگی کی دوڑ سے الگ سمجھ کر گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہیں، انہیں بیدار ہونے کی ضرورت ہے۔ یہ عمر عمل سے کنارہ کش ہونے کی نہیں، بلکہ حکمت اور تجربے کو نئی نسل میں منتقل کرنے کی ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب آپ اپنی زندگی کے خلاصے کو علم، کردار اور خدمت کی صورت میں دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں۔ اپنے دل و دماغ کو جوان رکھیں، نئے خواب دیکھیں، نئی زبانیں سیکھیں، نئی کتابیں پڑھیں، چھوٹے سفر کریں، نوجوانوں کے ساتھ میل جول رکھیں، اور اپنی زندگی کا نیا مقصد بنائیں۔

زندگی کے ہر لمحے کا حساب اللہ کے ہاں ہے۔ لہٰذا جو وقت بچا ہے، اسے بے مقصد نہ جانے دیں۔ آپ کی زندگی نہ صرف آپ کے لیے بلکہ دوسروں کے لیے بھی ایک مشعل راہ بن سکتی ہے۔ وہ لوگ جو بڑھاپے کو موت کا انتظار سمجھتے ہیں، وہ دراصل خود کو موت کے حوالے کر چکے ہوتے ہیں، جبکہ جو لوگ بڑھاپے کو ایک نئی بیداری کا نام دیتے ہیں، وہ جیتے ہیں، اور دوسروں کو جینا سکھاتے ہیں۔ تو زندہ رہیے، متحرک رہیے، اور مقصد کے ساتھ جیے، تاکہ بڑھاپا آپ کے لیے بوجھ نہ بنے، بلکہ ایک ایسی بلند چوٹی ہو، جس پر کھڑے ہو کر آپ دوسروں کو زندگی کا اصل مفہوم دکھا سکیں۔

جلد بازی محرومی کا سبب

فوری نتائج کی خواہش انسان کے اندر ایک فطری جذبہ ہے، خاص طور پر اس تیز رفتار دنیا میں جہاں ہر چیز فوراً دستیاب ہو جاتی ہے۔ ہم اکثر اپنی خواہشات کو فوری طور پر پورا کرنے کے لئے طویل مدتی فائدے کی قیمت پر چھوٹے یا وقتی فوائد کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہ عادت نہ صرف ہماری ذاتی ترقی کو روک دیتی ہے بلکہ ہمارے اخلاقی معیار اور فیصلوں میں بھی غلطی کا باعث بنتی ہے۔ جب ہم فوری نتائج کی خواہش میں مبتلا ہو جاتے ہیں، تو ہم اپنی محنت اور صبر کے بغیر کامیابی کے خواب دیکھتے ہیں، جس کے نتیجے میں کبھی کبھار ہمیں نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

اسلام میں صبر کی بڑی اہمیت ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا" : اے ایمان والو، صبر کرو، اور صبر کرنے والوں کی مدد کرو "(سورہ آل عمران 3:200)۔ اس آیت میں صبر کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے اور ہمیں یہ سکھایا گیا ہے کہ کامیابی ہمیشہ فوراً نہیں ملتی، بلکہ اس کے لیے صبر، استقامت اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ فوری فوائد کا پیچھا کرنے کی بجائے ہمیں اپنی کوششوں کو اللہ کی رضا اور لمبے وقت کے فوائد کے لیے مرکوز کرنا چاہیے۔

فوری نتائج کی خواہش کے تحت لوگ اکثر چھوٹے فائدے کے لیے بڑے نقصان کی قیمت ادا کرتے ہیں۔ جیسے کہ کسی کا قرض لینے کا فیصلہ تاکہ وہ فوری طور پر کسی چیز کا فائدہ اٹھا سکے، لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ اس قرض کا بوجھ آخر کار ان کے مالی حالات کو مشکلات میں ڈال

سکتا ہے۔ اسی طرح، اگر انسان محنت کے بغیر کسی کامیابی کی امید رکھتا ہے، تو اس کے پاس یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ کامیابی آسانی سے حاصل ہو جائے گی، جو اکثر حقیقت سے بہت دور ہوتی ہے۔

اسلامی تعلیمات میں ہمیں یہ سکھایا گیا ہے کہ نتائج اللہ کی مرضی اور ہماری محنت کے مطابق ہوتے ہیں، اور یہ کبھی بھی فوری نہیں ہوتے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا" : ہر چیز کا وقت ہوتا ہے، اور کوئی بھی کامیابی محنت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی"۔ اس بات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمیں ہر کام کے نتائج کے لیے صبر کا مظاہرہ کرنا ضروری ہے اور ہمیں فوری نتائج کی خواہش کو اپنی زندگی میں حائل نہ ہونے دینا چاہیے۔

حکمت سے فیصلے کرنا اور صبر کرنا سیکھنا انسان کے لیے ایک بہت بڑا امتحان ہوتا ہے۔ جب ہم فوری فائدے کے بجائے طویل مدتی فائدے کو ترجیح دیتے ہیں، تو ہم اپنے فیصلوں میں زیادہ بصیرت اور عقلمندی دکھاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم خود کو سخت محنت یا مشکلات میں مبتلا کریں، بلکہ ہم اپنے انتخاب میں سمجھداری اپناتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ ہمارے فیصلے کا اثر ہمارے مستقبل پر کیا پڑے گا۔

یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنی خواہشات اور فوری اطمینان کے درمیان توازن قائم کریں۔ انسان کے اندر خواہشات کو پورا کرنے کی فطری صلاحیت ہے، لیکن اس میں توازن اور حکمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب ہم فوری خوشی کے بدلے مستقل سکون اور کامیابی کو ترجیح دیتے ہیں، تو ہم اپنی زندگی میں ایک پائیدار سکون اور ترقی حاصل کر پاتے ہیں۔

اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ اس دنیا کی خوشیاں عارضی ہیں، اور اصل سکون اللہ کی رضا میں ہے۔ اس لیے ہم جب بھی اپنی خواہشات کے پیچھے جائیں، تو ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ہمارا

اصل مقصد کیا ہے۔ فوری خوشی کے لیے طویل مدتی سکون کا سودا نہ کریں۔ صبر اور محنت کے ذریعے جو کچھ حاصل ہوتا ہے، وہ نہ صرف ہمارے لیے فائدہ مند ہوتا ہے بلکہ اللہ کی رضا کا سبب بھی بنتا ہے۔

اس طرح، فوری نتائج کی خواہش سے بچنے اور حکمت و صبر کے ساتھ فیصلے کرنے سے ہم اپنے طویل مدتی مقصد کو حاصل کرنے کے قریب پہنچ سکتے ہیں۔

فوری نتائج کی خواہش انسان کی نفسیات میں ایک ایسی قوت بن چکی ہے جو اکثر ہمیں صبر اور محنت کی قیمت پر فوری تسکین کی طرف مائل کرتی ہے۔ ہم جتنا تیز اور فوری کامیابی کی امید رکھتے ہیں، اتنا ہی طویل مدتی فوائد کے بارے میں ہماری نظر کمزور ہوتی جاتی ہے۔ اس نفسیاتی رجحان کا تعلق ہماری موجودہ معاشرتی فضا سے بھی ہے، جہاں ہر چیز فوراً دستیاب ہوتی ہے—خواہ وہ خوراک ہو، معلومات ہو یا تفریح۔ اس فطری رجحان کو اگر قابو نہ کیا جائے تو یہ ہماری ذاتی اور پیشہ ورانہ ترقی میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔

اسلام میں اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ انسان اپنے عمل کے نتائج کو اللہ کی رضا کے ساتھ جوڑے، نہ کہ صرف فوری تسکین یا دنیاوی فوائد کے پیچھے دوڑے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا" :جو شخص صبر کرتا ہے، اللہ اس کے صبر کو بڑھا دیتا ہے، اور جو شخص اپنے نفس کو سنبھال کر اللہ کی رضا کے لیے صبر کرتا ہے، وہ بالآخر کامیاب ہوتا ہے"۔ اس حدیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ صبر ایک ایسا عمل ہے جو نہ صرف انسان کو دنیا میں سکون فراہم کرتا ہے بلکہ آخرت میں بھی کامیابی کی ضمانت دیتا ہے۔

فوری نتائج کے خواہشمند لوگ اکثر ایسا کرتے ہیں کہ وہ ان چیزوں کے پیچھے دوڑتے ہیں جو بظاہر ان کے لیے فوری فائدہ پہنچاتی ہیں، لیکن یہ فائدے اکثر عارضی ہوتے ہیں اور دیرپا

نتائج نہیں دیتے۔ مثال کے طور پر، کسی شخص کا پیسہ جلدی کمانے کی کوشش کرنا یا معاشرتی شہرت حاصل کرنے کے لیے کم وقت میں زیادہ کام کرنے کی کوشش کرنا، اس کے نتیجے میں وہ اپنے اخلاقی اصولوں یا زندگی کے طویل مدتی اہداف کو نظر انداز کرتا ہے۔ یہ فوری فائدہ اور تسکین اگرچہ اسے وقتی سکون دیتی ہے، مگر طویل مدت میں اس کے ذہنی سکون اور ترقی پر منفی اثرات مرتب کرتی ہے۔

اسلامی تعلیمات میں صبر کو نہ صرف اخلاقی حسن بلکہ ایک عملی ضرورت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا" : صبر کامیابی کا آغاز ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی بھی کام میں صبر دکھاتا ہے، وہ نہ صرف اس کام کو بہتر طریقے سے مکمل کرتا ہے بلکہ اس کے لیے اللہ کی رضا بھی حاصل کرتا ہے۔ زندگی میں جب ہم فوری نتائج کی خواہش کو ترک کرتے ہیں اور اپنے عمل کے نتیجے میں اللہ کی رضا کی تلاش کرتے ہیں، تو ہم دراصل اپنی زندگی کو بہتر بنانے کی جانب ایک قدم اور بڑھا لیتے ہیں۔

اگر ہم اس بات کو سمجھیں کہ ہر کام کا ایک وقت اور طریقہ ہوتا ہے، تو ہم اپنی زندگی کے فیصلوں میں زیادہ حکمت اختیار کر سکتے ہیں۔ صبر کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے عمل کا نتیجہ اللہ پر چھوڑ دیں اور اپنے مقصد کے لیے مسلسل محنت کرتے رہیں، چاہے نتائج فوری نہ آئیں۔ اس کے برعکس، فوری نتائج کی خواہش اکثر ہمیں جلد بازی اور عجلت کا شکار کرتی ہے، جو ہمارے کام کی نوعیت اور معیار پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔

ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ ہم وقتی تسکین کے بدلے میں اپنی فطری صلاحیتوں اور اہداف پر توجہ مرکوز کریں۔ جب ہم ہر فیصلے کے پیچھے حکمت اور صبر کو شامل کرتے ہیں، تو ہم اپنی ذاتی اور پیشہ ورانہ ترقی کے عمل کو بھی بہتر بناتے ہیں۔ اس کے ذریعے ہم اپنی توانائی کو صحیح

سمت میں استعمال کرتے ہیں، نہ کہ صرف فوری فائدے کی طرف۔ صبر ہمیں سکون اور استقامت فراہم کرتا ہے، اور اسی استقامت کے ذریعے ہم زندگی میں بہتر نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔

آخری بات یہ ہے کہ صبر کا اصل مقصد یہ نہیں ہوتا کہ انسان خود کو مشکلات میں ڈالتا رہے، بلکہ یہ کہ وہ اپنے اندر اتنی قوت پیدا کرے کہ وہ مشکلات کو برداشت کر سکے اور اپنی منزل کی طرف بڑھتا جائے۔ جب ہم فوری نتائج کی خواہش کو ترک کر کے صبر کا دامن تھام لیتے ہیں، تو ہم نہ صرف دنیا میں سکون حاصل کرتے ہیں بلکہ آخرت میں بھی اپنی کامیابی کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

چھوٹے مسائل سے پریشان نہ ہوں

اضطراب کی زیادتی یا غیر ضروری پریشانی، انسان کی ذہنی سکون کو چھین کر اس کی زندگی کو مسلسل کشمکش میں مبتلا کر دیتی ہے۔ بہت سے افراد چھوٹے مسائل پر زیادہ پریشان ہو جاتے ہیں، اور یہ اضطراب نہ صرف ان کی ذہنی حالت کو متاثر کرتا ہے بلکہ ان کی جسمانی صحت بھی خراب کرتا ہے۔ جب ہم کسی مسئلے کو زیادہ اہمیت دے کر اس کے بارے میں مسلسل فکر کرتے ہیں، تو ہم اپنے آپ کو ایک ذہنی قید میں ڈال لیتے ہیں اور چھوٹے مسائل کو بڑی مشکلات میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس حالت میں انسان کی توانائی اور وقت ضائع ہوتا ہے، جبکہ وہ اپنی زندگی کی اصل خوشیوں اور کامیابیوں کو نظر انداز کرتا ہے۔

اسلام میں انسان کو ہمیشہ مثبت سوچ اور سکون کی طرف مائل کیا گیا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا" : اللہ کسی نفس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا "(سورہ البقرہ 2:286)، اس آیت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جو مسائل یا مشکلات ہمیں درپیش آتی ہیں، وہ ہماری طاقت سے زیادہ نہیں ہوتے، اور ہمیں ان پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ نے ہمیں اس قدر طاقت دی ہے کہ ہم ان مسائل کو حکمت اور صبر سے حل کر سکیں۔ جب ہم اس حقیقت کو سمجھتے ہیں، تو ہم اضطراب اور پریشانی کے بغیر اپنی زندگی گزار سکتے ہیں۔

اضطراب کی زیادتی عام طور پر ہمارے ذہنی طرزِ فکر سے جنم لیتی ہے۔ اگر ہم کسی چھوٹی سی پریشانی کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی مشکل سمجھیں، تو ہم اس کے بارے میں مسلسل فکر کرتے رہیں گے، جو ہمارے ذہنی سکون کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اس کے بجائے، ہمیں اپنی سوچ کو منظم اور متوازن رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ ہم مسائل کو حقیقت کے طور پر دیکھیں اور ان کے حل کے بارے میں مثبت اور عملی طور پر سوچیں۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا" :جو شخص اپنے دل میں سکون رکھتا ہے، وہ ہر پریشانی میں سکون پاتا ہے"۔ اس حدیث سے یہ سبق ملتا ہے کہ اگر ہم اپنے اندر سکون پیدا کریں، تو ہم زندگی کے مسائل کو بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں اور ان سے بہتر طور پر نمٹ سکتے ہیں۔

مثبت سوچ اور سکون حاصل کرنے کی مشقیں بھی اہم ہیں۔ جب ہم روزانہ اپنے ذہن کو سکون دینے والی مشقیں کرتے ہیں، جیسے کہ ذکر، مراقبہ، یا دعاؤں کی تلاوت، تو ہم اپنے ذہن کو زیادہ سکون دینے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ یہ عمل نہ صرف ہمیں اللہ کی قربت محسوس کراتا ہے، بلکہ ہماری ذہنی حالت کو بھی بہتر بناتا ہے اور ہمیں زندگی کے مسائل پر قابو پانے کے لیے قوت فراہم کرتا ہے۔ نماز ایک ایسی عبادت ہے جو انسان کو سکون اور اطمینان عطا کرتی ہے، کیونکہ یہ انسان کو اللہ کے ساتھ رابطہ قائم کرنے اور اس کی رضا کی تلاش میں مدد دیتی ہے۔

اضطراب کی زیادتی کی ایک اور وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ہم مستقبل کے بارے میں زیادہ فکر مند رہتے ہیں۔ ہم جو کچھ نہیں جانتے یا جو ہم نے ابھی تک حاصل نہیں کیا، اس کے بارے میں

مسلسل فکر کرنے لگتے ہیں، جو ہمارے ذہن کو تھکا دیتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہم مستقبل کو اپنے قابو میں نہیں لا سکتے، اور اس کے بارے میں زیادہ فکر کرنا ہمیں موجودہ وقت کے اہم مواقع سے غافل کر سکتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا" : آج کے کام کو کل کے لیے نہ چھوڑو، کیونکہ کل تمہاری سوچوں کا نتیجہ ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم جو آج کرتے ہیں، وہ کل کی صورتحال کو بہتر بنا سکتا ہے، اور ہمیں اپنی زندگی کے ہر لمحے کو مثبت طریقے سے گزارنا چاہیے۔

جب ہم چھوٹے مسائل پر غیر ضروری پریشانیوں میں مبتلا ہوتے ہیں، تو ہم اپنی خوشیوں کو خود سے چھین لیتے ہیں۔ اسلام میں ہمیں سکون اور اطمینان حاصل کرنے کے طریقے سکھائے گئے ہیں۔ اگر ہم اپنی زندگی کو اللہ کی رضا کے مطابق گزاریں اور اپنے فیصلوں کو حکمت سے کریں، تو ہم اضطراب اور پریشانی کے بغیر زندگی کے چیلنجز کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس طرح، ہم اپنی زندگی کو زیادہ خوشگوار، سکون بخش اور کامیاب بنا سکتے ہیں۔

اضطراب کی زیادتی یا غیر ضروری پریشانی زندگی کے اندرونی سکون کو مکمل طور پر متاثر کر سکتی ہے۔ جب انسان کسی چھوٹے سے مسئلے کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا چیلنج سمجھنے لگتا ہے، تو وہ اپنی توانائی اور وقت ضائع کرنے لگتا ہے، اور اس کے ذہن میں مسلسل بے سکونی اور بے اطمینانی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اضطراب کے بڑھنے سے انسان کی سوچ میں تنگی آ جاتی ہے، اور وہ اپنے فیصلوں میں جلد بازی کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ، یہ جذباتی اور جسمانی مسائل جیسے نیند کی کمی، دل کی دھڑکن کا تیز ہونا، اور سر درد وغیرہ کا سبب بھی بن سکتا ہے۔

اس طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا زندگی کی خوشیوں کو محدود کر دیتا ہے اور انسان کے سکون کو متاثر کرتا ہے۔

اسلامی تعلیمات میں اضطراب کو کم کرنے کے لیے کئی طریقے سکھائے گئے ہیں۔ ایک اہم نقطہ یہ ہے کہ انسان اللہ پر بھروسہ کرے اور اپنی پریشانیوں کو اللہ کی طرف رجوع کر کے اس کے سپرد کرے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا" :اور جب تم پر کوئی تکلیف آئے، تو اللہ ہی کو یاد کرو "(سورہ الزمر 39:10)۔ اس آیت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جب انسان مشکل حالات سے گزر رہا ہو، تو اللہ کی یاد میں سکون ملتا ہے۔ اللہ کا ذکر اور اس کی رضا کے لیے دعا کرنا انسان کو اس کی پریشانیوں سے نکال کر ذہنی سکون کا احساس دلاتا ہے۔

اضطراب اور پریشانی کی زیادتی کا ایک اور اہم سبب انسان کا اپنے مسائل کے بارے میں زیادہ سوچنا ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مسائل کو بڑھا چڑھا کر دیکھنے لگتا ہے اور حل کے بجائے پریشانیوں میں مزید غرق ہو جاتا ہے۔ اس میں ایک بہت بڑی حکمت یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو وقتاً فوقتاً اپنے مسائل سے دور کر کے راحت کے لمحات گزارے۔ ایسا کرنے سے دماغ کی تھکن کم ہوتی ہے اور انسان ذہنی سکون اور توازن حاصل کرتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا" :جو شخص اپنا ذہن سکونت میں رکھتا ہے، وہ زندگی کے چیلنجز کو بہتر انداز میں سمجھ سکتا ہے"۔ اس قول کا مقصد یہ ہے کہ اگر ہم اپنی ذہنی حالت کو پرسکون رکھیں تو ہم کسی بھی مسئلے کا بہتر حل تلاش کر سکتے ہیں۔

ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ اضطراب کی زیادتی کا تعلق ہمارے خیالات اور توقعات سے بھی ہوتا ہے۔ ہم اکثر اپنے حالات یا نتائج کے بارے میں زیادہ منفی سوچتے ہیں، اور اس سے ہماری زندگی میں بے چینی اور پریشانی پیدا ہوتی ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمای ا" : اللہ کی طرف سے رحمت کے سائے میں رہو، تم پر کوئی مشکل نہیں آئے گی "(سورہ التوبہ 9:51)، جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ اللہ کی طرف سے ہمارے لیے آسانی اور سکون ہے، بشرطیکہ ہم اپنی سوچ میں مثبتیت پیدا کریں اور اللہ پر بھروسہ کریں۔ جب انسان اللہ پر اعتماد کرتا ہے اور اس کی تقدیر پر راضی ہوتا ہے، تو اس کے دل میں سکون آجاتا ہے۔

اضطراب کی زیادتی کے حل کے لیے ایک اور مفید طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی میں شکرگزاری کی عادت ڈالے۔ شکرگزاری کا عمل انسان کو یہ احساس دلاتا ہے کہ اس کے پاس کتنی نعمتیں ہیں اور ان نعمتوں کی قدر کرنا چاہیے۔ اس سے انسان کو اپنی موجودہ حالت میں سکون اور خوشی ملتی ہے، اور وہ چھوٹے مسائل کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا" : جو شخص اللہ کے دیے ہوئے پر شکرگزار ہوتا ہے، اس کی زندگی میں سکون آتا ہے"۔

اضطراب کا مقابلہ کرنے کے لیے انسان کو اپنی زندگی میں توازن اور سکون کی حالت پیدا کرنی چاہیے۔ روزانہ کی عبادات، ذکر، دعائیں اور مراقبہ انسان کے ذہن کو پرسکون رکھتے ہیں اور اسے مشکلات کا بہتر مقابلہ کرنے کے لیے تیار کرتے ہیں۔ اسی طرح، اپنی روزمرہ کی

زندگی میں چھوٹے چھوٹے لمحے گزارنا، جیسے کسی دوست سے بات کرنا، کتاب پڑھنا، یا قدرتی مناظر کا لطف اٹھانا، انسان کو ذہنی سکون دینے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

اسلام میں اضطراب کو کم کرنے کے لیے ایک اور اہم قدم یہ ہے کہ انسان اپنے گزرے ہوئے حالات یا مستقبل کے بارے میں فکر کرنے کی بجائے موجودہ لمحے میں خوش رہنے کی کوشش کرے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا" :جو شخص اپنے آج کو غم میں گزرنے دیتا ہے، وہ کل کا غم بھی اپنے ساتھ لے آتا ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان جب ماضی یا مستقبل کی فکر میں گرفتار رہتا ہے، تو وہ اپنے موجودہ وقت کو ضائع کرتا ہے، جو کہ اس کے ذہنی سکون کے لیے نقصان دہ ہے۔

اس طرح، اضطراب کی زیادتی کو کم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے ذہن کو پرسکون کریں، اللہ کی رضا اور اپنے عمل پر بھروسہ کریں، اور چھوٹے مسائل کو اس قدر نہ بڑھالیں کہ وہ ہمارے ذہن کی سکونت کو ختم کر دیں۔

حالت جنگ میں مسلمانوں کیلئے لائحہ عمل

قرآن کریم کی روشنی میں حالت جنگ کے دوران مسلمانوں میں کئی قسم کے تفرقے پیدا ہو سکتے ہیں، جن کی جڑ بنیادی طور پر ایمان کی کمزوری، دنیاوی خواہشات، اور منافقت میں چھپی ہوتی ہے۔ سورہ احزاب میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ حالت جنگ میں کچھ لوگ خوف اور اضطراب کی وجہ سے اللہ کے وعدوں پر شک کرنے لگتے ہیں، کچھ میدان سے پیچھے ہٹنے کے بہانے تلاش کرتے ہیں، اور کچھ دوسرے مسلمانوں کو بھی کمزور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ تفرقے انفرادی اور اجتماعی سطح پر مسلمانوں کی کمزوری کا باعث بنتے ہیں اور دشمن کو موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ ان کی صفوں میں رخنہ ڈال سکے۔

منافقین کی ایک واضح نشانی یہ ہے کہ وہ جنگ کے وقت بہانے تراشتے ہیں، جیسا کہ وہ اپنے گھروں کو غیر محفوظ ظاہر کرتے ہیں اور رسول اکرم ﷺ سے اجازت مانگتے ہیں کہ وہ میدان جنگ سے پیچھے ہٹ جائیں۔ ان کا اصل مقصد اپنے آپ کو بچانا اور اللہ کے راستے میں قربانی دینے سے گریز کرنا ہوتا ہے۔ اسی طرح کچھ لوگ دوسروں کو بھی خوفزدہ کرتے ہیں اور یہ باور کراتے ہیں کہ دشمن ناقابل شکست ہے، جبکہ وہ خود جنگ میں شریک ہونے سے گریز کرتے ہیں اور صرف مال غنیمت کے لالچ میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ سب اعمال مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرتے ہیں اور انہیں یکجہتی سے دور کر دیتے ہیں۔

سچے مسلمانوں کے لیے قرآن مجید میں واضح ہدایات دی گئی ہیں کہ وہ حالت جنگ میں اللہ پر کامل توکل رکھیں اور اس کے وعدوں کو سچا مانیں۔ جنگ کے دوران خوف اور گھبراہٹ ایک فطری کیفیت ہو سکتی ہے، لیکن اسے ایمان کی کمزوری میں تبدیل ہونے سے بچانا ضروری ہے۔سچے مومن نہ صرف خود میدان میں ثابت قدم رہتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی حوصلہ دیتے ہیں۔ وہ اپنی صفوں میں اتحاد کو برقرار رکھتے ہیں اور دشمن کے پروپیگنڈے سے متاثر نہیں ہوتے۔ انہیں منافقین اور کمزور ایمان والے لوگوں کی باتوں سے ہوشیار رہنا چاہیے، جو جنگ کے دوران مسلمانوں کی قوت ارادی کو کمزور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔
سچے مومنوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ خوفزدہ نہ ہوں اور اپنی نظریں اللہ کی رحمت اور مدد پر رکھیں۔ انہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ دنیاوی نقصان یا موت ان کے ایمان کی آزمائش کا حصہ ہیں اور ان کا اصل انعام آخرت میں ہے۔ انہیں بے مقصد باتوں اور دنیاوی مفادات کی پیروی سے گریز کرنا چاہیے، کیونکہ یہ انہیں مقصد سے بھٹکا سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ، انہیں اپنے عہد کی پاسداری کرنی چاہیے اور اللہ کے راستے میں پیچھے ہٹنے کا کوئی بہانہ تلاش نہیں کرنا چاہیے۔
قرآن کریم ہمیں سکھاتا ہے کہ حالت جنگ میں ہوشیار رہنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم منافقین کے پروپیگنڈے کو پہچانیں، اپنی صفوں میں اتحاد کو یقینی بنائیں، اور اپنے ایمان کو مضبوط رکھیں۔ ہمیں یہ یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور وہ اپنے مومن بندوں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا۔ دشمن کی چالوں سے خبردار رہنا اور اپنے اندرونی تفرقے سے بچنا ہی مسلمانوں کی کامیابی کی کنجی ہے۔

خاندانی نظام کے خلاف سامراجی سازشیں

سامراجی طاقتوں نے سرمایہ دارانہ نظام کو برقرار رکھنے اور اپنے منافع کو زیادہ سے زیادہ کرنے کے لیے ایسے سماجی اور ثقافتی منصوبے وضع کیے جنہوں نے انسانی معاشرت کو گہرائی سے متاثر کیا۔ ان طاقتوں نے مغربی ثقافت میں انفرادیت پسندی(individualism) کو فروغ دیا، جس نے لوگوں کو اجتماعیت اور مشترکہ اقدار سے دور کر دیا۔ اس کے نتیجے میں، خاندانی نظام جیسی بنیادی سماجی اکائی کو نقصان پہنچا۔

خاندانی نظام کے کمزور ہونے کا مطلب یہ تھا کہ انسان ایک دوسرے پر انحصار کرنے کے بجائے خود پرستی اور خودمختاری کی طرف مائل ہو جائیں۔ ایسے افراد جو مضبوط خاندانی رشتوں سے کٹے ہوں، زیادہ آسانی سے سرمایہ دارانہ نظام کے صارفین بن سکتے ہیں، کیونکہ وہ اپنی ضروریات اور مسائل کو حل کرنے کے لیے خود کفالت کی بجائے مارکیٹ پر انحصار کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح، سرمایہ دارانہ معیشت کو انفرادیت پسند صارفین سے فائدہ پہنچتا ہے، کیونکہ یہ لوگ زیادہ خرچ کرتے ہیں اور سماجی ڈھانچے کی حمایت کے بغیر زندگی گزارتے ہیں۔

اس کے علاوہ، سامراجی منصوبہ بندی نے انسانی تعلقات کو مزید کمزور کرنے کے لیے ایسی ثقافتی روایات کو فروغ دیا، جن میں خواتین کو خواتین کے ساتھ اور مردوں کو مردوں کے

ساتھ شادی کرنے کی ترغیب دی گئی۔ اس حکمت عملی کا ایک مقصد نسل انسانی کے فروغ کو روکنا تھا تاکہ آبادی کم ہو اور سرمایہ داروں کے وسائل پر دباؤ کم پڑے۔ کم آبادی کا مطلب ہے کہ سرمایہ داروں کے لیے منافع کے ذرائع اور وسائل پر زیادہ کنٹرول حاصل کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

اسی تناظر میں، معاشرتی دوریوں کو بڑھانے کے لیے ایسی اقدار اور رجحانات پیدا کیے گئے جنہوں نے افراد کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا۔ اس کے نتیجے میں معاشرتی تعلقات کمزور پڑ گئے اور اجتماعیت، جو ایک مضبوط اور پائیدار معاشرے کی بنیاد ہوتی ہے، بکھر گئی۔ جب افراد کے درمیان تعلقات ٹوٹتے ہیں تو وہ نہ صرف ایک دوسرے کے مسائل حل کرنے سے قاصر رہتے ہیں بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کے گہرے جال میں پھنس جاتے ہیں، جہاں وہ ذاتی خوشی اور کامیابی کے نام پر صارفیت کے غلام بن جاتے ہیں۔

یہ سب اقدامات ایک منظم منصوبے کا حصہ ہیں، جن کا مقصد انسانوں کو اپنے حقیقی سماجی اور روحانی تعلقات سے کاٹ کر انہیں سرمایہ دارانہ نظام کی مشینری کا ایک چھوٹا سا پرزہ بنانا ہے۔ اس طرح، اجتماعیت کو ختم کر کے انسانوں کو انفرادیت اور صارفیت کے دائرے میں قید کر دیا گیا ہے۔

سامراجی طاقتوں نے خاندانی نظام کی تباہی کو اپنے سیاسی اور معاشی مفادات کی تکمیل کے لیے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے۔ خاندانی نظام معاشرتی اجتماعیت کی بنیاد ہوتا ہے، جو باہمی تعاون، اعتماد، اور اجتماعی ترقی کو فروغ دیتا ہے۔ ان طاقتوں کا مقصد اس مضبوط

ڈھانچے کو کمزور کر کے افراد کو ایک دوسرے سے الگ کرنا ہے تاکہ وہ تنہائی اور عدم تحفظ کا شکار ہو جائیں۔ جب لوگ اپنے مسائل کا حل خاندانی یا معاشرتی سطح پر تلاش کرنے کے بجائے مارکیٹ یا حکومت پر انحصار کرنے لگتے ہیں، تو یہ سرمایہ دارانہ نظام کے لیے سازگار ماحول فراہم کرتا ہے۔

خاندانی نظام کی تباہی کے ذریعے سامراجی طاقتیں صارفیت کو فروغ دیتی ہیں۔ جب خاندانی اکائی کمزور ہو جاتی ہے، تو افراد اپنی ضروریات کے لیے مشترکہ وسائل پر انحصار کرنے کے بجائے انفرادی طور پر زیادہ خرچ کرنے لگتے ہیں۔ اس کا فائدہ سرمایہ دارانہ معیشت کو ہوتا ہے، کیونکہ الگ الگ زندگی گزارنے والے افراد کو زیادہ اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے، جیسے علیحدہ گھروں، گاڑیوں، اور دیگر ذاتی سامان کی، جو مارکیٹ کے منافع کو بڑھاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ، خاندانی نظام کے کمزور ہونے سے نسل انسانی کے فروغ پر بھی منفی اثر پڑتا ہے۔ شادی اور خاندان کے تصور کو کمزور کرنے سے شادی شدہ زندگی کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے، اور غیر فطری تعلقات کو فروغ دیا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں شرح پیدائش کم ہو جاتی ہے۔ یہ کم آبادی وسائل پر زیادہ کنٹرول حاصل کرنے میں مدد دیتی ہے، اور سرمایہ دارانہ نظام کے لیے سودمند ثابت ہوتی ہے۔

سامراجی طاقتیں اپنی ثقافتی بالادستی کے لیے خاندانی نظام کو ایک رکاوٹ کے طور پر دیکھتی ہیں۔ وہ میڈیا، تعلیم، اور تفریح کے ذریعے انفرادیت پسندی، آزادی، اور خودمختاری کو بڑھاوا دیتی ہیں، جبکہ روایتی اقدار کو قدامت پسند یا پسماندہ ظاہر کرتی ہیں۔ مغربی طرز

زندگی کو کامیابی اور ترقی کی علامت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، اور خاندانی نظام کو اس کے برعکس دکھا کر اس سے دوری پیدا کی جاتی ہے۔ اس مقصد کے لیے خواتین اور مردوں کے روایتی کرداروں کو مسخ کیا جاتا ہے۔ خواتین کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ ان کی آزادی خاندانی زندگی سے دور رہنے میں ہے، اور مردوں کو ان کے روایتی فرائض سے غافل کیا جاتا ہے، جس سے خاندان کی بنیادی اکائی کمزور ہو جاتی ہے۔

ان طاقتوں نے خاندانی نظام کو تباہ کرنے کے لیے مختلف ہتھکنڈے اپنائے ہیں۔ میڈیا کے ذریعے خاندانی نظام کے خلاف پروپیگنڈا کیا جاتا ہے، انفرادیت کو بڑھاوا دیا جاتا ہے، اور آزادی کے نام پر روایتی اقدار کو پسماندہ ظاہر کیا جاتا ہے۔ تعلیمی نصاب میں خاندانی نظام کی اہمیت کو کم کیا جاتا ہے اور مغربی ثقافت کو پروان چڑھایا جاتا ہے۔ قانون سازی کے ذریعے غیر فطری تعلقات کو قانونی حیثیت دی جاتی ہے، جس سے روایتی شادی اور خاندان کے تصور کو چیلنج کیا جاتا ہے۔ اشتہارات، فلموں، اور ڈراموں کے ذریعے صارفیت، تنہائی، اور آزادی کو خوبصورت انداز میں پیش کر کے ان خیالات کو ذہنوں میں پختہ کیا جاتا ہے۔

سامراجی طاقتوں کی ان سازشوں کے خلاف مؤثر اقدام کے لیے ضروری ہے کہ خاندانی نظام کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے، اسلامی تعلیمات کو بنیاد بنایا جائے، اور معاشرتی اجتماعیت کو فروغ دینے کے لیے عملی اقدامات کیے جائیں۔ خاندانی اور سماجی تعلقات کو مضبوط بنا کر ہی ان سازشوں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

ان سازشوں سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے طرز زندگی کو اسلامی اصولوں اور اجتماعی اقدار پر قائم کرے۔ اسلام نے فرد اور معاشرے دونوں کی اصلاح کے لیے ایک مکمل نظام فراہم کیا ہے، جو انفرادیت اور اجتماعیت کے درمیان توازن پیدا کرتا ہے۔ قرآن وحدیث کے احکامات کی روشنی میں خاندانی نظام کی مضبوطی اور سماجی تعلقات کی بہتری پر توجہ دینا ہماری اولین ذمہ داری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک اجتماعی زندگی گزارنے کے لیے پیدا کیا ہے، جس کی بنیاد محبت، رحمت، اور تعاون پر ہے۔ ان اصولوں کو عملی زندگی کا حصہ بنا کر انسان اپنی اجتماعی ذمہ داریوں کو بہتر طریقے سے نبھا سکتا ہے۔

خاندانی نظام کی بحالی کے لیے والدین اور بچوں کے درمیان محبت اور اعتماد کو فروغ دینا ضروری ہے۔ خاندان کے افراد کے درمیان تعلقات مضبوط کرنے کے لیے مشترکہ عبادات، خاندانی مشورے، اور اسلامی روایات کی پاسداری اہم ہے۔ شادی اور تعلقات میں اسلامی تعلیمات کی پابندی کر کے نسل انسانی کی پاکیزہ اور فطری بقا کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی معاشرتی اجتماعیت کو فروغ دینے کی ضرورت ہے تاکہ افراد ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھیں اور ان کے حل میں تعاون کریں۔ کمیونٹی کی سطح پر فعال شرکت، مشترکہ عبادات جیسے نمازِ جمعہ، اور سماجی خدمات اس مقصد میں مددگار ہو سکتی ہیں۔

صارفیت کے جال سے بچنے کے لیے سادگی، قناعت، اور وسائل کے بہتر استعمال کو زندگی کا حصہ بنانا ضروری ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام فضول خرچی اور بے مقصد خریداری کو فروغ دیتا

ہے، جو اسلامی اصولوں کے خلاف ہے۔ قرآن مجید میں اسراف کی مذمت کی گئی ہے، اور قناعت کو اپنانے سے انسان اپنی معیشت کو مضبوط اور خودمختار بنا سکتا ہے۔ بچوں اور نوجوانوں کو اس بات کا شعور دینا بھی ضروری ہے کہ وہ محض صارف نہیں بلکہ اللہ کے بندے ہیں، جنہیں دنیا میں ایک مقصد کے تحت بھیجا گیا ہے۔ تعلیمی نظام میں اسلامی اخلاقیات اور تربیت کو شامل کرکے انہیں ان سازشوں سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔

میڈیا اور مغربی ثقافت کے اثرات سے بچنے کے لیے اسلامی میڈیا اور مقامی ثقافت کو فروغ دینا اہم ہے۔ بچوں اور نوجوانوں کو غیر اخلاقی مواد سے دور رکھ کر انہیں تعمیری اور اسلامی مواد فراہم کیا جائے۔ دعا، ذکر، اور عبادات کے ذریعے اللہ سے مضبوط تعلق قائم کرنا بھی ان سازشوں کا مقابلہ کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اجتماعی دعائیں، نماز، اور توبہ انسان کو روحانی سکون دیتی ہیں اور اسے دنیاوی چالاکیوں سے محفوظ رکھتی ہیں۔ امام علی (ع) کا فرمان ہے کہ جس کا اللہ سے تعلق مضبوط ہو، دنیا کی سازشیں اس پر اثر نہیں کرتیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کے جال سے آزاد ہونے کے لیے خود کفالت کو فروغ دیا جائے۔ زراعت، چھوٹے کاروبار، اور مقامی وسائل کے استعمال کو اہمیت دی جائے تاکہ معیشت مضبوط ہو اور لوگوں کا انحصار بڑے سرمایہ داروں پر کم ہو۔ اسلامی معاشرتی نظام کی حمایت اور قوانین کے ذریعے خاندانی نظام اور معاشرتی انصاف کو یقینی بنایا جائے۔ اسلامی تنظیموں اور حکومتوں کو چاہیے کہ وہ عوام میں شعور پیدا کریں اور اجتماعی نظام کی حفاظت کے لیے اقدامات کریں۔ یہ تمام اقدامات مل کر نہ صرف ان سازشوں کا مقابلہ کرنے میں مدد دیں

گے بلکہ ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیں گے جو اسلامی اصولوں پر مبنی ہو گا اور جہاں ہر فرد خوشحال اور پر امن زندگی گزار سکے گا۔

خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو

مستقل مایوسی یا دائمی منفی سوچ ایک ایسی حالت ہے جو انسان کی زندگی کو نہ صرف ذہنی طور پر متاثر کرتی ہے بلکہ اس کے جسمانی اور روحانی سکون کو بھی ختم کر دیتی ہے۔ جب ہم ہمیشہ زندگی کے منفی پہلو پر توجہ مرکوز کرتے ہیں، تو ہم اپنے اندر خوشی اور سکون کے امکانات کو کم کر لیتے ہیں۔ اس عادت کا شکار شخص اپنی موجودہ حالت اور حالات کو ہمیشہ ناکامیوں اور مشکلات کے تناظر میں دیکھتا ہے، جس کی وجہ سے وہ زندگی کی خوبصورتی اور مثبت پہلو کو نظر انداز کرتا ہے۔

اسلام میں خوشی اور مثبت سوچ کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا" :لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ "(اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، سورہ الزمر 39:53)۔ یہ آیت ہمیں یاد دلاتی ہے کہ چاہے حالات کیسے بھی ہوں، اللہ کی رحمت اور برکت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ایمان کا تقاضا ہے کہ انسان اپنی مشکلات میں بھی اللہ کی مدد اور رحمت پر بھروسہ کرے اور یقین رکھے کہ ہر مشکل کے بعد آسانی ضرور آئے گی۔

مستقل مایوسی کا ایک بڑا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے خوابوں اور مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد نہیں کرتا۔ جب انسان ہمیشہ منفی سوچوں میں ڈوبا رہتا ہے، تو وہ اپنے وسائل اور صلاحیتوں کا صحیح استعمال نہیں کر پاتا۔ اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ کامیابی کا کوئی راستہ

نہیں ہے اور وہ ناکامیوں سے گھبرا کر اپنی کوششیں چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے برعکس، ایک مثبت سوچ والا انسان مشکلات کا سامنا کرنے کے باوجود حل کی تلاش میں رہتا ہے اور ہر چیلنج کو اپنی کامیابی کی طرف ایک قدم سمجھتا ہے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" : تمہاری حالت میں بہترین چیز وہ ہے جو تمہیں فائدہ پہنچائے، اور تمہیں چاہیے کہ تم اللہ سے مدد مانگو اور مایوس نہ ہو"۔ یہ حدیث اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ زندگی میں ہمیشہ مثبت سوچ کو اپنانا ضروری ہے۔ جب ہم اللہ کی مدد پر بھروسہ کرتے ہیں اور مایوسی کو چھوڑ کر شکر گزاری کی عادت ڈالتے ہیں، تو اللہ ہمارے دلوں میں سکون اور خوشی کی نئی روشنی پیدا کرتا ہے۔

شکر گزاری کی اہمیت اس سلسلے میں بے حد بڑھ جاتی ہے۔ جب ہم اپنی زندگی کے چھوٹے چھوٹے پہلوؤں کا شکر ادا کرتے ہیں، تو ہم اپنی سوچ کو مثبت انداز میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ شکر گزاری انسان کو بتاتی ہے کہ زندگی میں جو کچھ بھی ہے، وہ اللہ کی عطا ہے اور ہر لمحہ کی قدر کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں" : اگر تم شکر گزار بنوگے تو میں تمہیں مزید دوں گا "(سورہ ابراھیم 14:7)۔ یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ شکر گزاری نہ صرف ہمیں سکون دیتی ہے بلکہ اللہ کی مزید نعمتوں کا دروازہ بھی کھولتی ہے۔

دائمی مایوسی کے اثرات کو کم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے ذہن میں مثبت تبدیلیاں لائیں۔ اس کا آغاز ان چھوٹے مثبت عملوں سے کیا جا سکتا ہے جنہیں ہم روزمرہ کی زندگی میں شامل کرتے ہیں۔ مثلاً صبح کے وقت اللہ کا شکر ادا کرنا، اپنے دن کی اچھی باتوں پر

توجہ مرکوز کرنا، اور جو چیزیں ہمیں خوشی دیتی ہیں، ان پر دھیان دینا۔ ایسا کرنے سے ہمارا ذہن آہستہ آہستہ منفی خیالات سے صاف ہو جاتا ہے اور ہم زندگی کے مثبت پہلوؤں کو دیکھنے لگتے ہیں۔

یاد رکھیں کہ مثبت سوچ اپنانا ایک عادت ہے، جسے وقت کے ساتھ تیار کیا جا سکتا ہے۔ جب ہم منفی خیالات کو اپنے دل میں جگہ دینا چھوڑ دیتے ہیں اور مثبت سوچ کو اپناتے ہیں، تو ہماری زندگی میں سکون، خوشی اور کامیابی کا دروازہ کھلتا ہے۔ ہم حالات کے مطابق اپنی خوشی کی نوعیت نہیں بدل سکتے، لیکن اپنی سوچ کی نوعیت تبدیل کر کے ہم اپنی زندگی کی سمت بدل سکتے ہیں۔

مستقل مایوسی کی عادت کو ختم کرنا ایک طویل اور محنت طلب عمل ہو سکتا ہے، مگر یہ زندگی کی خوشی اور سکون کے لیے بے حد ضروری ہے۔ مایوسی کا شکار شخص ہمیشہ اپنے حالات کو منفی طور پر دیکھتا ہے اور اس کی سوچ میں ایک گہرا حسرت کا عنصر ہوتا ہے۔ یہ عادت انسان کو نہ صرف جسمانی بلکہ ذہنی اور روحانی سطح پر بھی نقصان پہنچاتی ہے، کیونکہ اس کی توجہ صرف اس پر مرکوز ہوتی ہے جو اسے نہیں مل رہا، بجائے اس کے کہ وہ وہ سب کچھ دیکھے جو اس کے پاس موجود ہے۔

ایک اہم پہلو جو اس مایوسی کو مزید بڑھاتا ہے وہ ہے "موازنہ" کا عمل۔ جب انسان دوسروں کی زندگیوں کا موازنہ اپنی زندگی سے کرتا ہے، تو وہ اپنے آپ کو کم تر محسوس کرنے لگتا ہے اور اس کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس نوع کی

موازنہ انسان کو اپنے اہداف کے حصول میں رکاوٹ ڈالنے کا باعث بنتی ہے۔ اسلام ہمیں اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو دوسروں کے ساتھ موازنہ کرنے کی بجائے اپنی حالت پر توجہ دیں اور اللہ کی رضا کے لیے اپنی محنت کریں۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے" :تم میں سے بہترین وہ ہے جو اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلے میں بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے"۔ اس حدیث میں یہ پیغام دیا گیا ہے کہ ہمیں دوسروں سے موازنہ کرنے کے بجائے خود کی بہتری کے لیے محنت کرنی چاہیے۔ جب ہم اپنی محنت کو اپنی ترقی اور خوشی کا پیمانہ بناتے ہیں، تو ہم مایوسی سے بچ سکتے ہیں اور مثبت سوچ کو اپنا سکتے ہیں۔

ایک اور اہم طریقہ مایوسی سے بچنے کے لیے اپنی زندگی کے چھوٹے چھوٹے لمحوں میں خوشی تلاش کرنا ہے۔ جب ہم اپنے دن میں معمولی باتوں پر خوشی محسوس کرتے ہیں، جیسے کسی خوبصورت منظر کو دیکھنا، کسی کے ساتھ اچھا وقت گزارنا، یا بس ایک لمحے کے لیے اپنی موجودہ حالت پر شکر گزار ہونا، تو ہم اپنی زندگی کی خوبصورتی کو دوبارہ دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ اس طرح کی چھوٹی خوشیاں ہماری زندگی کو خوشگوار اور سکون بخش بناتی ہیں۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ انسان جب اپنے اندر شکر گزاری کی عادت پیدا کرتا ہے، تو وہ مایوسی سے بچنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ شکر گزاری سے انسان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ جو کچھ بھی اس کے پاس ہے، وہ اللہ کی مہربانی ہے، اور اس کا دل اللہ کی رضا میں خوش ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا" :اگر تم شکر گزار ہو تو میں تمہیں مزید دوں گا "(سورہ ابراھیم

14:7)۔ اس آیت سے ہمیں یہ سمجھ آتا ہے کہ شکر گزاری نہ صرف انسان کو ذہنی سکون دیتی ہے، بلکہ یہ اللہ کی مزید برکتوں کا سبب بھی بنتی ہے۔

مستقل مایوسی کی عادت کو کم کرنے کے لیے ہمیں اپنی سوچ کی نوعیت کو بھی بدلنا ہو گا۔ جب ہم مثبت سوچ اپناتے ہیں اور ہر صورت حال میں بہتری کی تلاش کرتے ہیں، تو ہم مشکلات کو بطور چیلنج دیکھتے ہیں، نہ کہ رکاوٹ کے طور پر۔ مایوسی کے بجائے ہمیں ہر مشکل میں اللہ کی حکمت اور اس کی مدد کا یقین رکھنا چاہیے۔ ایسا کرنے سے ہم اپنی زندگی کے منفی پہلوؤں کو کم کر سکتے ہیں اور اس کی خوشی اور سکون میں اضافہ کر سکتے ہیں۔

آخر کار، مایوسی کو شکست دینے کے لیے ہمیں اپنی زندگی کے مقصد اور سمت کا واضح علم ہونا چاہیے۔ جب ہم جانتے ہیں کہ ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے اور ہم کس سمت میں جا رہے ہیں، تو مایوسی کا اثر کمزور پڑ جاتا ہے۔ ہم اپنے مقصد کی طرف بڑھتے ہوئے ہر لمحے کو قیمتی سمجھتے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہر لمحہ اللہ کی رضا کی طرف بڑھنے کا ایک نیا موقع ہے۔ اس طرح، مستقل مایوسی کی عادت کو شکست دے کر ہم اپنی زندگی کو زیادہ مثبت اور سکون بخش بنا سکتے ہیں۔

خود کا دوسروں سے موازنہ نہ کریں

موازنہ کی عادت ایک ایسی نفسیاتی حالت ہے جس میں فرد مسلسل اپنے آپ کو دوسروں سے موازنہ کرتا رہتا ہے، چاہے وہ کسی کی کامیاب زندگی ہو، کارکردگی ہو، یا خوشی کی حالت ہو۔ یہ عادت نہ صرف ذہنی سکون کو متاثر کرتی ہے بلکہ خود اعتمادی کو بھی کمزور کر دیتی ہے۔ جب ہم دوسروں کی کامیابیوں یا زندگی کے ساتھ اپنا موازنہ کرتے ہیں تو اکثر ہمیں اپنی زندگی میں کمی اور ناکامی محسوس ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو کمتر سمجھنا شروع کر دیتے ہیں اور اپنی منفرد خصوصیات اور کامیابیوں کو نظر انداز کرتے ہیں۔

اسلامی تعلیمات میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ انسان کو اپنے آپ کو دوسروں سے موازنہ کرنے کے بجائے اپنی کوششوں اور کامیابیوں کی قدر کرنی چاہیے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا" : ہر انسان کے لیے وہی کچھ ہے جو اس نے کمائی کی "(سورہ النجم، 53:39)۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہر فرد کے لیے اس کی محنت اور کوشش کا نتیجہ مخصوص ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اپنی منفرد خصوصیات اور صلاحیتوں سے نوازا ہے، اور اسے اپنی کامیابیوں پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔

موازنہ کرنے کی عادت کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ انسان اپنی خود اعتمادی کھو دیتا ہے۔ جب ہم مسلسل دوسروں سے موازنہ کرتے ہیں، تو یہ ہمیں اپنی اصل صلاحیتوں اور خوبیوں سے بے خبر کر دیتا ہے۔ اس سے ہم اپنی ترقی کے راستے پر رکاوٹیں محسوس کرتے ہیں اور خود کو دوسروں کی کامیابیوں کے تناظر میں کمتر سمجھنے لگتے ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا" : جو اپنے آپ کو دوسروں سے موازنہ کرتا ہے، وہ ہمیشہ شکست کھاتا ہے"۔ اس قول سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ موازنہ کی عادت انسان کے اندر کمزوری پیدا کرتی ہے، جبکہ اپنی انفرادیت اور خصوصیات کو تسلیم کرنا ہی کامیابی کی راہ ہے۔

اگر ہم اپنی زندگی میں موازنہ کی عادت سے بچنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی شخصیت کی مکمل پہچان حاصل کرنی ہوگی۔ ہمیں اپنی انفرادیت اور صلاحیتوں کو تسلیم کرنا چاہیے، کیونکہ ہر انسان کا سفر مختلف ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا" : اور تمہیں جو کچھ دیا گیا ہے وہ صرف تمہارے لیے ہے "(سورہ النساء، 4:32)۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ بھی ہمیں اللہ کی طرف سے ملتا ہے، وہ ہمارے لیے مخصوص ہے اور ہماری محنت کا نتیجہ ہے۔ ہمیں اپنی زندگی کے مقصد اور کامیابیوں پر توجہ دینی چاہیے، نہ کہ دوسروں کی کامیابیوں کے پیچھے دوڑنا چاہیے۔

موازنہ کرنے کی عادت سے بچنے کے لیے ایک اہم قدم یہ ہے کہ ہم اپنی کامیابیوں اور اپنی زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو تسلیم کریں۔ جب ہم اپنی کامیابیوں کا جشن مناتے ہیں اور اپنی محنت کی قدر کرتے ہیں، تو ہم اپنی خود اعتمادی کو بڑھاتے ہیں۔ حضرت امام حسین علیہ

السلام کا قول ہے " : جو اپنی محنت کی قدر کرتا ہے، وہ دنیا و آخرت میں کامیاب ہوتا ہے"۔ اس قول سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کو اپنی محنت کی اہمیت سمجھنی چاہیے اور دوسروں سے موازنہ کرنے کے بجائے اپنی کامیابیوں پر فخر کرنا چاہیے۔

آخرکار، موازنہ کی عادت کو ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی زندگی کے مقصد کو واضح کریں اور اپنی کوششوں پر توجہ مرکوز کریں۔ ہر فرد کا راستہ مختلف ہوتا ہے اور کامیابی ہر شخص کے لیے مختلف ہوتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے آپ کو دوسروں سے موازنہ کرنے کے بجائے اپنی صلاحیتوں، خصوصیات اور محنت کی قدر کریں، تاکہ ہم اپنی زندگی میں سکون اور کامیابی حاصل کر سکیں۔

موازنہ کی عادت میں انسان ہمیشہ دوسروں کی زندگی کے بیرونی پہلوؤں کو اپنی زندگی سے موازنہ کرتا ہے، جس سے اس کی ذہنی سکونت اور خوشی متاثر ہوتی ہے۔ اس عادت کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ انسان اپنی کامیابیوں اور کوششوں کو نظرانداز کرتا ہے، اور وہ سوچتا ہے کہ دوسروں کے پاس جو کچھ ہے، وہ اس کے پاس نہیں ہے۔ یہ انسان کو اپنے آپ سے دور کر دیتا ہے اور اس کی زندگی میں احساس کمتری پیدا کرتا ہے۔ لیکن اگر ہم اپنی کامیابیوں کو اپنی انفرادی کوششوں کا نتیجہ سمجھیں اور اپنی صلاحیتوں پر اعتماد کریں، تو ہم اس جال سے بچ سکتے ہیں۔

اسلام میں ہمیں سکھایا گیا ہے کہ ہر انسان کی تقدیر اور زندگی کے راستے مختلف ہوتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ہر فرد کو اپنی صلاحیتوں کے مطابق نوازا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے

فرمایا" :اور ہر شخص کو اس کی محنت کا نتیجہ ملے گا "(سورہ النجم،53:39)۔اس آیت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہمارا نتیجہ ہمارے عمل اور محنت پر منحصر ہوتا ہے،نہ کہ دوسروں کے ساتھ موازنہ کرنے پر۔ موازنہ کرنے کی عادت میں ہم اپنی حقیقت کو نظر انداز کرتے ہیں اور دوسروں کی کامیابیوں کو اپنی ناکامی کے طور پر دیکھتے ہیں،حالانکہ ہر انسان کا راستہ مختلف ہوتا ہے۔

جب ہم دوسروں سے موازنہ کرتے ہیں،تو ہم ایک حقیقت کو نظر انداز کرتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ ہر کسی کی زندگی میں چیلنجز اور مشکلات الگ ہوتی ہیں۔ جو کامیابیاں ہم دوسروں میں دیکھتے ہیں، ان کے پیچھے اکثر ان کی محنت، قربانیاں اور جدوجہد چھپی ہوتی ہے۔ ہم ان کی کامیاب زندگی کے صرف ایک پہلو کو دیکھ کر اس سے موازنہ کرتے ہیں، جب کہ ان کی کہانی کا مکمل تناظر ہم نہیں جان پاتے۔ حضرت علی علیہ السلام کا قول ہے" :جو شخص دوسروں سے موازنہ کرتا ہے، وہ ہمیشہ اپنی کمزوریوں کو دیکھتا ہے اور اپنی طاقتوں کو نظر انداز کرتا ہے"۔ اس قول سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ موازنہ کی عادت انسان کو خود سے دور کر دیتی ہے اور وہ اپنی طاقتوں کو نہیں پہچان پاتا۔

اس عادت سے بچنے کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو معیاری یا نمونہ سمجھیں، اور اپنی زندگی کے مقصد کو واضح کریں۔ جب ہم اپنی محنت، فیصلوں اور کامیابیوں کو اپنی شخصیت کے مطابق دیکھیں گے، تو ہم دوسروں سے موازنہ کرنے کے بجائے اپنے راستے پر چلنے میں کامیاب ہوں گے۔ حضرت امام علی علیہ السلام نے فرمایا" :اپنی تقدیر کے مالک خود

بنو، اور دوسروں کی تقدیر پر نظر نہ رکھو"۔ اس قول میں یہ پیغام ہے کہ ہمیں اپنی زندگی کو اپنے اصولوں اور مقصد کے مطابق گزارنی چاہیے، اور دوسروں کے راستوں سے متاثر ہو کر اپنی سمت نہ بدلنی چاہیے۔

اسی طرح، موازنہ کی عادت سے بچنے کے لیے ہمیں اپنی زندگی میں شکر گزاری کی عادت ڈالنی چاہیے۔ جب ہم اپنی زندگی کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں اور ان پر توجہ دیتے ہیں، تو ہم اپنی زندگی میں خوشی اور سکون محسوس کرتے ہیں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کا قول ہے" :شکر گزاری انسان کو سکون دیتی ہے اور موازنہ کرنے سے وہ ہمیشہ غیر مطمئن رہتا ہے"۔ اس قول سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شکر گزاری انسان کو اندرونی سکون اور اطمینان فراہم کرتی ہے، اور اسے دوسروں کے ساتھ موازنہ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

آخر کار، موازنہ کی عادت سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی زندگی کے مقصد اور اپنی انفرادیت کو سمجھیں۔ ہر انسان کا سفر مختلف ہوتا ہے اور ہر ایک کی کامیابی کی پیمائش مختلف ہوتی ہے۔ جب ہم اپنی کوششوں اور محنتوں کو اہمیت دیتے ہیں اور اپنی زندگی کو اپنی صلاحیتوں کے مطابق ڈھالتے ہیں، تو ہم موازنہ کے جال سے آزاد ہو سکتے ہیں اور اپنے آپ کو بہتر انداز میں پہچان سکتے ہیں۔

خوشامد و تعریف شیطان کا جال

خوشامد کا جال ایک ایسا نفسیاتی حربہ ہے جسے اکثر لوگ اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتے ہیں، اور اس کا شکار انسان اپنی بے احتیاطی کی وجہ سے ہو جاتا ہے۔ خوشامد صرف تعریفوں اور مدح سرائی کا ذریعہ نہیں بلکہ یہ ایک چالاک طریقہ ہوتا ہے جس کے ذریعے کسی کو اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے متاثر کیا جاتا ہے۔ اس جال میں بندھے شخص کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اسے بے پناہ عزت اور محبت دی جا رہی ہے، جبکہ حقیقت میں یہ صرف ایک عارضی لذت ہوتی ہے جس کا مقصد صرف اس کا فائدہ اٹھانا ہوتا ہے۔

اسلام میں خوشامد کو نہ صرف اخلاقی طور پر غلط سمجھا گیا ہے بلکہ اس سے بھی انسان کو بچنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا" :جو شخص تمہیں خوشامد کرے، اس سے بچو کیونکہ وہ تمہیں ایک نہ ایک دن نقصان پہنچائے گا"۔ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ خوشامد کرنے والے لوگ، جو بہت زیادہ تعریفیں کرتے ہیں، کبھی نہ کبھی اپنے مفاد کے لیے آپ کو کسی نہ کسی طریقے سے استعمال کر سکتے ہیں۔

خوشامد کا جال ہمیں اس بات کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ تعریفوں اور مدح سرائی کا مقصد ہمیشہ سچی محبت یا عزت نہیں ہوتا۔ جب کوئی شخص آپ کی مسلسل تعریف کرتا ہے یا آپ کو

غیر معمولی اہمیت دیتا ہے، تو اس کے پیچھے کبھی نہ کبھی کوئی ذاتی مفاد یا مقصد ہوتا ہے۔ انسان کو اس بات کی سمجھ بوجھ حاصل کرنی چاہیے کہ تعریفوں کے پیچھے اگر کوئی مقصد چھپا ہو، تو ہمیں اس پر فوری طور پر ردعمل نہیں دینا چاہیے۔ ہمیں اس بات کا شعور رکھنا چاہیے کہ یہ خوشامد صرف وقتی تسکین ہوتی ہے جو عموماً انسان کو اس کے مقصد سے بھٹکاتی ہے۔

اسلامی تعلیمات میں ہمیں اپنی شخصیت کی حفاظت کرنے کی ترغیب دی گئی ہے تاکہ ہم کسی بھی غیر صحت مند تعلقات یا خوشامد کے جال کا شکار نہ ہوں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا" : اور ان کی باتوں پر کان نہ دھرو، کیونکہ وہ تمہارے لیے کچھ فائدہ نہیں رکھتے " (سورہ النحل 16:64)۔ یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ خوشامد کرنے والوں کی باتوں کو بغیر تحقیق کے قبول کرنا خطرناک ہو سکتا ہے۔

ایک انسان جب خوشامد کے جال میں پھنس جاتا ہے تو وہ اپنے فیصلوں میں غلطی کر سکتا ہے، کیونکہ وہ اپنی ذاتی صلاحیتوں اور فیصلوں کو دوسروں کی پسند اور خواہشات کے مطابق ڈھالنے لگتا ہے۔ یہ عادت نہ صرف ہماری خودی کو کمزور کرتی ہے بلکہ ہمارے فیصلوں کو بھی نقصان پہنچاتی ہے، کیونکہ ہم اپنے مفادات اور حقیقت سے ہٹ کر دوسرے لوگوں کی توقعات اور تعریفوں کے مطابق چلنے لگتے ہیں۔

اس جال سے بچنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے اپنے آپ کو اس بات پر قائل کرنا چاہیے کہ ہماری قدر اور عزت صرف ہماری صلاحیتوں، عمل اور سچے کردار پر مبنی ہے۔ ہمیں اپنی ذاتی خودی کو اہمیت دینی چاہیے اور دوسروں کی خوشامد کو ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھنا چاہیے۔ ہر

تعریف یا خوشامد کو حقیقت کے آئینے میں پرکھنا ضروری ہے تاکہ ہمیں اپنے فیصلوں میں دھوکہ نہ ہو۔

خوشامد کے جال میں پھنسنے سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی حدود کو سمجھیں اور اپنے ارد گرد کے لوگوں سے اپنے حقیقی تعلقات کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں۔ ایک اچھی طرح سے جڑے ہوئے اور سچے تعلقات میں کسی قسم کی خوشامد کی ضرورت نہیں ہوتی؛ سچے تعلقات میں احترام، محبت اور تعاون ہی اہمیت رکھتے ہیں۔

اگر ہم اس جال سے بچنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی حساسیت اور شعور کو بڑھانے کی ضرورت ہے۔ جب ہمیں کسی کی طرف سے مسلسل تعریفیں ملتی ہیں، تو ہمیں اس کا تجزیہ کرنا چاہیے کہ آیا وہ شخص ہماری عزت یا مفاد کی خاطر یہ کر رہا ہے یا پھر اس کا کوئی اور مقصد ہے۔ اس کے بعد ہمیں اپنے فیصلوں کو صرف اپنے ضمیر اور سچائی کی بنیاد پر کرنا چاہیے، نہ کہ کسی کی خوشامد یا تعریفوں کے اثر میں آکر۔

خوشامد کا جال انسان کے اندر ایک نفسیاتی دباؤ پیدا کرتا ہے جسے اکثر وہ براہِ راست نہیں سمجھ پاتا۔ جب کسی فرد کو مسلسل تعریفیں ملتی ہیں، تو وہ اپنے آپ کو اہم اور منفرد سمجھنے لگتا ہے، اور اس کے اندر ایک خود پسندی کی حالت پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ جال اس وقت اور بھی زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے جب اس تعریف یا خوشامد کے ذریعے دوسرے لوگ اپنے مفادات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ذہنی طور پر انسان کو کمزور کرتا ہے کیونکہ وہ اپنی حقیقت سے ہٹ کر صرف تعریفوں اور توصیفوں کی بنیاد پر اپنے فیصلے کرنے لگتا ہے۔

اسلام میں خوشامد سے بچنے کے لیے ایک اہم اصول بتایا گیا ہے، جو ہے "سچائی اور حقیقت" کی بنیاد پر فیصلہ کرنا۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا" : اے ایمان والو، اگر تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہو، تو تمہارے آپس کے تعلقات میں سچائی اور امانت داری ہونی چاہیے "(سورہ النساء 4:58)۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کو اپنی زندگی میں سچائی اور ایمانداری کی بنیاد پر تعلقات قائم کرنے چاہئیں اور خوشامد کے جال سے بچنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ دوسروں کی اچھی باتوں کا جواب نہ دیا جائے، بلکہ ہمیں ہمیشہ اپنے دل کی آواز پر بھروسہ کرتے ہوئے اور کسی بھی انسان کی تعریف کے پیچھے چھپے مقاصد کو سمجھتے ہوئے اپنی رائے قائم کرنی چاہیے۔

خوشامد کا جال نہ صرف انسان کے ذاتی تعلقات میں مشکلات پیدا کرتا ہے بلکہ یہ اس کے اجتماعی اور پیشہ ورانہ تعلقات میں بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص خوشامد کے ذریعے کسی کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، تو وہ اس کی صلاحیتوں اور کردار کو دھندلا کر دیتا ہے۔ ایسی صورت میں انسان اپنے اصل مقصد سے ہٹ کر غیر ضروری باتوں میں الجھ جاتا ہے۔ خوشامد کرنے والا فرد اس کا فائدہ اٹھا کر اپنے مفاد کے مطابق فیصلہ کراتا ہے، جو بعد میں انسان کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

اگر ہم اس جال سے بچنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلی چیز جو ہمیں کرنی چاہیے وہ ہے خود کو جاننا اور اپنی صلاحیتوں اور فیصلوں پر اعتماد کرنا۔ جب ہم اپنے آپ پر بھروسہ کرتے ہیں اور اپنی سوچ میں استقلال رکھتے ہیں، تو ہم دوسروں کی تعریفوں اور خوشامد سے متاثر نہیں ہوتے۔

ایک مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی تقدیر اور کامیابی کا انحصار اللہ کی رضا اور اپنی محنت پر رکھے، نہ کہ دوسروں کی مسلسل تعریفوں پر۔

ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ خوشامد کرنے والے لوگوں کو پہچاننا اور ان سے احتیاط برتنا ضروری ہے۔ یہ لوگ اکثر جذباتی طور پر لوگوں کا شکار کرتے ہیں اور اپنی تعریفوں کے ذریعے ان کی خودی اور ذہنی سکون کو متاثر کرتے ہیں۔ جب ہمیں ایسی صورتحال کا سامنا ہو، تو ہمیں چاہیے کہ ہم فوراً اپنی توجہ اصل مقصد اور فطری راستے پر مرکوز کر لیں اور اپنی خودی کو نقصان پہنچانے سے بچائیں۔

آخرکار، خوشامد کا جال انسان کو اس کے حقیقی راستے سے بھٹکا کر نقصان پہنچانے کا باعث بنتا ہے۔ اسلام ہمیں ہمیشہ حقیقت کی بنیاد پر فیصلے کرنے کی ترغیب دیتا ہے، اور ہمیں اس بات سے آگاہ کرتا ہے کہ کسی کی تعریفوں یا خوشامدوں میں پھنس کر ہم اپنی زندگی کے مقصد سے ہٹ نہ جائیں۔ سچی کامیابی وہ ہے جو اپنے ایمان، اخلاق اور محنت پر یقین رکھتے ہوئے حاصل کی جائے، نہ کہ دوسرے لوگوں کی تعریفوں کے جال میں پھنس کر۔

درگذر، چشم پوشی، معافی اور ذہنی سکون

معافی نہ دینے کی عادت انسان کی ذہنی، جذباتی اور روحانی زندگی پر گہرے منفی اثرات ڈالتی ہے۔ یہ رویہ نہ صرف دل کی سختی اور نفرت کو بڑھاتا ہے بلکہ ہماری زندگی میں سکون اور اطمینان کو ختم کر دیتا ہے۔ جب ہم کسی کے خلاف دل میں بغض رکھتے ہیں، تو درحقیقت ہم اپنے آپ کو ایک ایسی کیفیت میں مبتلا کر لیتے ہیں جو ہماری اپنی ذہنی اور جسمانی صحت کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔

اسلامی تعلیمات میں معافی کو ایک عظیم اور اعلیٰ اخلاقی خوبی کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں" :وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ "(اور انہیں چاہیے کہ معاف کر دیں اور درگزر کریں، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے؟ اور اللہ بڑا معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے)۔ یہ آیت ہمیں نہ صرف دوسروں کو معاف کرنے کی اہمیت بتاتی ہے بلکہ یہ بھی واضح کرتی ہے کہ معافی دینے والے کو اللہ کی رحمت اور مغفرت نصیب ہوتی ہے۔

معافی دینے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم دوسروں کے غلط اعمال کو جائز قرار دے رہے ہیں یا ان کے کیے کو بھول رہے ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب ہے کہ ہم اپنے دل کو نفرت، غصے، اور مایوسی

کے بوجھ سے آزاد کر رہے ہیں۔ معاف کرنا ایک ایسا عمل ہے جو سب سے پہلے معاف کرنے والے کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ یہ دل کو ہلکا کرتا ہے، سکون فراہم کرتا ہے، اور ہمیں آگے بڑھنے میں مدد دیتا ہے۔

نفسیاتی تحقیق بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ معافی دینے والے افراد زیادہ سکون، خوشی، اور بہتر ذہنی صحت کے حامل ہوتے ہیں۔ جب ہم کسی کو معاف نہیں کرتے، تو ہم دراصل اپنے اندر منفی جذبات کو پال رہے ہوتے ہیں جو تناؤ، ڈپریشن، اور دیگر ذہنی بیماریوں کا سبب بن سکتے ہیں۔ اس کے برعکس، معافی دینے کا عمل نہ صرف ہمارے جذباتی بوجھ کو کم کرتا ہے بلکہ ہمیں زندگی میں مثبت انداز سے آگے بڑھنے میں مدد دیتا ہے۔

معافی دینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے اندر صبر اور برداشت کو فروغ دیں۔ یہ ایک عمل ہے جو وقت اور محنت کا متقاضی ہے، لیکن اس کے نتائج ہماری زندگی کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ ہمیں یہ سمجھنا ہو گا کہ انسان غلطی کرنے والا ہے، اور اگر ہم دوسروں کی غلطیوں کو معاف کریں گے، تو ہمیں بھی اپنی غلطیوں پر معافی ملے گی۔ حدیث میں ہے" : جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جائے گا"۔ یہ اصول معافی کے لیے بھی موزوں ہے؛ اگر ہم دوسروں کو معاف نہیں کریں گے، تو ہمیں اللہ کی مغفرت کی امید کیسے ہو سکتی ہے؟

معافی دینے کے عمل کو اپنانے کے لیے ہمیں اپنے دل کو تربیت دینی ہو گی۔ سب سے پہلے، ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ہمارے دل میں بغض رکھنا ہمیں کس حد تک نقصان پہنچا رہا ہے۔

پھر، ہمیں اپنے غصے کو قابو میں رکھنے کے لیے دعا اور ذکر کا سہارا لینا چاہیے۔ اللہ سے مدد مانگیں کہ وہ ہمیں معاف کرنے کا حوصلہ عطا کرے اور ہمارے دل کو سکون بخشے۔

دوسرا قدم یہ ہے کہ ہم معاف کرنے کو ایک مسلسل عمل سمجھیں، نہ کہ ایک وقتی فیصلہ۔ کچھ مواقع پر ہمیں بار بار معاف کرنا پڑتا ہے، کیونکہ پرانے زخم دوبارہ سر اٹھا سکتے ہیں۔ اس وقت ہمیں خود کو یاد دلانا ہوگا کہ معافی نہ دینے کا بوجھ صرف ہمیں نقصان پہنچا رہا ہے، اور معافی دینا ہی اصل میں ہماری روح کو آزاد کرے گا۔

معاف کرنا ایک طاقت ہے، کمزوری نہیں۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو ہمارے دل کو نرم کرتا ہے، تعلقات کو بحال کرتا ہے، اور ہمیں حقیقی سکون سے روشناس کراتا ہے۔ جب ہم معاف کرتے ہیں، تو ہم نہ صرف اپنے دل کو پاکیزگی عطا کرتے ہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی ایک مثال قائم کرتے ہیں۔ یہی وہ رویہ ہے جو ہماری روحانی، جذباتی، اور معاشرتی زندگی کو کامیاب اور متوازن بنا سکتا ہے۔

معافی دینے کا عمل نہ صرف ہماری ذاتی زندگی بلکہ معاشرتی تعلقات اور اجتماعی ترقی پر بھی گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ جب ہم معاف کرنے کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لیتے ہیں، تو ہم اپنی ذات کے ساتھ ساتھ اپنے معاشرے میں بھی مثبت تبدیلی لانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ معافی نہ دینے کی عادت خاندانوں میں اختلافات کو جنم دیتی ہے، دوستوں کے درمیان فاصلے پیدا کرتی ہے، اور معاشرے میں ایک سرد مہری اور بے اعتمادی کی فضا قائم کرتی ہے۔

اسلامی روایات میں معافی کو صرف ذاتی فائدے تک محدود نہیں رکھا گیا، بلکہ اسے ایک سماجی فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" :سب سے بہترین انسان وہ ہے جو دوسروں کو معاف کرے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے"۔ یہ تعلیمات ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ معاف کرنے سے تعلقات مضبوط ہوتے ہیں، دلوں میں محبت پیدا ہوتی ہے، اور معاشرے میں اتحاد اور بھائی چارے کی فضا قائم ہوتی ہے۔

معاف نہ کرنے کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ یہ ہمارے ذہن کو مستقل ماضی کی تلخیوں میں الجھا کر رکھتا ہے۔ ہم بار بار ان ناخوشگوار لمحات کو یاد کرتے ہیں جنہوں نے ہمیں تکلیف دی، اور یوں ہمارا حال اور مستقبل ماضی کی قید میں چلا جاتا ہے۔ معافی دینے کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان تکلیف دہ یادوں کو چھوڑ کر آگے بڑھنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ یہ عمل ہمیں ماضی کی تلخیوں سے آزاد کرتا ہے اور حال میں جینے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

معاف کرنے کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ یہ ہمیں اپنے آپ کو بہتر انسان بنانے کا موقع دیتا ہے۔ جب ہم دوسروں کو معاف کرتے ہیں، تو ہم اپنے دل کو نفرت اور غصے سے پاک کرتے ہیں۔ یہ عمل ہماری روحانی ترقی میں معاون ثابت ہوتا ہے اور ہمیں اللہ کی قربت کے قریب لے جاتا ہے۔ امام علیؑ کا فرمان ہے" :سب سے بڑا انتقام معاف کر دینا ہے"۔ یہ قول ہمیں یاد دلاتا ہے کہ معافی دینا دراصل ایک اخلاقی بلندی ہے، جو ہمارے دل کو سکون اور ہماری شخصیت کو عظمت عطا کرتی ہے۔

معافی دینے کے عمل کو اپنانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم خود احتسابی کو اپنی زندگی کا حصہ بنائیں۔ ہمیں یہ سمجھنا ہو گا کہ ہم خود بھی غلطیاں کرتے ہیں، اور جس طرح ہم اپنی غلطیوں پر دوسروں کی معافی کے طلبگار ہوتے ہیں، اسی طرح ہمیں دوسروں کو بھی معاف کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے " إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ "(بے شک اللہ توبہ کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے)۔ یہ آیت ہمیں یاد دلاتی ہے کہ معافی دینا اور توبہ کرنا اللہ کی پسندیدہ صفات میں شامل ہیں۔

معافی کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ یہ دوسروں کے دلوں میں ہماری عزت کو بڑھاتا ہے۔ ایک ایسا شخص جو دوسروں کی غلطیوں کو معاف کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، وہ دوسروں کے دلوں میں محبت اور احترام پیدا کرتا ہے۔ معافی دینے والے افراد کو نہ صرف دنیا میں عزت ملتی ہے بلکہ آخرت میں بھی ان کے لیے اللہ کی طرف سے مغفرت اور رحمت کا وعدہ ہے۔

معاف کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اپنے اصولوں یا حقوق کو قربان کر دیں۔ بلکہ معافی دینا ایک حکمت اور سمجھ داری کا عمل ہے، جس میں ہم اپنی روحانی اور اخلاقی بلندی کو برقرار رکھتے ہیں، لیکن ساتھ ہی اپنی حدود اور حقوق کا تحفظ بھی کرتے ہیں۔ معاف کرنے کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ ہم دوسروں کو ان کی غلطیوں کے بارے میں نرمی اور محبت کے ساتھ آگاہ کریں تاکہ وہ آئندہ ان غلطیوں سے بچ سکیں۔

آخر میں، معاف کرنے کا عمل ہمیں اللہ کی صفت "الرحمن" کی جھلک دکھانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ جب ہم معاف کرتے ہیں، تو ہم اللہ کی اس صفت کو اپنی زندگی میں اپناتے ہیں اور

ایک بہتر انسان بننے کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔ معاف کرنا نہ صرف ایک عبادت ہے بلکہ ایک ایسا عمل ہے جو ہماری زندگی میں محبت، امن، اور سکون کو فروغ دیتا ہے۔ یہی وہ رویہ ہے جو نہ صرف ہماری ذاتی زندگی کو بہتر بناتا ہے بلکہ ہمارے معاشرے میں بھی ایک مثبت اور تعمیری تبدیلی کا باعث بنتا ہے۔

دنیا کے کامیاب افراد اور ہمارے جوان

موٹیویشنل اسپیکرز کی باتیں سننے اور ان پر عمل کرنے کا اثر مختلف معاشرتی، تعلیمی، اور معاشی حالات پر منحصر ہوتا ہے۔ مغرب کے نوجوانوں کی کامیابی کا بڑا حصہ ان کے معاشرتی نظام، تعلیمی معیار، اور وسائل کی دستیابی سے جڑا ہوتا ہے۔ ان کے پاس وہ بنیادی ڈھانچہ اور مواقع موجود ہیں جو ان کی ترقی کے لیے راہ ہموار کرتے ہیں۔ جب کوئی موٹیویشنل اسپیکر انہیں کامیابی کے اصول بتاتا ہے تو وہ ان اصولوں کو اپنی زندگی میں عملی طور پر نافذ کرنے کے لیے سازگار حالات اور حمایت حاصل کرتے ہیں۔

اس کے برعکس، تیسری دنیا کے نوجوانوں کو ایسی ہی رہنمائی ملتی ہے لیکن وہ ان اصولوں کو نافذ کرنے میں مختلف قسم کی رکاوٹوں کا سامنا کرتے ہیں۔ ان میں تعلیمی مواقع کی کمی، معاشی دباؤ، اور سسٹم کی ناکارکردگی شامل ہیں۔ یہاں کے سماجی ڈھانچے میں وہ استحکام اور حمایت نہیں جو کسی شخص کو ترقی کی راہ پر گامزن کر سکے۔ موٹیویشنل باتیں سن کر جوش و خروش پیدا ہوتا ہے، لیکن عملی میدان میں ناکافی وسائل اور پیچیدہ حالات اکثر راستے کی دیوار بن جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ، مغرب میں کامیابی کا تصور اور معیار بھی مختلف ہو سکتا ہے۔ وہاں عملی سوچ، تجرباتی تعلیم، اور آزادانہ فیصلہ سازی کو فروغ دیا جاتا ہے، جبکہ تیسری دنیا میں اکثر نوجوانوں کو روایتی اور محدود سوچ کا سامنا ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں، جب وہ موٹیویشنل اصولوں پر عمل کرتے ہیں، تو ان کے اثرات کم یا مختلف دکھائی دیتے ہیں۔

یہ فرق دراصل اس بات کی یاد دہانی ہے کہ کامیابی کے اصولوں کو اپنے مخصوص ماحول اور حالات کے مطابق ڈھالنا ضروری ہے۔ موٹیویشنل اسپیکرز کی باتیں اسی وقت حقیقی اثر ڈال سکتی ہیں جب ان کے ساتھ ایک ایسا نظام ہو جو ان اصولوں کو قابلِ عمل بنا سکے۔ تیسری دنیا کے نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی حقیقت کو سمجھتے ہوئے ان اصولوں کو مقامی حالات میں ڈھالنے کی کوشش کریں اور طویل مدتی محنت و جدوجہد پر یقین رکھیں۔

مشاہدہ کیا گیا ہے کہ اکثر کامیاب افراد استعماری اداروں کے چیف آفیسر ہیں۔ یہ مشاہدہ ایک تلخ حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ دنیا کے موجودہ معاشی اور سماجی ڈھانچے میں طاقت اور دولت اکثر ان افراد کے ہاتھوں میں مرکوز ہوتی ہے جو استعماری یا سرمایہ دارانہ نظام کے فائدے اٹھا رہے ہیں۔ استعماری ادارے، چاہے وہ کارپوریشنز ہوں یا مالیاتی ادارے، ایک خاص طرزِ عمل اور اقدار کو فروغ دیتے ہیں جو دنیا کے وسائل پر قابض رہنے اور ترقی پذیر ممالک کو ایک خاص دائرے میں محدود رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

کامیاب افراد، جو ان اداروں کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے ہیں، عام طور پر اسی نظام کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ان کی کامیابی اکثر اس نظام کے اصولوں پر چلنے، اسے مضبوط کرنے،

اور اس سے فوائد حاصل کرنے پر منحصر ہوتی ہے۔ ایسے افراد کی کامیابی کو اکثر عالمی کامیابی کے معیار کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، لیکن یہ کامیابی انفرادی ترقی سے زیادہ ایک استحصالی نظام کی بقا کا حصہ ہوتی ہے۔

ترقی پذیر ممالک کے نوجوان اس حقیقت سے متاثر ہوتے ہیں کیونکہ ان کے سامنے یہی کامیابی کا ماڈل پیش کیا جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کامیاب ہونے کے لیے انہیں انہی اداروں کا حصہ بننا ہوگا یا انہی اصولوں پر چلنا ہوگا۔ لیکن اس ماڈل میں کامیابی کے ساتھ ساتھ ایک غیر مساوی نظام کو جاری رکھنے کی ذمہ داری بھی شامل ہوتی ہے، جو اکثر ان کے اپنے سماج کے مفادات کے خلاف ہوتا ہے۔

یہ صورتِ حال ترقی پذیر دنیا کے نوجوانوں کے لیے ایک چیلنج ہے۔ انہیں اس بات کو سمجھنا ہوگا کہ حقیقی کامیابی صرف ذاتی ترقی تک محدود نہیں بلکہ اس میں سماجی اور اخلاقی پہلو بھی شامل ہیں۔ ہمیں ایسے متبادل نظام تلاش کرنے اور فروغ دینے کی ضرورت ہے جو انصاف، مساوات، اور انسانی وقار پر مبنی ہوں۔ کامیابی کو صرف ایک استحصالی نظام کا حصہ بننے کی بجائے، ایک ایسے راستے پر گامزن ہونا چاہیے جو دنیا میں مثبت تبدیلی لائے اور سب کے لیے بہتر مواقع پیدا کرے۔

نوجوانوں کو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ حقیقی کامیابی وہ ہے جو انصاف، محنت، اور فطری اصولوں پر مبنی ہو، نہ کہ ایسی ترقی جو دوسروں کے استحصال یا غلبے پر قائم ہو۔ استعماری یا سرمایہ دارانہ نظام کے ملینرز بظاہر کامیاب نظر آتے ہیں، لیکن ان کی کامیابی کی بنیادیں اکثر

ظلم، نابرابری، اور دوسروں کے حقوق کو دبانے پر استوار ہوتی ہیں۔ ایسی کامیابی نہ صرف ناپائیدار ہوتی ہے بلکہ روحانی اور اخلاقی خسارے کا بھی باعث بنتی ہے۔ نوجوانوں کو اس بات کا ادراک کرنا چاہیے کہ یہ افراد اور ادارے جنہیں وہ رشک کی نظر سے دیکھتے ہیں، درحقیقت ایک ایسے نظام کے نمائندہ ہیں جو انسانیت کے اصولوں کے خلاف ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی ترقی کے لیے جو راستے وضع کیے ہیں، وہ محنت، صبر، اور انصاف پر مبنی ہیں۔ نوجوانوں کو یہ شعور حاصل کرنا ہو گا کہ کامیابی ایک تدریجی عمل ہے، جو وقت اور استقامت کے ساتھ حاصل ہوتی ہے۔ دنیا کی ترقی صرف مادی معیار سے نہیں ناپی جا سکتی، بلکہ اس میں اخلاقی، روحانی، اور سماجی پہلو بھی شامل ہیں۔ جب ہم فطری اصولوں پر عمل کرتے ہیں اور اپنی ترقی کو دھیرے دھیرے بڑھاتے ہیں، تو نہ صرف ہماری بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں بلکہ ہماری کامیابی بھی دیرپا ہوتی ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ نوجوان اپنی سوچ کو آزاد رکھیں اور ایسے خیالات سے متاثر نہ ہوں جو انہیں ظاہری چمک دمک کی طرف مائل کرتے ہیں۔ دنیا کے وسائل کو منصفانہ طریقے سے استعمال کرنے اور دوسروں کے ساتھ بھلائی کا رویہ اپنانے سے ہی حقیقی خوشی اور اطمینان حاصل کیا جا سکتا ہے۔ استعماری طاقتوں کے پروپیگنڈا اور ان کے قائم کردہ مثالی نمونوں سے متاثر ہونے کے بجائے، نوجوانوں کو اپنی اقدار اور اصولوں پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

انہیں یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ کامیابی کا سب سے بڑا معیار یہ نہیں کہ ہم کتنا کما سکتے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ ہم اپنی صلاحیتوں اور وسائل کو دوسروں کی بھلائی کے لیے کیسے استعمال کرتے ہیں۔

دنیا کے ظالمانہ نظاموں سے متاثر ہو کر کامیابی حاصل کرنے کی کوشش انسان کو گمراہی کی طرف لے جا سکتی ہے۔ اس کے برعکس، وہ کامیابی جو سچائی، انصاف، اور ایمان پر مبنی ہو، انسان کو نہ صرف دنیا میں کامیاب بناتی ہے بلکہ آخرت میں بھی سرخرو کرتی ہے۔ اس لیے، نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے راستے پر اعتماد رکھیں، فطری اصولوں پر عمل کریں، اور ترقی کو مرحلہ وار، مستقل مزاجی کے ساتھ حاصل کریں۔

دورِ جدید کی جاہلیت

انسانی معاشرت کے فکری، اخلاقی اور ثقافتی ارتقا میں دو نمایاں رویے ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ ایک طرف قدامت پسندی ہے جو پرانی روایات کو مقدس سمجھ کر ان سے جُڑے رہنے پر اصرار کرتی ہے، اور دوسری طرف جدید جہالت ہے جو ہر نئی بات کو بغیر تحقیق اور تنقید کے اپنانے کو ترجیح دیتی ہے۔ اگرچہ یہ دونوں رویے بظاہر ایک دوسرے کے مخالف نظر آتے ہیں، لیکن ان دونوں میں ایک بنیادی قدر مشترک ہے: اعتدال اور توازن کا فقدان۔ یہی فقدان معاشرتی ترقی میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔

قدامت پسندی کی جڑیں انسانی نفسیات میں اس گہرے خوف سے جڑی ہوتی ہیں جو تبدیلی اور نامعلوم کی طرف پیش قدمی سے متعلق ہے۔ قدامت پسند لوگ عموماً ان باتوں پر یقین رکھتے ہیں جنہیں ان کے آباؤ اجداد نے اپنایا اور ان روایات کو زندگی کا لازمی حصہ سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک تبدیلی خطرناک اور بدعت کے مترادف ہے۔ یہ رویہ معاشرے میں علمی جمود کا باعث بنتا ہے کیونکہ نئی سوچ یا تحقیق کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ نتیجتاً معاشرہ ان اصولوں اور روایات کی بنیاد پر اپنی شناخت قائم کرتا ہے جو بعض اوقات غیر حقیقی اور غیر مستند ہوتی ہیں۔ ان کی سختی سے پابندی معاشرتی ترقی کو محدود کر دیتی ہے۔ مثال کے

طور پر، خواتین کی تعلیم پر پابندی یا ذات پات کے نظام کو مذہب یا ثقافت کے لبادے میں لپیٹ کر ایک ناقابلِ تنقید حقیقت بنا دیا گیا، جو آج بھی کئی معاشروں میں رائج ہے۔

دوسری جانب، جدید جہالت قدامت پسندی کے ردِ عمل کے طور پر پیدا ہوتی ہے۔ یہ ہر قدیم چیز کو فرسودہ اور ہر نئی بات کو ترقی کی علامت سمجھتی ہے، چاہے وہ کتنا ہی نقصان دہ کیوں نہ ہو۔ جدید جہالت کے پیچھے ایک خاص قسم کی اندھی تقلید اور مرعوبیت ہوتی ہے، خاص طور پر ان معاشروں میں جو خود علمی اور فکری میدان میں کمزور ہوں اور خارجی اثرات کا شکار ہوں۔ آج کے دور میں جدید جہالت کی سب سے واضح مثال ان معاشرتی اور ثقافتی رجحانات میں دیکھی جا سکتی ہے جو نوآبادیاتی طاقتوں کی جانب سے متعارف کروائے گئے ہیں۔ نوآبادیاتی نظام کے تحت استعماری طاقتوں نے اپنی برتری برقرار رکھنے کے لیے مقامی روایات اور اقدار کو بے وقعت کرنے کی مہم شروع کی۔ انہوں نے ایک ایسا کلچر فروغ دیا جو زیادہ تر صارفیت، انفرادیت پسندی اور لامحدود آزادی کے گرد گھومتا ہے۔

جدید سماجی کلچر میں آزادی کے نام پر انفرادیت پسندی کو اس حد تک بڑھاوا دیا گیا کہ انسان اپنے خاندان اور معاشرتی ذمہ داریوں سے کٹ کر رہ گیا۔ اس کے نتیجے میں خاندانی نظام کمزور ہو گیا اور ایک ایسا ماحول پیدا ہوا جہاں انسان جذباتی اور نفسیاتی طور پر تنہا ہوتا جا رہا ہے۔ خاندانی رشتے، جو ایک مضبوط معاشرت کی بنیاد ہوتے ہیں، آج بکھرتے جا رہے ہیں۔ جدید معاشی کلچر نے سرمایہ دارانہ نظام اور صارفیت کو پروان چڑھایا، جس میں ہر چیز کو صرف منافع اور مادّی فائدے کے تناظر میں دیکھا جانے لگا۔ اس کے نتیجے میں اخلاقیات اور

انسانیت کے اصول معاشی فیصلوں سے خارج ہو گئے۔ آج بڑے بڑے کارپوریشنز اور مالیاتی ادارے صرف اپنے مفادات کو ترجیح دیتے ہیں، چاہے اس کے نتیجے میں غربت، ماحولیاتی تباہی یا عدم مساوات میں کتنا ہی اضافہ کیوں نہ ہو۔

علم کے میدان میں بھی جدید جہالت نے ایک منفرد چیلنج پیش کیا ہے۔ مغربی تعلیمی ماڈلز اور تحقیقی طریقوں کو اس قدر غالب کر دیا گیا کہ مقامی علم و حکمت کو کمتر اور غیر ضروری سمجھا جانے لگا۔ نتیجتاً مقامی زبانیں، روایات اور علمی ورثہ معدومیت کے خطرے سے دوچار ہو گئے۔ یہ رویہ ایسی نسلیں پیدا کر رہا ہے جو اپنی تہذیبی بنیادوں سے کٹی ہوئی ہیں اور دوسروں کے نظریات اور ماڈلز پر اندھا بھروسہ کرتی ہیں۔

یہ دونوں رویے، قدامت پسندی اور جدید جہالت، ایک متوازن معاشرت کی تعمیر کے لیے ناکافی ہیں۔ ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ہر روایت کو علم اور منطق کی کسوٹی پر پرکھا جائے اور ہر نئی چیز کو اس کے اثرات اور نتائج کے لحاظ سے قبول یا مسترد کیا جائے۔ سوال کرنے، تحقیق کرنے اور تنقیدی سوچ کو فروغ دینا وہ راستہ ہے جو معاشرے کو جہالت کے ان دونوں انتہاؤں سے بچا سکتا ہے۔ معاشرت کو ایسی فضا فراہم کرنا ہو گی جہاں نہ تو اندھی تقلید ہو اور نہ ہی اندھی ردّیت۔ ہر قدیم اور جدید بات کو علم، تحقیق اور مقامی روایات کے پس منظر میں پرکھ کر اپنانا ہو گا۔ ایسا توازن ہی معاشرتی ترقی، علمی آزادی اور اخلاقی ارتقا کی ضمانت دے سکتا ہے۔

جدید دور کی جہالت کا نفسیاتی تجزیہ ایک گہری اور پیچیدہ انسانی رویے کو سمجھنے کی کوشش ہے، جس کے تحت لوگ نئی چیزوں کو بغیر تحقیق اور تنقید کے قبول کرتے ہیں اور پرانی اقدار کو مسترد کر دیتے ہیں۔ یہ رویہ محض لاعلمی کا نتیجہ نہیں بلکہ کئی نفسیاتی عوامل کا مظہر ہے جو انسان کے شعور اور لاشعور میں جڑیں رکھتے ہیں۔ اس جہالت کا پہلا اور بنیادی سبب مرعوبیت اور احساسِ کمتری ہے۔ جب معاشرے استعماری تجربات سے گزرتے ہیں، تو وہ اپنی ثقافت، زبان اور علم کو کمتر سمجھنے لگتے ہیں۔ اس مرعوبیت کے زیرِ اثر ہر وہ چیز جو "جدید" یا "مغربی" کہلائے، انہیں برتر محسوس ہوتی ہے، اور نتیجتاً لوگ اپنی روایات کو ترک کر کے نئے نظریات کو اپنانے لگتے ہیں، چاہے وہ ان کے لیے نقصان دہ ہی کیوں نہ ہوں۔

اس رویے کے پیچھے ایک اور اہم نفسیاتی عنصر اجتماعی شناخت کا بحران ہے۔ جب لوگ اپنی ثقافت، تاریخ اور مذہب سے دور ہو جاتے ہیں، تو وہ اپنی شناخت کے لیے دوسروں کے طرزِ زندگی کو اپنانا شروع کر دیتے ہیں۔ اس بحران کے نتیجے میں لوگ اپنی بنیادوں سے کٹ کر نئی اور غیر حقیقی اقدار کو اپناتے ہیں، جو ان کی انفرادی اور اجتماعی شناخت کو مزید کمزور کر دیتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی جدید دور کی صارفیت نے انسانی نفسیات کو گہرے انداز میں متاثر کیا ہے۔ صارفیت کے کلچر میں ہر چیز کو محض ایک پراڈکٹ کے طور پر دیکھا جاتا ہے اور فوری تسکین کی ترغیب دی جاتی ہے۔ اس نے ایک ایسی نسل پیدا کی ہے جو گہرائی میں سوچنے یا تحقیق کرنے کے بجائے فوری فائدے کو ترجیح دیتی ہے۔ اس رجحان نے تنقیدی سوچ کو مفلوج کر دیا ہے اور لوگوں کو ہر نئی بات کو بغیر سوال کیے اپنانے پر مجبور کر دیا ہے۔

جدید جہالت کا ایک اور پہلو سماجی دباؤ اور پیروی کا رجحان ہے۔ انسانی نفسیات میں یہ فطری رجحان پایا جاتا ہے کہ وہ اپنے ارد گرد کے لوگوں کی پیروی کرے۔ جب معاشرے میں کوئی نئی چیز یا نظریہ مقبول ہوتا ہے، تو افراد اس خوف سے کہ کہیں انہیں "پرانے خیالات کے حامل" نہ سمجھا جائے، خود بھی ان خیالات یا رویوں کو اپنا لیتے ہیں۔ یہ رجحان انفرادی آزادی کو دباؤ کے زیرِ اثر لا کر ایک سطحی تقلید کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

معلومات کے طوفان نے بھی جدید جہالت کو بڑھاوا دیا ہے۔ آج کے دور میں معلومات کی دستیابی اتنی زیادہ ہو چکی ہے کہ لوگ ان معلومات کی سچائی کو پرکھنے کی صلاحیت کھو بیٹھے ہیں۔ اس انتشار کی حالت میں غلط یا غیر مستند نظریات کو حقیقت سمجھا جانے لگا ہے، جس سے انسانی ذہن مزید الجھن کا شکار ہو گیا ہے۔ اسی طرح خود مختاری اور آزادی کے غلط تصور نے بھی جدید جہالت کو فروغ دیا ہے۔ آزادی کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ ذمہ داری اور حدود کے تصور کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں انفرادیت پسندی کے رجحانات بڑھ گئے ہیں، جہاں انسان اپنی خواہشات کو زندگی کا محور سمجھنے لگا ہے اور روایتی اخلاقیات و اقدار کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔

جدید دور کی جہالت کے ان نفسیاتی عوامل کا علاج شعور، آگاہی اور توازن کے اصولوں پر مبنی ہے۔ لوگوں میں تنقیدی سوچ کو فروغ دینا اور ان کی تہذیبی شناخت کو بحال کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ تعلیمی نظام اور میڈیا کو ایسے کردار میں ڈھالنے کی ضرورت ہے جو تحقیق، سوال کرنے اور علم کو سمجھنے کی حوصلہ افزائی کرے۔ افراد کو اس بات کی ترغیب دینا

ضروری ہے کہ وہ نہ تو اندھی تقلید کا شکار ہوں اور نہ ہی ہر نئی چیز کو قبول کرنے کی جلد بازی کریں۔ معاشرت میں ایسی فضا پیدا کرنا ہوگی جہاں ماضی اور حال کے درمیان ایک مثبت توازن قائم کیا جاسکے تا کہ معاشرہ ترقی، شعور اور اخلاقیات کے راستے پر گامزن ہوسکے۔

دوسروں کے پاس نعمتوں سے آنکھ بند کرلیں

ناشکری کا رویہ انسان کو اپنی زندگی میں موجود نعمتوں اور کامیابیوں کی قدر کرنے سے روک دیتا ہے۔ جب ہم اپنی زندگی کی برکتوں کو نظر انداز کرتے ہیں اور دوسروں کی کامیابیوں کو حسد یا شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، تو ہم اپنے دل و دماغ کو بے سکون اور بے چین کر لیتے ہیں۔ یہ رویہ انسان کے اندر عدم اطمینان پیدا کرتا ہے، کیونکہ وہ ہمیشہ دوسروں کے پاس جو کچھ ہے، اس کی آرزو کرتا رہتا ہے، اور اس کی نظر میں جو کچھ وہ خود کے پاس ہے، وہ کم یا ناکافی محسوس ہوتا ہے۔ نتیجتاً، انسان کی زندگی میں شکر گزاری کا فقدان ہو جاتا ہے، اور وہ ہمیشہ اس فکر میں ڈوبا رہتا ہے کہ اس کے پاس جو کچھ ہے، وہ کافی نہیں ہے۔

اسلامی تعلیمات میں ناشکری کو بہت منفی طور پر بیان کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا" :اگر تم شکر گزار رہو گے تو میں تمہیں مزید نعمتیں دوں گا، اور اگر تم ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بہت سخت ہے "(سورہ ابراہیم 14:7)۔ اس آیت میں اللہ کی طرف سے شکر گزاری کی اہمیت اور ناشکری کے نتائج کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ جب ہم اپنی نعمتوں کی قدر کرتے ہیں اور اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں، تو اللہ مزید برکتیں اور نعمتیں ہماری زندگی میں شامل کرتا ہے۔ لیکن اگر ہم ناشکری کرتے ہیں اور اپنی زندگی کی نعمتوں کو نظر انداز کرتے ہیں، تو اللہ کا عذاب یا مشکلات ہمارے راستے میں آسکتی ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے بھی فرمایا" :جو شخص اپنی نعمتوں پر شکر ادا کرتا ہے، اللہ اس کی زندگی میں مزید برکتیں ڈالتا ہے"۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ شکر گزاری نہ صرف ہمارے روحانی سکون کا سبب بنتی ہے، بلکہ یہ ہماری زندگی کو بہتر اور خوشحال بھی بناتی ہے۔ اگر ہم اپنے دل و دماغ میں شکر گزاری کی کیفیت پیدا کرتے ہیں، تو ہم اپنے آپ کو ذہنی سکون اور اطمینان کی حالت میں رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ، شکر گزاری انسان کو مثبت انداز میں زندگی گزارنے کی ترغیب دیتی ہے اور اسے اپنی موجودہ حالت میں خوشی محسوس کرنے کا موقع دیتی ہے۔

ناشکری کا ایک اور منفی پہلو یہ ہے کہ یہ انسان کے اندر احساس کمتری پیدا کرتا ہے۔ جب ہم ہمیشہ دوسروں کی کامیابیوں اور خوشیوں پر نظر رکھتے ہیں اور اپنی زندگی کے حالات کو کم تر سمجھتے ہیں، تو ہم اپنے اندر حسد اور افسوس کی کیفیت پیدا کر لیتے ہیں، جو ہمارے ذہن کو بے سکون اور پریشان کر دیتی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا" :جو شخص دوسروں کی کامیابیوں پر خوش ہوتا ہے، وہ اپنی زندگی میں سکون پاتا ہے"۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ دوسروں کی کامیابیوں پر خوش ہونا اور اپنی کامیابیوں کی قدر کرنا انسان کو سکون اور اطمینان کا احساس دلاتا ہے۔

اسلام میں ہمیں یہ سکھایا گیا ہے کہ ہمیں اللہ کی ہر نعمت کا شکر ادا کرنا چاہیے، چاہے وہ بڑی ہو یا چھوٹی۔ شکر گزاری کا عمل انسان کو اپنی زندگی کی برکتوں کی قدر سکھاتا ہے اور اسے ہر حال میں اللہ کے ساتھ تعلق مضبوط کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا" :تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو دوسروں کا شکر ادا کرے اور اللہ کا شکر ادا کرے"۔ اس حدیث میں شکر گزاری کی اہمیت اور اس کے روحانی فوائد کو بیان کیا گیا ہے۔

ناشکری سے بچنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں چھوٹی چھوٹی چیزوں کا شکر گزار ہوں۔ اپنے جسمانی صحت، گھر، خاندان، روزگار، اور ہر وہ چیز جس کی ہمیں ضرورت ہو، اس کا شکر ادا کرنا ضروری ہے۔ جب ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں، تو ہم خود کو خوشحال اور مطمئن محسوس کرتے ہیں، اور ہمارا دل اللہ کی رضا میں راضی رہتا ہے۔ اس کے علاوہ، ہم اپنی زندگی کے حالات میں بہتر تبدیلیاں دیکھنے لگتے ہیں۔

خود کو ناشکری سے بچانے کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے دل و دماغ میں ہمیشہ اللہ کی نعمتوں کی قدر کریں اور ان کے لیے شکر گزار ہوں۔ اگر ہمیں کسی چیز کی کمی محسوس ہو رہی ہو، تو ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ نے ہمیں جو کچھ دیا ہے، وہ ہمارے لیے کافی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا" :شکر کرنے والے کے دل میں کبھی کمی نہیں آتی، کیونکہ وہ ہمیشہ اللہ کی رضا میں خوش رہتا ہے"۔ اس قول کا مقصد یہ ہے کہ شکر گزار ہونے سے ہمارے دل میں اطمینان آتا ہے، اور ہم جو کچھ بھی رکھتے ہیں، اسے اللہ کی رضا سمجھ کر خوش رہتے ہیں۔

ناشکری کا رویہ انسان کی ذہنی سکون اور خوشی میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ اسلام میں شکر گزاری کی عادت ڈالنے سے نہ صرف انسان کی روحانی ترقی ہوتی ہے، بلکہ اس کی زندگی میں سکون، خوشی اور کامیابی آتی ہے۔

ناشکری کا رویہ نہ صرف روحانی سکون کو متاثر کرتا ہے بلکہ انسان کی ذاتی ترقی اور کامیابی میں بھی رکاوٹ بن سکتا ہے۔ جب انسان اپنی موجودہ حالت کو نظر انداز کرتا ہے اور ہمیشہ دوسرے لوگوں کی کامیابیوں کو دیکھ کر خود کو کمتر سمجھنے لگتا ہے، تو وہ اپنی صلاحیتوں اور موجودہ مواقع کی قدر نہیں کرتا۔ نتیجتاً، وہ اپنی محنت میں کمی کر دیتا ہے اور اپنی زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ضروری اقدامات نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ، ناشکری انسان کو حسد اور افسوس کی کیفیت میں مبتلا کرتا ہے، جس سے اس کی ذہنی سکونت میں خلل پڑتا ہے اور وہ دوسروں کی کامیابیوں کو اپنے لیے خطرہ سمجھنے لگتا ہے۔

اسلامی تعلیمات میں ناشکری کے خطرات کو واضح کیا گیا ہے اور انسانوں کو اپنی زندگی کی نعمتوں کی قدر کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا" :جو شخص اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہے، وہ اللہ کی رضا پاتا ہے اور اس کے لیے مزید نعمتوں کا دروازہ کھلتا ہے"۔ اس حدیث میں یہ بات ظاہر کی گئی ہے کہ شکر گزاری انسان کو نہ صرف اللہ کے قریب لاتی ہے بلکہ اللہ کی مزید نعمتوں کا سبب بنتی ہے۔ جب انسان اللہ کا شکر ادا کرتا ہے، تو وہ اس کی رضا کے راستے پر گامزن ہو جاتا ہے اور اللہ کی برکتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

ناشکری کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ یہ انسان کو دنیا کے معاملات میں بدگمانی کا شکار کر دیتا ہے۔ جب ہم اپنی موجودہ حالت پر اطمینان نہیں رکھتے اور دوسروں کی کامیابیاں ہمیں متاثر کرتی ہیں، تو ہم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں کمتر بنایا ہے۔ یہ فکریت انسان کی توانائیوں کو ضائع کر دیتی ہے اور وہ اپنی زندگی میں مثبت تبدیلی لانے کے بجائے منفی خیالات میں غرق رہتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا" :جو شخص اپنے حالات میں شکر گزار ہوتا ہے، وہ زندگی کے تمام پہلوؤں میں خوش رہتا ہے"۔ اس قول کا مقصد یہ ہے کہ شکر گزاری انسان کو نہ صرف روحانی سکون دیتی ہے بلکہ اس کے اندر خوشی اور اطمینان کی کیفیت پیدا کرتی ہے، جو کہ اس کی زندگی کے ہر شعبے پر اثر انداز ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ، ناشکری انسان کو نیک عمل کرنے کی ترغیب دینے سے بھی روک دیتی ہے۔ جب انسان اپنی کامیابیوں کی قدر نہیں کرتا، تو وہ دوسروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے میں بھی کمی کر دیتا ہے۔ اسلام میں ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی بہت اہمیت دی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ ہر حال میں احسان کرے۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا" :اللہ کی رضا میں جو شخص دوسروں کا حق ادا کرتا ہے، وہ اللہ کے نزدیک عزیز ہوتا ہے"۔اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ شکر گزاری نہ صرف ہماری روحانیت کو بہتر کرتی ہے، بلکہ یہ ہمارے اخلاقی رویوں کو بھی نکھارتی ہے۔

ناشکری سے بچنے کے لیے ایک اہم قدم یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی میں روزانہ کی بنیاد پر شکر گزاری کا عمل اپنائے۔ وہ دن بھر کی چھوٹی چھوٹی نعمتوں کا شکر ادا کرے، چاہے وہ اچھی صحت ہو، اچھے تعلقات ہوں یا زندگی کی معمولی کامیابیاں۔ جب انسان شکر گزاری کی عادت ڈال لیتا ہے، تو وہ ہر حال میں خوش رہتا ہے اور اپنی زندگی کی ہر نعمت کی قدر کرتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا" :شکر گزار دل میں سکون ہوتا ہے، کیونکہ وہ اللہ کی ہر نعمت کو اپنی زندگی میں محسوس کرتا ہے"۔

ایک اور مفید طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کے سخت اوقات میں بھی شکر گزار رہنے کی کوشش کرے۔ بہت بار زندگی میں مشکلات آتی ہیں، لیکن ان مشکلات کے باوجود اللہ کی رضا پر راضی رہنا اور ان حالات میں بھی اللہ کا شکر ادا کرنا انسان کی روح کو سکون اور تسلی دیتا ہے۔ اس سے انسان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اللہ کی حکمتیں اس کے بہتر لیے ہی ہوتی ہیں اور اس کی تقدیر میں جو کچھ بھی ہے، وہ اس کی بھلائی کے لیے ہے۔

اس طرح، ناشکری کی عادت سے بچنا اور شکر گزاری کو اپنی زندگی کا حصہ بنانا انسان کی روحانی، ذہنی، اور جسمانی سکون کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ اسلامی تعلیمات اور حضرت علی علیہ السلام کی حکمتوں کی روشنی میں، ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ جو شخص اللہ کا شکر ادا کرتا ہے، وہ نہ صرف روحانی طور پر بہتر ہوتا ہے، بلکہ اس کی زندگی میں خوشی، سکون اور کامیابی آتی ہے۔

"لوگ کیا کہیں گے" کے خوف سے باہر آئیں

رائے کے خوف میں جینا (Fear of Judgment) ایک ایسی ذہنی حالت ہے جس میں انسان اپنی اصل شخصیت یا خیالات کو اس خوف سے چھپاتا ہے کہ دوسرا شخص کیا سوچے گا یا کہے گا۔ یہ خوف انسان کی آزادی اور انفرادیت کو محدود کرتا ہے اور وہ اپنے آپ کو دوسروں کے معیارات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے، خواہ وہ معیارات درست ہوں یا نہ ہوں۔ اس حالت میں انسان اپنی فطری صلاحیتوں اور خوبیوں کو ظاہر کرنے سے کتراتا ہے، کیونکہ وہ اس بات سے ڈرتا ہے کہ کہیں لوگ اسے تنقید کا نشانہ نہ بنا دیں۔

یہ خوف انسان کے اندر عدم تحفظ اور خود اعتمادی کی کمی پیدا کرتا ہے، اور وہ مسلسل دوسروں کی توثیق کی تلاش میں رہتا ہے۔ جب انسان دوسروں کے بارے میں زیادہ سوچنے لگتا ہے، تو وہ اپنے فیصلے کرنے میں آزاد نہیں رہتا، بلکہ وہ ہمیشہ دوسروں کی رائے کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی حقیقت کو چھپاتا ہے اور کبھی بھی اپنی زندگی کو اپنی مرضی کے مطابق نہیں گزار پاتا۔

اسلام میں ہمیں اپنی انفرادیت اور خودی کو تسلیم کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو ایک خاص مقصد کے لیے پیدا کیا ہے اور اس کی اپنی خصوصیات، صلاحیتیں اور

شخصیت کو منفرد بنایا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا" :اور ہم نے تمہیں مختلف اقوام اور قبیلوں میں تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو "(سورہ الحجرات، 49:13)۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ ہمیں بتارہے ہیں کہ ہماراانفرادیت کے ساتھ ہونا اللہ کی حکمت کا حصہ ہے اور ہمیں اپنی اصل شخصیت کو تسلیم کرنا چاہیے، نہ کہ دوسروں کی رائے کے مطابق خود کو ڈھالنا۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا" :جو شخص اپنی حقیقت کو چھپاتا ہے، وہ اپنی آزادی کھو دیتا ہے "۔اس قول میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ جب انسان اپنے اصل رنگ کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے، تو وہ اپنی ذہنی اور روحانی آزادی سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کے بجائے، جب انسان اپنی انفرادیت کو تسلیم کرتا ہے اور اس پر فخر کرتا ہے، تو وہ حقیقی آزادی حاصل کرتا ہے، جو اسے دوسروں کی رائے سے آزاد کرتی ہے۔

رائے کے خوف میں جینا انسان کو اس کے حقیقی مقصد سے بھی دور کر دیتا ہے۔ اگر ہم مسلسل دوسروں کی رائے کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کریں، تو ہم اپنے اس مقصد کو بھول سکتے ہیں جس کے لیے ہمیں اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ اللہ کا حکم یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کو اس کی رضا کی طرف مائل کریں، اور دوسروں کی رائے کو اپنی زندگی کی رہنمائی نہ بننے دیں۔

یہ خوف انسان کی روحانیت کو بھی متاثر کرتا ہے۔ جب ہم اپنے حقیقی خود کو چھپاتے ہیں، تو ہم اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کو بھی کمزور کر لیتے ہیں۔ اللہ نے ہمیں اپنی زندگی کے راستے پر

چلنے کی آزادی دی ہے، اور ہمیں اس آزادی کا احترام کرنا چاہیے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا" : جب تک انسان اپنے اصولوں پر قائم رہتا ہے، وہ کسی بھی طرح کے خوف یا تنقید سے متاثر نہیں ہوتا"۔ امام حسین علیہ السلام کا یہ قول ہمیں بتاتا ہے کہ ہمیں اپنے اصولوں اور حقیقت کو پہچان کر اس پر قائم رہنا چاہیے، خواہ دنیا میں ہمیں کسی کی رائے سے متاثر ہونے کا سامنا ہو۔

رائے کے خوف میں جینا انسان کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو استعمال کرنے سے روکتا ہے۔ وہ ہمیشہ اس خوف میں رہتا ہے کہ اگر اس نے اپنے خیالات کو ظاہر کیا تو کہیں اس کی تنقید نہ ہو جائے۔ اس سے نہ صرف انسان کی ذاتی ترقی رک جاتی ہے بلکہ اس کی معاشرتی اور پیشہ ورانہ کامیابی میں بھی رکاوٹ آتی ہے۔ اس کے برعکس، جب انسان اپنی انفرادیت کو تسلیم کرتا ہے اور اپنے آپ کو اظہار کرنے کی آزادی دیتا ہے، تو وہ نہ صرف اپنے خوابوں کو حقیقت بنا سکتا ہے بلکہ وہ دوسروں کے لیے بھی ایک حوصلہ افزائی کا ذریعہ بنتا ہے۔

رائے کے خوف میں جینا (Fear of Judgment) ایک پیچیدہ نفسیاتی حالت ہے جو انسان کو مسلسل اپنی ذات اور خیالات پر تنقید کا خوف محسوس کرنے کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ خوف انسان کی ذاتی ترقی اور سکون میں رکاوٹ بن سکتا ہے، کیونکہ وہ ہمیشہ دوسروں کی منظوری اور توثیق کی تلاش میں رہتا ہے۔ جب ہم اپنی زندگی کو دوسروں کی رائے کے مطابق ڈھالتے ہیں، تو ہم اپنی فطری صلاحیتوں اور خوابوں کو دبا دیتے ہیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی حقیقت کو پہچاننے میں ناکام رہتے ہیں۔

اسلام میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ انسان کو اپنی حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے اور اپنی زندگی کو اللہ کی رضا کے مطابق گزارنا چاہیے، نہ کہ دوسروں کی رائے کے مطابق۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا" :اللہ تمہارے دلوں کو جانتا ہے، تمہارے اعمال کو جانتا ہے "(سورہ آل عمران، 3:154)۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ ہمیں بتا رہے ہیں کہ ہماری اصلیت اور ہماری کوششوں کو وہ خود جانتے ہیں، اور ہمیں اپنے فیصلوں میں صرف اس کی رضا کی فکر کرنی چاہیے، نہ کہ لوگوں کی رائے کی۔

رائے کے خوف میں جینا ایک قسم کی ذہنی قید ہے، جو انسان کو اپنی تقدیر کے فیصلوں میں آزاد نہیں رہنے دیتی۔ انسان جب یہ سوچتا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے، تو وہ اپنے مقاصد اور خواہشات کو قربان کر دیتا ہے۔ اس کی زندگی دوسروں کی مرضی اور رائے کے تابع ہو جاتی ہے، اور وہ کبھی بھی اپنے خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کی کوشش نہیں کرتا۔ حضرت علی علیہ السلام کا ایک قول ہے" :جو شخص دوسروں کی رائے سے ڈرتا ہے، وہ اپنی زندگی کی حقیقت سے دور ہو جاتا ہے"۔ اس قول سے یہ سبق ملتا ہے کہ جب ہم دوسروں کی رائے کے خوف میں جیتے ہیں، تو ہم اپنے حقیقت سے غافل ہو جاتے ہیں۔

رائے کے خوف سے بچنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے اپنے آپ کو پہچاننا ضروری ہے۔ جب ہم اپنی انفرادیت اور صلاحیتوں کو سمجھتے ہیں اور اپنی زندگی کے مقصد کو اللہ کی رضا میں تلاش کرتے ہیں، تو ہم دوسروں کی رائے سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم لوگوں کی رائے کو اہمیت نہیں دیتے، بلکہ ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ دوسروں کی رائے ہماری

حقیقت یا ہماری قدر کا تعین نہیں کرتی۔ حضرت امام علی علیہ السلام نے فرمایا" : انسان کی عزت اس کے کردار میں ہے، نہ کہ دوسروں کی رائے میں "۔ جب ہم اپنے کردار کو مضبوط اور صاف ستھرا رکھتے ہیں، تو ہم کسی کی رائے سے متاثر نہیں ہوتے۔

رائے کے خوف سے نکلنے کا ایک اہم طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو اللہ کی رضا اور اپنی ذاتی اقدار کے مطابق زندگی گزارنے کا عہد کریں۔ جب ہم اپنی زندگی کے فیصلوں میں اللہ کی ہدایت اور اپنی فطرت کو اہمیت دیتے ہیں، تو ہم اپنے آپ میں مکمل اعتماد محسوس کرتے ہیں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنی کربلا کی تحریک کے ذریعے ہمیں سکھایا کہ صحیح راستے پر چلنا، خواہ اس کی قیمت کتنی ہی بڑی ہو، ہمیشہ بہتر ہے۔ امام حسین علیہ السلام کا یہ قول ہے" : ہمیں اپنی زندگی میں صحیح راستے کو اختیار کرنے کی جرات ہونی چاہیے، چاہے لوگ کچھ بھی کہیں"۔

دوسری طرف، رائے کے خوف سے بچنے کے لیے ہمیں خود پر یقین اور اعتماد پیدا کرنا ہو گا۔ جب ہم اپنے اندرونی خوف اور شکوں پر قابو پاتے ہیں، تو ہم دوسروں کی رائے کو اپنے فیصلوں پر حاوی نہیں ہونے دیتے۔ ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر انسان کا اپنا سفر اور تجربہ ہوتا ہے، اور جو کچھ دوسرے لوگ ہمارے بارے میں سوچتے ہیں، وہ ہمارے ذاتی تجربات یا حقیقت کی عکاسی نہیں کرتا۔ ہم اپنی زندگی کے مالک ہیں اور ہمیں اس بات کا حق ہے کہ ہم اپنے فیصلے خود کریں، جب تک کہ وہ اللہ کی رضا اور اخلاقی اصولوں کے مطابق ہوں۔

لہٰذا، رائے کے خوف میں جینا انسان کی ترقی اور سکون میں رکاوٹ بنتا ہے، اور ہمیں اس سے باہر نکلنے کے لیے اپنی حقیقت کو تسلیم کرنا ہو گا۔ اپنی انفرادیت کو تسلیم کریں، اپنی زندگی کو اللہ کی رضا کی طرف مائل کریں، اور دوسروں کی رائے کو اپنے فیصلوں پر حاوی نہ ہونے دیں۔ جب ہم یہ سمجھیں گے کہ ہماری قیمت اللہ کی نظر میں ہے اور نہ کہ لوگوں کی رائے میں، تو ہم حقیقی سکون اور آزادی حاصل کر سکیں گے۔ ہمیں اپنے خوف کو شکست دینے کی ضرورت ہے اور اپنی اصل شخصیت کو تسلیم کرنا چاہیے۔ دوسروں کی رائے کو اپنی زندگی پر حاوی نہ ہونے دیں، بلکہ اپنی انفرادیت کو قبول کریں اور اللہ کی رضا کے مطابق اپنی زندگی گزاریں۔ جب ہم اپنی حقیقت کو تسلیم کریں گے، تو ہمیں نہ صرف داخلی سکون حاصل ہو گا بلکہ ہم اپنے مقصد کی طرف بھی آسانی سے بڑھ سکیں گے۔

دینی قیادت اور دنیاوی اسباب کی فراہمی

دینی قیادتوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ملت کی روحانی ضروریات کے ساتھ ساتھ ان کی مادّی ضروریات کو بھی پورا کرنے کے لیے ایک جامع اور مؤثر نظام تشکیل دیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ عوام اپنی دینی اور دنیاوی ضروریات کے لیے ایک ہی قیادت کی طرف رجوع کریں، تاکہ وہ کسی تضاد کا شکار نہ ہوں اور نہ ہی انہیں اپنی مادی ضروریات پوری کرنے کے لیے سیکیولر یا سوشلسٹ قوتوں کی طرف دیکھنا پڑے۔ اس امر کی اہمیت اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے جب دینی راہنما یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ دین اسلام دنیا اور آخرت دونوں کی تکمیل کے لیے آیا ہے۔ اگر دین کا یہ دعویٰ حقیقت پر مبنی ہے تو دینی سیاست دانوں کی یہ اخلاقی اور شرعی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ نہ صرف عوام کی اخروی فلاح کے لیے اقدامات کریں بلکہ ان کے دنیاوی اسباب ووسائل زندگی کے حوالے سے بھی ایک ٹھوس اور جامع لائحہ عمل ترتیب دیں۔

ایک ایسی سیاست جو دین کے ان دونوں پہلوؤں کو اپنی بنیاد بناتی ہو، درحقیقت جامع دین کی علامت ہے۔ اس طرح کا نظام عوام کے اعتماد کو مضبوط بناتا ہے اور انہیں یہ باور کراتا ہے کہ دین ان کی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ وہ مثالی قیادت ہے جو لوگوں کی دینی و روحانی تربیت کے ساتھ ساتھ ان کے سماجی، معاشی اور مادی مسائل کو حل کرنے کی بھی

صلاحیت رکھتی ہو۔ ایسی قیادت نہ صرف عوام کی زندگی میں ہم آہنگی اور توازن پیدا کرتی ہے بلکہ انہیں ایک ایسے معاشرے کی تشکیل میں مدد دیتی ہے جو دین و دنیا کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا ہو۔

جب دین اپنی جامعیت کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ روحانی اور اخروی فلاح کے ساتھ ساتھ دنیاوی زندگی کے ضروری اسباب کی فراہمی کو بھی یقینی بنایا جائے۔ دینی قیادتوں پر لازم ہے کہ وہ انسان کی روحانی تکمیل کے ساتھ اس کی دنیاوی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے عملی اقدامات کریں۔ ایک عام انسان کے لیے روحانی حقائق کا ادراک اس وقت آسان ہوتا ہے جب اس کے بنیادی مادی مسائل حل ہو چکے ہوں۔ بھوک، غربت، اور بنیادی ضروریات کی عدم دستیابی انسانی سوچ کو محدود اور الجھنوں میں ڈال دیتی ہے، اور ایسے حالات میں دین کی تعلیمات کو سمجھنا اور اپنانا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک متوازن معاشرتی نظام کے لیے ضروری ہے کہ دینی قیادتیں دنیاوی اسباب کی فراہمی کو اپنی ترجیحات میں شامل کریں۔

اگرچہ ایک انقلابی طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ مکمل طور پر موجودہ نظام کو تبدیل کیا جائے اور ایک نیا نظام تشکیل دیا جائے جو دین اور دنیا دونوں کے تقاضوں کو پورا کرے، لیکن جمہوری نظام میں اس کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ موجودہ مقتدر قوتوں پر دباؤ ڈالا جائے تاکہ وہ عوامی فلاح و بہبود کے لیے ضروری اقدامات کریں۔ اس طرح کا جمہوری طریقہ دینی

قیادتوں کو موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ بتدریج اپنے مقاصد حاصل کریں اور موجودہ نظام میں رہتے ہوئے عوام کی دنیاوی ضروریات اور روحانی ترقی کے لیے خدمات انجام دیں۔

دین اسلام کو دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی کے لیے ایک مکمل ضابطہ حیات قرار دیا گیا ہے، اور یہی اس کی انفرادیت ہے۔ یہ نہ صرف روحانی زندگی کے کمال کا وسیلہ فراہم کرتا ہے بلکہ دنیاوی اسباب کو بھی ان مقاصد کے حصول کا ذریعہ بناتا ہے۔ جب دینی قیادتیں اپنی ذمہ داریوں کو سمجھ کر ان پر عمل پیرا ہوتی ہیں تو ایک ایسا نظام تشکیل پاتا ہے جو دنیاوی زندگی کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے ساتھ انسانوں کو اخروی فلاح کی جانب بھی رہنمائی کرتا ہے۔ اس طرح دین کی جامعیت کا عملی مظاہرہ ہوتا ہے اور عوام میں دین کے حقیقی مقاصد کا شعور اجاگر ہوتا ہے۔

دینی قیادتوں کی ذمہ داری صرف مذہبی اعمال کی ادائیگی اور مذہبی احکامات کی تلقین تک محدود نہیں رہتی بلکہ ان کا فرض اس سے کہیں زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ ایک حقیقی دینی قیادت وہی ہو سکتی ہے جو عوام کی دنیاوی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنی رہنمائی کا حصہ بنائے۔ عوام کی بنیادی ضروریات جیسے روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم، صحت، اور انفراسٹرکچر جیسے سڑکیں، بجلی، پانی، گیس، اور دیگر وسائل زندگی کی فراہمی کو یقینی بنانا دینی قیادتوں کی اولین ترجیحات میں شامل ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر روحانیت اور مذہبیت کو فروغ دینا ایک دشوار کام ہے، کیونکہ مادی پریشانیوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے افراد کے لیے روحانی ترقی ایک دور کی بات بن جاتی ہے۔

دینی قیادتوں کو یاتو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر ایک ایسا نظام قائم کریں جو حقیقی اسلامی اصولوں پر مبنی ہو اور عوام کی تمام مادی و روحانی ضروریات کو پورا کر سکے، یا پھر موجودہ کرپٹ اور نااہل حکمرانوں کو مجبور کریں کہ وہ اپنے فرائض کو بخوبی انجام دیں۔ یہ قیادت عوام کے دکھوں اور مسائل کو محسوس کرے، ان کے حل کے لیے عملی اقدامات کرے، اور ایک ایسا معاشرہ تشکیل دے جہاں عدل و انصاف ہو، اور ہر شخص کو اس کی بنیادی ضروریات آسانی سے میسر ہوں۔

جب تک عوام کو ان کی مادی ضروریات کی تکمیل کے لیے ایک مؤثر نظام نہیں ملتا، دین کے اعلیٰ اور پاکیزہ اصولوں کا حقیقی فروغ ممکن نہیں ہو گا۔ بھوک اور غربت کے مارے ہوئے افراد سے یہ توقع رکھنا کہ وہ عبادات کے اعلیٰ مدارج تک پہنچیں یا دینی تعلیمات کو اپنی زندگی میں نافذ کریں، غیر حقیقت پسندانہ ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک جامع دینی قیادت وہی ہو گی جو دنیاوی اور اخروی فلاح کے درمیان ایک توازن قائم کرے اور عوام کے لیے ایسا ماحول فراہم کرے جہاں وہ نہ صرف اپنی دنیاوی زندگی کو بہتر بنا سکیں بلکہ اپنی روحانی ترقی کی منازل بھی طے کر سکیں۔ ایسی قیادت ہی حقیقی طور پر اسلامی معاشرے کے قیام کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

دینی قیادتوں کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ نہ صرف عوام کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لیے اقدامات کریں بلکہ ایسے نظام قائم کریں جو امت کو کرپٹ حکمرانوں کے تسلط سے آزاد کر سکیں اور انہیں خود کفیل بنائیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ تمام

مذاہب کی قیادتیں باہمی رابطے اور اتحاد کو فروغ دیں اور اجتماعی طور پر ایسے عملی اقدامات کریں جو عوام کی زندگی میں حقیقی تبدیلی لانے کا ذریعہ بنیں۔ ان قیادتوں کو اپنی اپیل اور ایما پر ایسے افراد کو متحرک کرنا ہوگا جو صاحبِ ثروت ہوں اور اپنی ملت کا درد رکھتے ہوں۔ یہ افراد نان کمرشل ادارے قائم کرکے عوام کی بنیادی ضروریات پوری کرنے میں اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔

یہ نان کمرشل ادارے مختلف شعبوں میں قائم کیے جاسکتے ہیں، جیسے قرضہ الحسنہ بینک، جو بغیر سود کے قرضے فراہم کریں، تاکہ ضرورت مند افراد اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے مالی امداد حاصل کرسکیں۔ نان کمرشل تعلیمی ادارے وہ ہوں جو معیاری تعلیم فراہم کریں لیکن تجارتی مقاصد سے پاک ہوں، تاکہ ہر طبقے کے افراد علم کی روشنی سے مستفید ہو سکیں۔ اسی طرح، نان کمرشل ووکیشنل ٹریننگ سینٹرز ہنر سکھانے کے لیے کام کریں تاکہ افراد اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں اور خود کفالت حاصل کریں۔ نان کمرشل صحت عامہ کے ادارے ایسے مراکز ہوں جو عوام کو معیاری طبی سہولیات فراہم کریں، چاہے وہ مفت ہوں یا انتہائی کم لاگت پر دستیاب ہوں۔

اس کے علاوہ، نان کمرشل ذرائع ابلاغ کے ادارے بنائے جائیں جو عوام کو دینی اور سماجی شعور فراہم کریں اور اخلاقی اقدار کے فروغ میں کردار ادا کریں۔ مذہبی عدالتوں کا قیام بھی اہم ہے تاکہ عدل و انصاف کے اصولوں پر مبنی فیصلے کیے جاسکیں۔ نان کمرشل سیکیورٹی ادارے معاشرے کی حفاظت اور امن و امان کے قیام کے لیے کام کریں، جبکہ نان کمرشل

تفریحی مقامات عوام کے لیے صحت مند تفریح کے مواقع فراہم کریں۔ نان کمرشل میونسپلٹی کے ادارے اور انرجی سپلائی کے ادارے عوام کو بنیادی خدمات فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں، جیسے صاف پانی، بجلی، گیس، اور صفائی کے انتظامات۔

ان تمام اداروں کے قیام سے امت ایک مضبوط، خود کفیل اور متوازن معاشرہ تشکیل دے سکے گی، جو اپنی ضروریات کو اپنے وسائل سے پورا کر سکے گا۔ یہ نظام امت کو کرپٹ حکمرانوں کے تسلط سے آزاد کر کے ایک ایسی معاشرت کی طرف گامزن کرے گا جہاں عوام کی دنیاوی اور روحانی ضروریات کا مکمل طور پر احاطہ کیا جا سکے۔ اس طرح ایک حقیقی اسلامی معاشرہ وجود میں آئے گا جو اپنے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے دنیا کے لیے ایک مثال بن سکے گا۔

ذہین ہونے کے نقصانات

بچپن میں "ذہین بچہ" کہلائے جانے نے مجھے ایک طرح سے جلد ہار ماننے والا بنا دیا۔ ہم میں سے بہت سے لوگ ناکامی کو اچھی طرح برداشت نہیں کر پاتے کیونکہ ہم ذہین ہیں اور زیادہ تر چیزیں آسانی سے سمجھ آجاتی ہیں۔ لیکن جب کوئی کام توقع سے زیادہ مشکل ہو یا آپ اسے جلدی نہ سمجھ سکیں، تو یہ تسلیم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ شاید اس بار آپ اتنے ذہین نہیں ہیں۔

ذہین ہونے کی وجہ سے محنت کم کرنے کی عادت بن جاتی ہے۔ جب آپ کی پوری زندگی یہی سنا ہو کہ آپ ذہین ہیں اور زیادہ تر وقت سخت محنت کی ضرورت نہ ہو، تو جب کبھی محنت درکار ہو، تو آپ اسے برداشت نہیں کر پاتے اور ناکام ہو جاتے ہیں۔

کم ذہین لوگوں کے ساتھ معاملات کرنا بھی ایک چیلنج ہے۔ اردگرد موجود کچھ کم عقل لوگوں کو چیزیں سمجھانا یا انہیں وسیع تر تصویر دکھانا بعض اوقات سب سے زیادہ مایوس کن اور وقت ضائع کرنے والا عمل بن جاتا ہے۔

ذہانت کی وجہ سے والدین اکثر یہ سمجھتے ہیں کہ آپ خود ہی سب کچھ سمجھ لیں گے اور مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم جماعت بھی لاپرواہ ہوتے ہیں کیونکہ آپ ذہین سمجھے جاتے ہیں اور سب کے جواب آپ کے پاس ہونے کا گمان کیا جاتا ہے۔ جب آپ کو واقعی مدد کی ضرورت

ہو، تو یہ صورت حال بہت مشکل بن جاتی ہے۔ بطور نوجوان، یہ مایوسی آج بھی میرے ساتھ ہے اور جب چیزیں جلدی نہ جڑیں، تو ہار ماننے کی ذہنیت پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔

کیا اعلیٰ ذہانت بد قسمتی ہو سکتی ہے؟ اگر جہالت خوشی ہے، تو ذہین لوگوں کو معاشرے میں ایک اجنبی کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ ذاتی اور پیشہ ورانہ زندگی میں کئی مواقع پر آپ خود کو مناسب محسوس نہیں کرتے۔ بہت سی تحقیقات یہ بتاتی ہیں کہ ذہانت اکثر خوشی کے راستے میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔

ذہین لوگوں پر ہمیشہ دوسروں کی توقعات پر پورا اترنے کا بوجھ ہوتا ہے، لیکن سب سے زیادہ، اپنے ہی معیار پر پورا اترنے کا دباؤ ہوتا ہے۔ اگر وہ ناکام ہو جائیں، تو ان کا خود پر اعتماد ختم ہو جاتا ہے، اور تنہائی کے ساتھ بار بار کی ناکامیاں ذہنی صحت کے مسائل پیدا کر سکتی ہیں۔ جیسا کہ ارنسٹ ہیمنگوے نے لکھا ہے: "ذہین لوگوں میں خوشی سب سے نایاب چیز ہے۔"

ایک ذہین دیندار شخص اس مسئلے سے بچنے کے لیے اپنی ذہانت کو عاجزی اور استقامت کے ساتھ ہم آہنگ کرتا ہے۔ جب کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ علم اور فہم اللہ کی عطا ہے، تو وہ اپنی ذہانت پر غرور کرنے کے بجائے اسے ایک امانت سمجھتا ہے اور مسلسل سیکھنے اور بہتر ہونے کی جستجو میں رہتا ہے۔

دین سکھاتا ہے کہ اصل معیار تقویٰ اور اخلاص ہے، نہ کہ صرف ذہانت۔ ایک ذہین دیندار جب کسی مشکل کا سامنا کرتا ہے اور اسے فوری طور پر کوئی چیز سمجھ نہیں آتی، تو وہ اسے اپنی کمزوری نہیں بلکہ سیکھنے کا ایک موقع سمجھتا ہے۔ وہ ناکامی سے مایوس نہیں ہوتا، بلکہ اسے اللہ کی حکمت کا ایک حصہ مان کر صبر اور محنت کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔

دینداری کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ شخص اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کو صرف اپنی کاوشوں کا نتیجہ نہیں سمجھتا، بلکہ وہ جانتا ہے کہ ہر چیز اللہ کی مشیّت سے ہوتی ہے۔ یہ سوچ اسے دوسروں کی توقعات اور اپنی خود ساختہ پریشانیوں کے بوجھ سے آزاد کرتی ہے۔ وہ لوگوں کی رائے سے زیادہ اللہ کی رضا کو اہمیت دیتا ہے اور اپنی ذہانت کو لوگوں پر برتری جتانے کے بجائے ان کی خدمت اور ہدایت کے لیے استعمال کرتا ہے۔

ایک ذہین دیندار اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ ہر کسی کی عقل اور صلاحیت مختلف ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کے ساتھ نرمی اور حکمت سے پیش آتا ہے اور انہیں سمجھانے میں صبر سے کام لیتا ہے۔ اس کا مقصد صرف اپنی ذہانت ثابت کرنا نہیں بلکہ دوسروں کی مدد کرنا اور ان کی فکری ترقی میں کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔

دین سکھاتا ہے کہ حقیقی خوشی دنیاوی کامیابیوں میں نہیں بلکہ اللہ کے قرب میں ہے۔ جب ایک ذہین شخص دین کے مطابق اپنی زندگی گزارنے کی کوشش کرتا ہے، تو وہ دنیاوی ناکامیوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا اور ان سے مایوس نہیں ہوتا۔ وہ اپنے ذہن کو صرف

مسائل کے تجزیے اور فکر میں الجھانے کے بجائے اللہ کی یاد، دعا اور ذکر کے ذریعے سکون حاصل کرتا ہے۔

یہ رویہ اسے ذہانت کے تکبر، مایوسی اور تنہائی سے محفوظ رکھتا ہے۔ وہ اپنے علم کو ایک ذمہ داری سمجھتا ہے، اپنی ذہانت کو اللہ کے دین کی خدمت کے لیے استعمال کرتا ہے، اور اپنی ذہنی صلاحیت کو عاجزی، صبر اور قناعت کے ذریعے متوازن رکھتا ہے۔

سامراج اور صحت عامہ کے مسائل

یہ ایک موضوع ہے جس پر مختلف نظریات اور تجزیے موجود ہیں، اور سامراجی طاقتوں اور بگ فارما انڈسٹری کے کردار پر بڑے پیمانے پر بحث جاری ہے۔ بعض ماہرین اور محققین کے مطابق، سامراجی طاقتیں، جو بڑی اقتصادی اور سیاسی قوتیں ہوتی ہیں، بعض اوقات صحت کے مسائل اور بیماریوں کو اپنے مفادات کے مطابق پھیلانے، روکنے یا غلط معلومات پھیلانے میں شامل ہو سکتی ہیں۔

بگ فارما کمپنیاں بعض اوقات دواؤں کی غیر ضروری فراہمی اور مصنوعی مانگ پیدا کرنے کے لیے بیماریوں کی تشخیص کو مبالغہ آمیز انداز میں پیش کرتی ہیں یا ایسی بیماریوں کی تشہیر کرتی ہیں جن کے بارے میں تحقیق یا علاج مکمل نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد مارکیٹ میں اپنی مصنوعات کی مانگ بڑھانا اور منافع حاصل کرنا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، شوگر اور کولیسٹرول جیسے مسائل پر مبالغہ آرائی اسی تناظر میں دیکھی جاتی ہے۔

کچھ ادویات اس طرح بنائی جاتی ہیں کہ مریض کو ان کا مسلسل استعمال کرنا پڑے، تاکہ وہ ان کا عادی ہو جائے۔ مثال کے طور پر، اینٹی ڈپریسنٹ، انسومینا اور دیگر نفسیاتی امراض کے

علاج میں استعمال ہونے والی دوائیں کئی بار اس طرح تیار کی جاتی ہیں کہ مریض ان سے مکمل طور پر نجات نہ پا سکے اور دوبارہ دوائیں خریدنے پر مجبور ہو۔

میڈیا اور بگ فارما کے درمیان اشتہارات اور فنڈنگ کے تعلقات کی وجہ سے بعض اوقات میڈیا کے ذریعے خوف پھیلایا جاتا ہے کہ کسی خاص بیماری کا پھیلاؤ بڑھ گیا ہے۔ اس کا حل بگ فارما کی جانب سے دی جانے والی دواؤں میں دکھایا جاتا ہے، اور مصنوعی طور پر بیماریوں کو بڑا مسئلہ بنا کر دواؤں کی فروخت میں اضافہ کیا جاتا ہے۔

سامراجی طاقتیں میڈیکل تحقیق پر اثر انداز ہوتی ہیں اور تحقیق کی فنڈنگ کا زیادہ تر حصہ بگ فارما کے زیر اثر ہوتا ہے۔ ان کمپنیوں کا مقصد اپنے مفادات کو پورا کرنا ہوتا ہے، اور بعض اوقات بیماریوں کے اعداد و شمار کو مبالغہ آمیز انداز میں پیش کیا جاتا ہے یا علاج کے ممکنہ نقصانات کو چھپایا جاتا ہے۔

سامراجی نظام کے تحت امیر اور غریب ممالک کے درمیان صحت کی سہولتوں میں بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں صحت کے بنیادی ڈھانچے کی کمی کا فائدہ اٹھا کر بگ فارما اپنی ادویات بڑی مقدار میں فروخت کرتی ہے۔ اس طرح صحت کے مسائل کا مکمل حل فراہم کرنے کے بجائے ایسی ادویات فراہم کی جاتی ہیں جو وقتی آرام تو دے سکتی ہیں، لیکن بیماری جڑ سے ختم نہیں ہو پاتی۔

بگ فارما کمپنیاں ایسی بیماریوں کو فروغ دینے میں ملوث سمجھی جاتی ہیں جن کے علاج میں طویل مدت درکار ہو، جیسے کینسر، ایڈز، اور ڈیمنشیا۔ یہ بیماریاں طویل علاج کی متقاضی ہوتی ہیں، اور ان کے علاج میں مسلسل دوائیں درکار ہوتی ہیں، جس سے کمپنیاں غیر ضروری طور پر منافع کماتی ہیں۔

جینیاتی انجینئرنگ اور بائیو ٹیکنالوجی کے ذریعے ایسی دوائیں یا طریقے تیار کیے جاتے ہیں جو انسانی جینوم میں مداخلت کر کے بیماریوں کو قابو کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن بعض محققین کا کہنا ہے کہ یہ ٹیکنالوجی قدرتی طریقے سے بیماریوں کے خاتمے کے بجائے منافع کمانے اور لوگوں کی جینیاتی معلومات کو تجارتی مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہے۔

کئی بار ایسی بیماریوں کے لیے ویکسینز متعارف کروائی جاتی ہیں جن کے بارے میں حقیقتاً کم شواہد موجود ہوتے ہیں کہ وہ سنگین نوعیت کی ہیں۔ میڈیا میں ایسی خبریں چلائی جاتی ہیں جن سے لوگوں میں خوف پیدا کیا جاتا ہے، اور وہ غیر ضروری ویکسینز لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

بگ فارما کمپنیاں میڈیکل کالجز اور تعلیمی اداروں کو فنڈنگ فراہم کرتی ہیں، جس کے نتیجے میں طبی تعلیم میں ان کے نظریات اور مصنوعات کو ترجیح دی جاتی ہے۔ طلباء کو مخصوص ادویات یا علاج کے طریقے پڑھائے جاتے ہیں، جو بگ فارما کے مالی مفادات میں ہوتے ہیں، جبکہ قدرتی اور سستے علاج کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

بگ فارما انڈسٹری طبی اصولوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے فوائد کے لیے مختلف قسم کے تجربات کرتی ہے، جس سے مریضوں کی صحت اور اخلاقیات کو نقصان پہنچتا ہے۔ مختلف بیماریوں کی تشخیص کے نئے طریقے ایجاد کیے جاتے ہیں تاکہ مزید دوائیں بیچی جاسکیں، جبکہ اخلاقی اصولوں کی پابندی نہیں کی جاتی۔

ڈیجیٹل ہیلتھ مانیٹرنگ کے آلات، جیسے اسمارٹ واچز اور موبائل ایپلی کیشنز، کے ذریعے صحت کا ڈیٹا اکٹھا کر کے کمپنیوں کو فراہم کیا جاتا ہے۔ اس ڈیٹا کے ذریعے کمپنیوں کو مریضوں کی ضروریات کا اندازہ ہو جاتا ہے اور وہ ایسی دوائیں یا مصنوعات لانچ کرتی ہیں جن کی مارکیٹ میں طلب پیدا ہو۔ اس عمل سے مریضوں کی پرائیویسی متاثر ہوتی ہے۔ بعض بیماریوں کی پرانی تشریحات کو نئی بیماریوں کے طور پر پیش کر کے نئی دوائیں متعارف کروائی جاتی ہیں۔ اس عمل کو ری لیبلنگ یا ری برینڈنگ کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، بعض نفسیاتی مسائل کو مختلف نام دے کر علاج کے نئے طریقے متعارف کرائے جاتے ہیں تاکہ بگ فارما کو مزید منافع حاصل ہو۔

سامراجی طاقتیں اور بگ فارما عالمی ادارہ صحت جیسے بین الاقوامی اداروں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ان اداروں کی سفارشات اور ہدایات میں ان کمپنیوں کے مفادات کو مدنظر رکھا جاتا ہے، جس سے کئی ممالک میں بیماریوں کا مؤثر طریقے سے مقابلہ نہیں ہو پاتا۔ بگ فارما کمپنیاں اکثر ایسی تحقیقی رپورٹس تیار کرتی ہیں جو ان کے منافع کے لیے فائدہ مند ہوتی ہیں،

اور منفی نتائج کو دبا دیا جاتا ہے۔ اس سے میڈیکل کمیونٹی اور عوام میں غلط فہمی پیدا ہوتی ہے، اور مریض غیر ضروری علاج کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔

کچھ بڑی کمپنیاں جان بوجھ کر خوراک میں ایسی کیمیائی اشیاء شامل کرتی ہیں جو انسانوں کی صحت پر منفی اثر ڈالتی ہیں، جس سے بیماریوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے اور ان بیماریوں کے علاج کے لیے وہی کمپنیاں دوائیں فراہم کرتی ہیں۔ اس طرح لوگوں کو ایک خود ساختہ بیماری کے دائرے میں پھنسا دیا جاتا ہے۔ ایسی بیماریوں کے علاج میں تاخیر کی جاتی ہے جن سے بڑی مقدار میں منافع کمایا جا سکتا ہے، جیسے کینسر کے بعض علاجوں میں۔ یہ تاخیر اور علاج کی مہنگی قیمتیں عام لوگوں کو مشکلات میں ڈالتی ہیں، جبکہ بگ فارما اور سامراجی طاقتوں کو مالی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

بگ فارما انڈسٹری اور سامراجی طاقتیں ایسی قدرتی یا سستی دواؤں اور علاج کے طریقوں کو دبا دیتی ہیں جو سستے، مؤثر اور قدرتی ہوتے ہیں۔ جیسے جڑی بوٹیوں یا روایتی طریقہ علاج کو اپنانے سے لوگ مہنگے علاج سے بچ سکتے ہیں، لیکن ان طریقوں کو مقبول نہیں ہونے دیا جاتا۔ بگ فارما کمپنیاں صحت کی تعلیم میں ایسی معلومات شامل کرتی ہیں جو لوگوں کو ان پر انحصار کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں لوگ خود اپنے صحت کے معاملات کو کنٹرول کرنے کے بجائے بگ فارما کی مصنوعات پر اعتماد کرتے ہیں۔

جب دواؤں میں سنگین مسائل سامنے آتے ہیں تو بعض کمپنیاں خاموشی سے انہیں مارکیٹ سے ہٹادیتی ہیں یا منفی نتائج کو چھپانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس عمل سے لوگوں کی صحت پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں، جبکہ کمپنیاں مالی نقصان سے بچنے کی کوشش کرتی ہیں۔ بگ فارما انڈسٹری اور سامراجی طاقتیں مستقل خوف کا ماحول پیدا کرتی ہیں کہ صحت کے مسائل ہر وقت لوگوں کو گھیر سکتے ہیں۔ اس عمل سے لوگ نفسیاتی دباؤ اور بے چینی میں مبتلا رہتے ہیں اور دواؤں پر انحصار بڑھ جاتا ہے، جس سے کمپنیاں مسلسل منافع کماتی ہیں۔

بگ فارما اور سامراجی طاقتیں بعض اوقات غیر ضروری سرجریوں کو فروغ دیتی ہیں، جیسے دل کے اسٹنٹ یا دیگر ایسی سرجریاں جن کا کم قیمت اور غیر مداخلتی علاج بھی ممکن ہوتا ہے۔ اس حکمت عملی کے نتیجے میں لوگ مہنگے علاج میں الجھ جاتے ہیں جبکہ سستا علاج نظر انداز ہو جاتا ہے۔ بگ فارما کمپنیاں مریضوں کی طبی معلومات کو جمع کر کے اسے تجارتی مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ یہ ڈیٹا نئی دوائیں تیار کرنے اور مارکیٹ کے نئے امکانات کو دریافت کرنے میں مدد دیتا ہے، لیکن اخلاقی طور پر یہ عمل متنازعہ سمجھا جاتا ہے۔

سامراجی طاقتیں ترقی پذیر ممالک کی منڈیوں میں مہنگی دوائیں بیچ کر وہاں کے صحت کے نظام کو اپنے زیر اثر لے آتی ہیں۔ اس سے مقامی صنعتوں اور صحت کے نظام کو ترقی کرنے کا موقع نہیں ملتا اور بگ فارما کمپنیاں مکمل کنٹرول حاصل کر لیتی ہیں۔ بگ فارما کمپنیاں اور سامراجی طاقتیں حکومتوں پر دباؤ ڈالتی ہیں کہ وہ اپنی صحت کی پالیسیوں کو ان کے مطابق

ڈھالیں۔ اس کے نتیجے میں لوگوں کو مخصوص علاجوں یا دواؤں کے استعمال پر مجبور کیا جاتا ہے، جبکہ قدرتی اور سستے متبادل نظر انداز کیے جاتے ہیں۔

ادویات اور ویکسین کے آزمائشی تجربات اکثر ترقی پذیر یا غریب ممالک میں کیے جاتے ہیں، جہاں لوگوں کو مناسب معاہدے اور تحفظ کے بغیر شامل کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ ان تجربات کے خطرات کا سامنا کرتے ہیں اور انہیں مکمل معلومات بھی فراہم نہیں کی جاتیں۔ بگ فارما انڈسٹری اپنے پیداواری عمل میں زہریلے کیمیکلز اور فضلہ چھوڑ کر ماحول کو آلودہ کرتی ہے، جس سے پینے کا پانی اور زرعی زمین متاثر ہوتی ہے۔ اس آلودگی کے نتیجے میں مختلف بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، جن کے علاج کے لیے بگ فارما کمپنیاں مزید منافع کماتی ہیں۔

کبھی کبھی بگ فارما کمپنیاں مخصوص دواؤں کا مصنوعی قحط پیدا کر دیتی ہیں تاکہ ان کی قیمت میں اضافہ کیا جا سکے۔ اس طرح لوگ زیادہ قیمت پر دوائیں خریدنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور کمپنیاں منافع کماتی ہیں۔ بعض دوائیں ایسی مقدار میں تیار کی جاتی ہیں کہ ان کا اثر صرف مختصر مدت کے لیے ہو۔ اس حکمت عملی کے تحت مریض کو بار بار ان دواؤں کو خریدنا پڑتا ہے، جس سے کمپنیوں کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے، طب اور صحت کے معاملات میں کسی قسم کی منافقت، استحصال، یا ظلم کی ممانعت ہے۔ اسلام میں معاشرتی مفاد اور بھلائی کو اولیت دی گئی ہے، اور انفرادی صحت کے حقوق کا تحفظ کیا گیا ہے۔۔ اسلام میں اس طرح کے منافع بخش رویے کی حوصلہ شکنی کی

گئی ہے، اور طب اور صحت کی دیکھ بھال میں اخلاص اور دیانت داری پر زور دیا گیا ہے۔ اس لیے ان تمام مسائل کا حل اسلامی اصولوں کی پیروی میں مضمر ہے، جہاں انصاف اور شفافیت کو یقینی بنایا جائے اور بیماریوں سے بچاؤ کے قدرتی اور سستے طریقے اختیار کیے جائیں۔ مذکورہ بالا تمام پہلو اشارہ دیتے ہیں کہ سامراجی اور بگ فارما کا مفادات کا باہمی تعلق ہے، جو بیماریوں کے علاج اور روک تھام کو اپنے مالی مفاد کے تابع رکھتا ہے

سامراج کا سائنسی سرقہ

سامراجی طاقتوں اور ان کے زیر اثر اداروں نے مختلف ادوار میں مسلم اور ہندی محققین کے اہم سائنسی اور فکری کارناموں کو یا تو کم تر دکھایا یا ان کا سہرا اپنے سر باندھنے کی کوشش کی۔ یہ عمل نو آبادیاتی طاقتوں کے اس بیانیے کا حصہ رہا ہے جس کا مقصد غیر مغربی اقوام کو پسماندہ ثابت کرنا تھا۔ مسلم محققین کے کام کو استحصال کا نشانہ بنایا گیا، جیسے ابن الہیثم کے بصریات کے میدان میں بنیادی کام کو مغرب میں صدیوں بعد دریافت کر کے روجر بیکن اور کیپلر جیسے سائنسدانوں کے نام کر دیا گیا۔ اسی طرح الخوارزمی کے الجبرا کے میدان میں کارنامے اور ابن سینا کی طب پر تحقیقی تصانیف کو دبانے کی کوشش کی گئی، حالانکہ ان کے کام کو یورپی یونیورسٹیوں میں طویل عرصے تک پڑھایا جاتا رہا۔

ہندی محققین کے کام کی بے اعتنائی بھی نو آبادیاتی نظام کا حصہ رہی۔ ہندوستانی ریاضی دانوں نے صفر اور اعشاری نظام کا تصور دیا، لیکن اس کا سہرا یورپی سائنسدانوں کو دیا گیا۔ براہم گپت، آریہ بھٹ، اور بھاسکر جیسے محققین کے کام کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ ہندی فلکیات کے میدان میں سورج اور چاند کے گرہن، زمین کی محوری گردش، اور دیگر فلکیاتی مظاہر پر جو تحقیق کی گئی، اسے بھی مغربی دریافت قرار دیا گیا۔

نو آبادیاتی طاقتوں نے مسلم اور ہندی کتابوں کو عربی اور سنسکرت سے یورپی زبانوں میں ترجمہ کیا، لیکن ان کے اصل مصنفین کا ذکر اکثر حذف کر دیا گیا یا انہیں مبہم انداز میں پیش کیا گیا۔ برطانوی نو آبادیاتی حکومت نے ہندوستان میں علمی اداروں کو کنٹرول کر کے مقامی علم کو اپنی تحقیق کا حصہ بنا کر پیش کیا۔ مغربی سائنسدانوں نے مسلم اور ہندی محققین کے کاموں کو اپنے نام سے شائع کیا، اور یہ علمی سرقہ صرف سائنسی تحقیق تک محدود نہیں تھا بلکہ فلسفہ، طب، اور انجینئرنگ کے شعبوں میں بھی دیکھا گیا۔

اس عمل کے نتیجے میں مسلم اور ہندی اقوام میں اپنی علمی وراثت سے ناواقفیت کی وجہ سے احساسِ کمتری پیدا ہوا۔ علمی ترقی کا بیانیہ مغربی دنیا تک محدود کر دیا گیا، اور غیر مغربی اقوام کو علمی طور پر پسماندہ تصور کیا گیا۔ آج بھی مسلم اور ہندی محققین کے کاموں کو عالمی سطح پر نظر انداز کیا جاتا ہے۔

یہ تمام اقدامات ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیے گئے تاکہ مسلم اور ہندی اقوام کے علمی کارناموں کو دبایا جا سکے اور نو آبادیاتی طاقتوں کے بیانیے کو فروغ دیا جا سکے۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنی علمی وراثت کی بازیابی کی جائے اور نئی نسل کو اس عظیم ورثے سے روشناس کرایا جائے۔

سب کو خوش رکھنا منافقت ہے

سب کو خوش رکھنے کی عادت (People-Pleasing Behavior) ایک ایسی ذہنی حالت ہے جس میں انسان دوسروں کی توقعات اور خواہشات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے، حتیٰ کہ یہ اس کی اپنی خوشی اور سکون کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ عادت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان دوسروں کی توجہ اور پسندیدگی حاصل کرنے کے لیے اپنی ذاتی ضروریات، خواہشات اور حدود کو نظر انداز کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی شناخت کھو دیتا ہے اور اپنی زندگی کے حقیقی مقصد سے دور ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ ہمیشہ دوسروں کی توقعات کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کرتا ہے۔

اسلام میں ہمیں یہ سکھایا گیا ہے کہ ہماری سب سے پہلی ذمہ داری اللہ کی رضا ہے، اور اس کے بعد ہمیں اپنے اخلاق، عزم، اور شخصیت کو سچائی اور ایمانداری کے ساتھ جینا چاہیے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا" : اور اگر تم اللہ کی رضا چاہتے ہو تو کسی کی رضا کی پرواہ نہ کرو "(سورہ التوبہ، 9:24)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری زندگی کی ترجیح اللہ کی رضا ہونی چاہیے، نہ کہ دوسروں کی خوشی کے لیے اپنی حقیقت کو چھپانا۔ اللہ کی رضا کی تلاش میں

انسان نہ صرف اپنے آپ کو بہتر بناتا ہے بلکہ اس کے ذریعے دوسروں کے ساتھ بھی اچھے تعلقات قائم کرتا ہے۔

جب ہم سب کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم اپنی توانائی اور وقت کو ضائع کرتے ہیں، کیونکہ ہر شخص کی خواہشات اور توقعات مختلف ہوتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں ہم اپنے آپ کو تھکا ہوا اور بے چین محسوس کرتے ہیں، کیونکہ ہم ہمیشہ دوسروں کی امیدوں پر پورا اُترنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا" :جو دوسروں کی رضا کی خاطر اپنی حقیقت کو چھوڑ دیتا ہے،وہ کبھی بھی سکون نہیں پا سکتا"۔ اس قول میں امام علی علیہ السلام نے ہمیں یہ سکھایا کہ اپنی شخصیت کو دوسروں کے مطابق ڈھالنا کبھی بھی ہمیں حقیقی سکون نہیں دے سکتا، بلکہ ہمیں اپنی اصل حقیقت کو اپنانا چاہیے۔

سب کو خوش رکھنے کی عادت ہمیں اپنی حدود طے کرنے کی صلاحیت سے محروم کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی ضروریات، خواہشات اور اخلاقی اصولوں کو نظر انداز کر کے صرف دوسروں کی رضا کے لیے اپنی زندگی گزارنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ عادت ایک طرح سے خود کو نقصان پہنچانے والی ہوتی ہے کیونکہ جب ہم اپنی حدود طے نہیں کرتے، تو ہم اپنی ذاتی سکون، خوشی اور بہتری کو نظر انداز کرتے ہیں۔ حضرت امام علی علیہ السلام نے فرمایا" :جو اپنی حدود کو نہیں سمجھتا،وہ کبھی بھی اپنے مقصد تک نہیں پہنچ سکتا"۔

سب کو خوش رکھنے کی کوشش کرنا منافقت کی طرف بھی لے جا سکتا ہے، کیونکہ جب ہم ہر کسی کو خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تو ہم اپنی حقیقت کو چھپاتے ہیں اور کبھی کبھی ایسا

رویہ اپناتے ہیں جو ہماری حقیقی شخصیت سے ہم آہنگ نہیں ہوتا۔ ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ سب سے دوستی رکھنے کی کوشش کرنا ہمیشہ منافقت ہوتی ہے۔ اسلام میں ہمیں سچائی اور ایمانداری کی اہمیت سکھائی گئی ہے، اور ہمیں اپنے تعلقات میں بھی سچائی کو برقرار رکھنا چاہیے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے کربلا میں اپنی جدوجہد سے ہمیں یہ سبق دیا کہ انسان کا مقصد اللہ کی رضا ہونا چاہیے، اور اگر اس راستے میں مخالفت یا تکلیف آتی ہے تو اسے قبول کرنا چاہیے، کیونکہ اللہ کی رضا میں ہی سکون اور کامیابی ہے۔

سب کو خوش رکھنے کی عادت سے بچنے کے لیے ہمیں اپنی ترجیحات اور حدود طے کرنی چاہیے۔ ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ سب کو خوش رکھنا ممکن نہیں ہے اور نہ ہی یہ ضروری ہے۔ ہمیں اپنی زندگی کے مقصد کو سمجھنا چاہیے اور اللہ کی رضا کے مطابق اپنی زندگی گزارنی چاہیے۔ ہمیں اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے تعلقات میں سچائی اور ایمانداری کو ترجیح دینی چاہیے اور کسی بھی تعلق میں خود کو جھوٹا یا منافق نہیں بنانا چاہیے۔ حضرت امام علی علیہ السلام نے فرمایا" :دوستی وہ نہیں جس میں صرف خوشی ہو، بلکہ دوستی وہ ہے جس میں سچائی اور اصولوں کا احترام ہو"۔ اس قول میں امام علی علیہ السلام نے ہمیں یہ سکھایا کہ ہمیں اپنے تعلقات میں اصولوں اور سچائی کو اہمیت دینی چاہیے۔

جب ہم سب کو خوش رکھنے کی عادت سے باہر نکل کر اپنی زندگی کو اللہ کی رضا کے مطابق گزارنے کی کوشش کرتے ہیں، تو ہم نہ صرف اپنے اندر سکون اور خوشی محسوس کرتے ہیں

بلکہ اپنے تعلقات میں بھی سچائی اور ایمانداری کی بنیاد رکھتے ہیں۔ اس طرح، ہم اپنی زندگی کو حقیقی سکون اور کامیابی کی طرف مائل کر سکتے ہیں۔

اس عادت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو مسلسل نظر انداز کرتا ہے اور اس کی ذاتی سکون اور خوشی متاثر ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ، وہ اپنی توانائی کا زیادہ تر حصہ دوسروں کو خوش کرنے میں صرف کرتا ہے، جس کے باعث اس کی اپنی زندگی کے مقاصد اور خواہشات پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔

اسلام میں ہمیں یہ سکھایا گیا ہے کہ ہم اللہ کی رضا کو سب سے زیادہ اہمیت دیں اور اس کے بعد اپنی ذاتی ضروریات اور حدود کا احترام کریں۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں: "اور جو لوگ اللہ کی رضا کی کوشش کرتے ہیں، وہ ہی کامیاب ہیں "(سورہ التوبہ، 9:24)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری زندگی کا مقصد اللہ کی رضا اور اس کے راستے پر چلنا ہونا چاہیے، نہ کہ دوسروں کی خوشی کے لیے اپنی حقیقت کو چھپانا۔

سب کو خوش رکھنے کی عادت انسان کو اس کی اصل شناخت سے دور کر دیتی ہے۔ جب ہم دوسروں کی امیدوں اور توقعات پر پورا اُترنے کی کوشش کرتے ہیں، تو ہم اپنے آپ کو مسلسل تبدیلی کے لیے مجبور کرتے ہیں، جو کہ اندرونی سکون کا سبب نہیں بنتی۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا" :جو شخص اپنے آپ کو دوسروں کے لیے قربان کرتا ہے، وہ خود کو کبھی نہیں سمجھ پاتا"۔ اس میں امام علی علیہ السلام نے ہمیں یہ سکھایا کہ ہم اگر ہمیشہ

دوسروں کی رضا کے لیے اپنی ذات کو قربان کرتے ہیں تو ہم اپنی اصل حقیقت کو کھو دیتے ہیں۔

سب کو خوش رکھنے کی عادت کی ایک اور خطرناک پہلو یہ ہے کہ یہ انسان کو منافقت کی طرف لے جا سکتی ہے۔ جب ہم ہمیشہ دوسروں کو خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم اپنی باتوں اور عملوں میں تضاد پیدا کرتے ہیں، کیونکہ ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں وہ صرف دوسروں کی توقعات کے مطابق ہوتا ہے، نہ کہ ہماری ذاتی حقیقت کے مطابق۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو جھوٹے یا مصنوعی محسوس کرتے ہیں، جو کہ ہمارے اندر کی سکون اور سکونت کو متاثر کرتا ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے کربلا میں اپنی جدوجہد سے ہمیں یہ سبق دیا کہ انسان کا مقصد اللہ کی رضا اور سچائی کی پیروی ہونی چاہیے، نہ کہ دوسروں کی خوشی کے لیے اپنے اصولوں سے پیچھے ہٹنا۔

سب کو خوش رکھنے کی کوشش کرنے سے بچنے کے لیے ہمیں اپنی ذاتی حدود اور ضروریات کو اہمیت دینی چاہیے۔ ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ ہماری زندگی کے فیصلے اور ترجیحات ہمیں خود کرنے ہیں، اور ان میں کسی کی خوشی کی خاطر اپنی حقیقت سے دستبردار ہونا مناسب نہیں ہے۔ حضرت امام علی علیہ السلام نے فرمایا" :وہ شخص سچا ہے جو اپنے دل کی بات زبان پر لائے، اور اپنے عمل سے اس بات کو ثابت کرے"۔ اس میں امام علی علیہ السلام نے ہمیں سچائی اور ایمانداری کے راستے پر چلنے کی ہدایت دی، جو کہ ہماری زندگی میں سکون اور کامیابی کی اصل بنیاد ہے۔

سب کو خوش رکھنے کی عادت سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی ذاتی شناخت کو تسلیم کریں اور اس پر قائم رہیں۔ ہمیں دوسروں سے موازنہ کرنے کے بجائے اپنے مقصد اور ذاتی ترقی پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ اس سے نہ صرف ہم اپنے اندر سکون حاصل کریں گے بلکہ ہمارے تعلقات بھی مضبوط اور سچے ہوں گے۔ اگر ہم اپنی زندگی کو اللہ کی رضا کی طرف مائل کرتے ہیں اور اپنی حقیقت کو اپناتے ہیں، تو ہم نہ صرف اپنے لیے سکون کا راستہ اختیار کریں گے بلکہ دوسروں کے ساتھ اپنے تعلقات میں بھی سچائی اور ایمانداری کی بنیاد رکھیں گے۔

اس طرح ہم اپنی زندگی کو ایک متوازن اور خوشحال راستے پر ڈال سکتے ہیں جہاں نہ صرف ہم اللہ کی رضا کے قریب ہوں گے، بلکہ اپنے آپ کو اور اپنے تعلقات کو بھی سچائی اور اطمینان سے بھرپور بنا سکیں گے۔

سختی و جبر انسان کو منافق وریاکار بنادیتا ہے

سختی اور جبر کے اثرات انسان کی شخصیت پر گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں۔ جب انسان کو مسلسل دباؤ یا زبردستی کا سامنا کرنا پڑے تو اس کی فطری آزادی، خود اعتمادی اور صداقت متاثر ہوتی ہے۔ یہ کیفیت آہستہ آہستہ انسان کو ایسے رویے اپنانے پر مجبور کر دیتی ہے جو منافقت اور ریاکاری کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ظاہری طور پر وہ احکامات کی پیروی کرتا دکھائی دیتا ہے، لیکن اس کا دل ان کی گہرائی میں یقین نہیں رکھتا۔ یہ رویہ نہ صرف انفرادی طور پر نقصان دہ ہے بلکہ معاشرتی اقدار اور تعلقات کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔

یہی اصول حکومتوں، انتظامیہ اور مذہبی رہنماؤں کے طرزِ عمل پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ اگر قوانین یا اخلاقی اصولوں کے نفاذ میں نرمی اور حکمت سے کام نہ لیا جائے تو عوام میں مزاحمت پیدا ہو سکتی ہے۔ انسان فطرتاً محبت اور نرمی سے متاثر ہوتا ہے، جبکہ سختی اسے یا تو ضد میں مبتلا کر دیتی ہے یا پھر اس کے اندر ایک پوشیدہ باغی پیدا کر دیتی ہے۔

قرآن اور احادیث ہمیں یہ درس دیتے ہیں کہ حکمت اور موعظہ حسنہ کے ذریعے اصلاح کی جائے۔ رسول اللہ ﷺ اور اہل بیت علیہم السلام کی زندگیوں میں ہمیں یہ اصول بار بار نظر آتا ہے کہ وہ برائیوں کو ختم کرنے کے لیے نرم دلی اور صبر کا مظاہرہ کرتے تھے۔ بعض

اوقات، اگر کوئی شخص یا قوم اصلاح کے لیے تیار نہ ہوتی، تو وہ سختی کے بجائے خاموشی اختیار کرتے تھے تاکہ لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت اور احترام قائم رہے۔

اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والوں کو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ہر موقع پر برائی کو روکنا ضروری نہیں ہوتا۔ بعض حالات میں برائی کو نظر انداز کرنا زیادہ مناسب ہو سکتا ہے تاکہ کوئی بدگمانی یا دوری پیدا نہ ہو۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ نصیحت کرنے کا انداز ایسا ہو جو دل کو چھو لے، انسان کے اندر خلوص پیدا کرے اور اسے نیکی کی طرف راغب کرے، نہ کہ اسے مزید دور کر دے۔ نصیحت کا مقصد اصلاح ہے، نہ کہ لوگوں کو شرمندہ یا متنفر کرنا۔

اسلامی تعلیمات ہمیں اعتدال، نرمی اور حکمت کا راستہ دکھاتی ہیں۔ لہٰذا، اگر ہم واقعی معاشرے میں برائیوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور لوگوں کو نیکی کی طرف لانا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے الفاظ اور رویے میں محبت، صبر اور حکمت کو شامل کرنا ہو گا۔ سختی اور جبر کے بجائے محبت اور خلوص وہ راستہ ہے جو انسان کے دل کی گہرائیوں تک پہنچتا ہے۔

شکایتی رویہ مضر ہے

مسلسل شکایت کا رویہ (Chronic Complaining) ایک ایسی ذہنی حالت ہے جس میں انسان ہر چھوٹی بڑی بات پر شکایت کرنا شروع کر دیتا ہے، جس سے نہ صرف اس کی ذہنی سکونت متاثر ہوتی ہے بلکہ اس کی زندگی میں منفی جذبات بھی بڑھتے ہیں۔ شکایت کرنے کی عادت انسان کو اپنی زندگی کی مثبت چیزوں سے غافل کر دیتی ہے، اور وہ ہمیشہ نقصانات اور مشکلات پر توجہ مرکوز کرتا ہے، نہ کہ ان مواقع پر جو اسے کامیابی کی طرف لے جا سکتے ہیں۔ جب انسان مسلسل شکایت کرتا ہے، تو وہ خود کو ایک منفی دائرے میں بند کر لیتا ہے، جہاں اس کے دماغ میں صرف مسائل اور مشکلات کی بڑھا چڑھا کر تصویر بنتی ہے۔

اسلام میں شکایت کو منفی جذبات کا نتیجہ اور تقدیر کے ساتھ غیر رضامندی کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا" :اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں زیادہ دوں گا، اور اگر تم ناشکری کرو گے تو میرا عذاب شدید ہو گا "(سورہ ابراہیم، 14:7)۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جب انسان اپنی زندگی میں موجود نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہے تو اس کی زندگی میں سکون اور خوشحالی آتی ہے، لیکن اگر وہ ہمیشہ شکایت کرتا رہے گا، تو وہ اپنی کامیابیاں اور خوشیاں ضائع کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی نعمتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے

مسلسل شکایت کرنا نہ صرف انسان کے دل میں کدورت پیدا کرتا ہے بلکہ اس کی زندگی میں سکون کی کمی کا باعث بنتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا" :شکایت کرنے کا عمل تمہیں اندر سے کمزور کرتا ہے اور تمہارے جذبات کو بے چین کر دیتا ہے"۔ اس قول سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شکایت کرنے کی عادت انسان کی روحانی اور ذہنی حالت کو متاثر کرتی ہے، جس کے نتیجے میں وہ اپنے اندر کی طاقت اور سکون کو کھو دیتا ہے۔ مسلسل شکایت کرنے سے انسان کی نظر ہمیشہ منفی پہلوؤں پر مرکوز ہوتی ہے، جو اس کی زندگی میں اطمینان کا فقدان پیدا کرتی ہے۔ اس کے بجائے، اگر انسان اپنے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرے اور ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرے، تو وہ سکون اور اطمینان حاصل کر سکتا ہے۔

شکایت کی عادت سے بچنے کا ایک مؤثر طریقہ یہ ہے کہ انسان ہر مشکل یا تکلیف میں بھی اللہ کی حکمت کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا" :ہم انسان کو آزمائش میں ڈالتے ہیں تاکہ وہ اپنے ایمان کا امتحان دے سکے "(سورہ الملک، 67:2)۔ اس آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہر مشکل اور تکلیف ایک امتحان ہوتی ہے جس کے ذریعے انسان کے ایمان کی حقیقت سامنے آتی ہے۔ جب ہم اپنے مسائل کو اللہ کی آزمائش کے طور پر دیکھنا شروع کرتے ہیں، تو ہمیں ان پر شکایت کرنے کی بجائے ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

شکایت کرنے کے بجائے انسان کو اپنی زندگی میں شکرگزاری کی عادت اپنانی چاہیے۔ شکرگزاری انسان کو یہ سکھاتی ہے کہ وہ جو کچھ بھی اللہ کی طرف سے حاصل کرتا ہے، اس پر شکر ادا کرے، اور اس کی زندگی میں جو کچھ نہیں ہے، اس کے لیے افسوس کرنے کے بجائے اس کی کمی کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ حضرت امام علی علیہ السلام کا قول ہے" :شکر گزار دل انسان کو ہر حال میں سکون فراہم کرتا ہے"۔ اس قول کا مطلب یہ ہے کہ شکرگزاری انسان کے دل کو اطمینان اور سکون دیتی ہے، اور وہ اپنے مسائل کے باوجود خوش رہ سکتا ہے۔

آخرکار، شکایت کے بجائے انسان کو اپنی زندگی میں مثبت پہلو تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے لیے اسے اپنی زندگی کی ہر چھوٹی بڑی خوشی کو محسوس کرنا چاہیے اور ان پر شکر ادا کرنا چاہیے۔ جب انسان اپنی زندگی کے مثبت پہلوؤں پر غور کرتا ہے اور ہر حالت میں اللہ کی رضا کو سامنے رکھتا ہے، تو وہ شکایت کی عادت سے چھٹکارا پا کر سکون اور خوشی حاصل کر سکتا ہے۔

مسلسل شکایت کا رویہ (Chronic Complaining) زندگی کے ہر پہلو میں منفی سوچ کو بڑھاتا ہے اور انسان کو ایک دائرے میں جکڑ لیتا ہے، جس میں وہ خود کو ہمیشہ مسائل کے پیچ پھنسہ ہوا محسوس کرتا ہے۔ یہ عادت نہ صرف فرد کی ذہنی حالت کو خراب کرتی ہے بلکہ اس کی جسمانی صحت پر بھی برے اثرات مرتب کرتی ہے۔ جب انسان شکایت کرتا ہے، تو

وہ اپنے ذہن میں منفی خیالات کو پروان چڑھاتا ہے، جس سے اس کا دماغ مسلسل تناؤ اور پریشانی کا شکار رہتا ہے، اور یہی تناؤ جسمانی بیماریوں کا سبب بن سکتا ہے۔

اسلام میں شکایت کرنے کی عادت کو ناپسندیدہ سمجھا گیا ہے، کیونکہ اس سے انسان کی تقدیر کے ساتھ غیر رضامندی اور اللہ کی حکمت پر سوال اٹھانے کا اشارہ ملتا ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا" :شکایت کرنے والا شخص اللہ کی رضا کو قبول نہیں کرتا"۔ اس قول سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شکایت انسان کی روحانی ترقی میں رکاوٹ ڈالتی ہے اور اسے اللہ کی رضا کی سمجھ سے دور کرتی ہے۔ جب انسان ہر صورتحال میں شکایت کرتا ہے، تو وہ اپنے اندر اللہ کی مرضی کو سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔

شکایت کی عادت کو چھوڑنے کے لیے ہمیں اپنے ذہن کو مثبت سوچ کی طرف مائل کرنا ضروری ہے۔ مثبت سوچ انسان کو ہر مسئلے میں حل تلاش کرنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے اور وہ حالات کا سامنا طاقت اور حوصلے کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ، اس سے انسان کی داخلی قوت میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ اپنی زندگی میں سکون اور خوشی کی حالت پیدا کر پاتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کا قول ہے" :مؤمن وہ ہے جو ہر حال میں سکون اور اطمینان سے رہتا ہے"۔ اس قول کا مطلب یہ ہے کہ ایمان انسان کو ہر حال میں سکون فراہم کرتا ہے، اور شکایت کرنے کے بجائے وہ اللہ کی رضا اور حکمت کو تسلیم کرتا ہے۔

شکایت کے بجائے شکر گزاری کی عادت کو اپنانا انسان کو زندگی کے مثبت پہلوؤں پر توجہ مرکوز کرنے میں مدد دیتی ہے۔ شکر گزاری انسان کے دل میں سکون پیدا کرتی ہے اور وہ

اپنی زندگی کی نعمتوں کو تسلیم کرنے لگتا ہے۔ جب ہم اپنے ارد گرد کی نعمتوں پر توجہ دیتے ہیں اور ان کا شکر ادا کرتے ہیں، تو ہمیں اپنی زندگی میں سکون اور خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" :اگر تم شکر ادا کروگے تو میں تمہیں مزید دوں گا"(سورہ ابراہیم،14:7)۔ اس آیت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شکر گزاری انسان کی زندگی میں اضافی نعمتوں کا باعث بنتی ہے۔

شکایت کی عادت کو ترک کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے ذہن کو بیدار کریں اور غور و فکر کریں کہ جو کچھ بھی ہمارے ساتھ ہو رہا ہے، وہ اللہ کی حکمت اور منصوبے کا حصہ ہے۔ ہمیں ہر حال میں اللہ کی رضا اور آزمائش کو تسلیم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ حضرت امام علی علیہ السلام کا قول ہے" :ہر مصیبت کے پیچھے اللہ کی حکمت چھپی ہوتی ہے"۔ اس قول میں ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ مشکلات اور چیلنجز ہمیں سکھانے کے لیے آتی ہیں، اور ان پر شکایت کرنے کے بجائے ہمیں ان سے سیکھنا چاہیے۔

آخر کار، ہمیں اپنی زندگی میں شکر گزاری اور مثبت سوچ کو اپنانا چاہیے تاکہ ہم شکایت کی عادت سے نجات پا سکیں اور اپنی زندگی کو بہتر بنا سکیں۔ جب ہم اللہ کی رضا کے تحت اپنے مسائل کا سامنا کرتے ہیں اور ان پر شکر ادا کرتے ہیں، تو ہمیں ذہنی سکون ملتا ہے اور ہم اپنی زندگی میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔

ظلم سے مقابلہ کا اسلامی دستور

جب ہم منافقوں یا فکسڈ مائنڈ سیٹ لوگوں کے ساتھ تعلقات کی بات کرتے ہیں، تو یہ ایک نازک اور پیچیدہ معاملہ ہوتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت پر عمل کرنا، جو کہ رحمت للعالمین کی خصوصیت ہے، اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ انسان صبر، بردباری، اور معاف کرنے کے اصولوں پر عمل کرے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ظلم اور فساد کو نظر انداز کیا جائے، کیونکہ اگر ہم ظلم کی سرکوبی نہ کریں یا فساد کو خاموشی سے برداشت کریں تو اس کا نتیجہ معاشرتی خرابی اور فرد کی کمزوری کی صورت میں نکل سکتا ہے۔ جب منافق یا فکسڈ مائنڈ سیٹ والے افراد فساد پھیلاتے ہیں یا ظلم کرتے ہیں، تو ان کا خاموشی سے تماشا دیکھنا اس بات کو تقویت دیتا ہے کہ ان کے افعال کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم ان افراد کے ساتھ درست طریقے سے، معقولیت اور ایفیکٹیو طریقے سے پیش آئیں تاکہ نہ صرف خود کو، بلکہ معاشرتی اصولوں اور اخلاقی حدود کو بھی بچایا جا سکے۔

یہ سوال کہ آیا آخرت کے دن پر ظلم کا حساب کتاب چھوڑ دیا جائے یا دنیا میں ظالموں کی سرکوبی کی جائے، ایک اہم موضوع ہے۔ آخرت میں اللہ تعالیٰ ظلم کا حساب ضرور لے گا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا میں ظلم کا مقابلہ نہ کیا جائے۔ اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ

ہم ظلم کا مقابلہ کریں، خاص طور پر جب ہمارے ہاتھ میں وسائل ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت ہمیں بتاتی ہے کہ آپ نے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی، نرمی اور عدلیہ کے ذریعے ظلم کا مقابلہ کیا، اور جہاں ضرورت محسوس ہوئی وہاں طاقت کا استعمال بھی کیا۔ اس لیے ہمیں ظلم کے خلاف اٹھنا چاہیے اور جب تک ممکن ہو، ہمیں حکمت اور بردباری کے ساتھ عمل کرنا چاہیے۔ تاہم، جب معاملات زیادہ سنگین ہوں اور ظلم کا اثر بڑھ جائے، تو ہمیں قانونی طریقوں یا مناسب ردعمل کے ذریعے اس کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

جب ہم منافقوں یا فکسڈ مائنڈ سیٹ والے افراد کے ساتھ تعلقات اور ان کے ساتھ گزارے جانے والے وقت کی بات کرتے ہیں تو یہ ایک انتہائی حساس مسئلہ بن جاتا ہے۔ اس تناظر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ اگرچہ آپ نے اپنی زندگی میں رحمت، بردباری، اور معاف کرنے کے اصولوں پر عمل کیا، لیکن آپ نے کبھی بھی ظلم یا فساد کو خاموشی سے برداشت نہیں کیا۔ آپ نے ہمیشہ حق کی حمایت کی اور ظلم کی سرکوبی کے لیے فعال کردار ادا کیا، چاہے وہ فرد کے طور پر ہو یا امت کے لیے۔

اس کے باوجود، جب ہم اپنے معاشرتی، دینی یا اخلاقی اصولوں کو دیکھتے ہیں، تو یہ واضح ہوتا ہے کہ صرف صبر یا خاموشی سے کام نہیں چل سکتا۔ منافقین یا وہ لوگ جو فساد پھیلاتے ہیں، ان کا مقابلہ ضروری ہے تاکہ معاشرت میں عدل قائم رہے۔ اگر ہم ظلم یا فساد کو خاموشی سے دیکھتے رہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے اثرات نہ صرف فرد بلکہ پورے معاشرے میں پھیلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض حالات میں ہمیں ان افراد کے ساتھ مقابلہ کرنا اور ان کی اصلاح کی کوشش کرنا ضروری ہوتا ہے۔

جب یہ سوال اٹھتا ہے کہ ہمیں آخرت میں ظلم کا حساب اللہ کے سپرد کر دینا چاہیے یا دنیا میں ظلم کی سرکوبی کرنی چاہیے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں باتوں کا ایک دوسرے سے تعارض نہیں ہے۔ اسلام میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ ہر انسان کے عمل کا حساب لے گا، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم دنیا میں ظلم کے سامنے خاموش رہیں یا حق کا دفاع نہ کریں۔ دنیا میں عدل کا قیام ایک اہم ذمہ داری ہے اور ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ جہاں تک ممکن ہو، ظلم کا مقابلہ کرے۔ اگر ظلم بڑھ جائے اور کسی کا نقصان ہو رہا ہو، تو ہمیں مناسب اقدامات کرنا چاہیے تاکہ ظلم کی روک تھام کی جا سکے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت اور امام علی علیہ السلام کی رہنمائی ہمیں بتاتی ہے کہ ظلم کے خلاف کھڑا ہونا ضروری ہے، لیکن اس میں حکمت اور عدل کو برقرار رکھتے ہوئے۔ امام علی علیہ السلام نے فرمایا کہ "عدل و انصاف میں کبھی بھی درشتی یا ظلم کو اپنی حکمت سے تبدیل نہ کرو"۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ہمیں اپنے ردعمل میں ہمیشہ عقل و دانش سے کام لینا چاہیے اور کسی بھی قسم کے ظلم کا جواب دینے میں توازن برقرار رکھنا چاہیے۔

لہذا، ظلم کے خلاف آواز اٹھانا، معقول طریقوں سے مقابلہ کرنا، اور ظالموں کی اصلاح کی کوشش کرنا ضروری ہے۔ تاہم، جہاں ضروری ہو، وہاں ہمیں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے طاقت کا استعمال بھی کرنا چاہیے تاکہ ظلم کا خاتمہ ہو سکے۔ ان تمام اصولوں پر عمل کرتے ہوئے ہم اپنے معاشرتی، دینی اور اخلاقی ذمہ داریوں کو بخوبی ادا کر سکتے ہیں اور اپنی معاشرتی عدلیہ کو صحیح طریقے سے قائم رکھ سکتے ہیں۔

جب بات مکتب (دینی یا تعلیم و تربیت کے شعبے) یا زیر کفالت افراد (یعنی خاندان یا دوسرے معصوم لوگ) کی آجائے جو ظلم کا شکار ہوں، تو اس صورت میں ظلم کو برداشت کرنا ایک مختلف سوال بن جاتا ہے۔ ذات تک ظلم کو برداشت کیا جائے، لیکن جب مکتب یا زیر کفالت افراد کی بات ہو، تو یہاں ایک زیادہ فعال ردعمل کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس نوعیت کی صورتحال میں ظلم کے خلاف کھڑا ہونا اور مقابلہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے تاکہ نہ صرف خود کو بلکہ معاشرتی یا مذہبی اصولوں کو بھی محفوظ رکھا جا سکے۔

جب مکتب یا دینی ادارہ ظلم کا شکار ہوتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دینی تعلیمات یا تربیتی اصول کو پامال کیا جا رہا ہے۔ اس صورت میں، ظلم کے خلاف آواز اٹھانا اور اصلاحات کی کوشش کرنا ضروری ہے۔ یہاں علما، تعلیمی اداروں اور مذہبی قیادت پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ حق کا پرچار کریں اور فکری آزادی کو برقرار رکھیں۔ جیسے امام علی علیہ السلام نے خود کو محتسب یعنی نگران کے طور پر قائم کیا تھا، اس طرح آج بھی ایسی صورتحال میں قیادت کو ظلم کی نشاندہی کرنی چاہیے اور اس کا مناسب ردعمل ظاہر کرنا چاہیے۔

جب آپ کے زیر کفالت افراد ظلم کا شکار ہوتے ہیں، چاہے وہ خاندان کے افراد ہوں یا دیگر کسی صورت میں، تو ان کی حفاظت اور حقوق کا دفاع آپ کا فرض بن جاتا ہے۔ اسلام میں والدین، بیوی، بچے اور دیگر افراد کے حقوق کی حفاظت کی شدید تاکید کی گئی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا کہ "تم میں سب سے بہترین وہ ہے جو اپنے اہل و عیال کے ساتھ بہتر سلوک کرتا ہے"۔ اگر ظلم آپ کے زیر کفالت افراد پر ہو رہا ہے تو نرمی کے ساتھ لیکن ثابت قدمی سے اس کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔ ظلم کا رد کرنا، خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو، اسلام کی تعلیمات کے مطابق آپ کی ذمہ داری ہے۔

ظلم کا مقابلہ کرنے کے لیے آپ کو سب سے پہلے لوگوں کو آگاہ کرنا ہوگا تاکہ وہ اپنے حقوق سے واقف ہوں۔ ظلم کے خلاف آواز اٹھانے اور قانونی طریقوں کا سہارا لینے کے لیے عدلیہ میں انصاف کا مطالبہ کرنا ضروری ہے۔ تاہم، ظلم کا مقابلہ صرف آخرت کے لیے چھوڑنا نہیں چاہیے بلکہ دنیا میں انصاف کا قیام بھی ضروری ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت ہمیں بتاتی ہے کہ جب تک ممکن ہو، ظلم کا مقابلہ صبر کے ساتھ کیا جانا چاہیے، لیکن جہاں ظلم کا اثر بڑھنے لگے اور ظلم کی شدت بڑھ جائے تو طاقت کا استعمال ضروری ہو سکتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت اور امام علی علیہ السلام کا نمونہ ہمیں دکھاتا ہے کہ انہوں نے ظلم اور فساد کا مقابلہ کیا، لیکن اس میں حکمت اور عدل کو برقرار رکھا۔ ان کی سیرت یہ بتاتی ہے کہ ہمیں ظلم کے خلاف اپنی ذمہ داری کو پورا کرنا چاہیے، اور جہاں ضرورت ہو، وہاں ہم قانونی یا فکری اقدامات کریں تاکہ معاشرتی انصاف اور حقوق کا تحفظ ہو سکے۔

عقیدے اور عمل میں ہم آہنگی ضروری ہے

ذہنی الجھن کا جال (Cognitive Dissonance) انسان کی ذہنی حالت میں ایک بڑی رکاوٹ پیدا کرتا ہے جب اس کے عقائد اور اعمال میں تضاد ہوتا ہے۔ یہ تضاد انسان کو اندر سے بے چینی اور اضطراب کا شکار کر دیتا ہے، کیونکہ اس کی سوچ اور عمل میں ہم آہنگی نہیں ہوتی۔ جب کسی انسان کے اندر کوئی ایک عقیدہ یا خیال ہوتا ہے لیکن وہ اس کے مطابق عمل نہیں کرتا، تو اس میں ایک ذہنی کشمکش پیدا ہوتی ہے، جسے ہم "ذہنی الجھن" یا "کگنیٹیو ڈسونس" کہتے ہیں۔ اس الجھن کے نتیجے میں انسان خود کو بے سکون محسوس کرتا ہے اور یہ اس کے ذہنی سکون میں خلل ڈالتا ہے۔

اسلامی تعلیمات میں عقائد اور اعمال کی ہم آہنگی پر زور دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا" :جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے، ان کے لیے ان کی کوشش کی کوئی کمی نہ ہو گی "(سورہ الکہف، 18:30)۔ یہاں پر ایمان اور عمل دونوں کا ذکر ہے، جو اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسان کو اپنے عقائد اور اعمال میں ہم آہنگی پیدا کرنی چاہیے تاکہ اس کی کوششیں کامیاب ہوں اور وہ سکون محسوس کرے۔

ذہنی الجھن کی حالت میں انسان ایک ہی وقت میں دو مختلف خیالات یا عقائد پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے، جو اس کی ذہنی توانائی کو منتشر کر دیتا ہے اور اس کی پُرامن زندگی میں خلل ڈالتا ہے۔ مثلاً، اگر کسی شخص کا عقیدہ ہے کہ وہ اپنے جسم کی صحت کا خیال رکھنا چاہتا ہے، مگر وہ مسلسل غیر صحت بخش کھانا کھاتا ہے، تو اس کے ذہن میں ایک تضاد پیدا ہو گا، جو ذہنی الجھن کی صورت میں ظاہر ہو گا۔ اس الجھن کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ شخص اپنے عقائد کو اپنے اعمال کے مطابق ڈھالے۔

اسلامی نقطہ نظر سے، انسان کا عقیدہ اور عمل ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہونا چاہیے تاکہ انسان فلاح کی طرف بڑھ سکے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا" :جو شخص اپنے عمل اور عقیدے میں تضاد رکھتا ہے، وہ ہمیشہ پشیمان ہوتا ہے"۔ اس قول کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اپنے اعمال اور عقائد میں توازن قائم رکھنا چاہیے تاکہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے اور اندرونی سکون حاصل کر سکے۔

عقائد کو فطری اصولوں سے ہم آہنگ رکھنے کا عمل بہت اہم ہے، کیونکہ فطرت ہمیشہ سچائی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ قرآن اور حدیث میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات فطرت کے مطابق ہیں، اور جب انسان اپنے عقائد کو اس فطری اصول سے ہم آہنگ کرتا ہے، تو وہ صحیح راستے پر چلتا ہے۔ حضرت امام علی علیہ السلام نے فرمایا" : فطرت کو پہچانو، اس میں ہی تمہارے تمام مسائل کا حل چھپا ہے"۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فطری اصولوں

اور عقائد کا احترام کر کے انسان اپنی زندگی کو بہتر بنا سکتا ہے اور ذہنی الجھن سے بچ سکتا ہے۔

ذہنی الجھن کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے عقائد پر غور و فکر کرے اور اپنے اعمال کو ان عقائد کے مطابق ڈھالے۔ اس کے لیے مطالعہ، مشاہدہ اور غور و فکر کا عمل بہت اہم ہے۔ جب انسان اپنے عقائد پر تحقیق کرتا ہے اور اس کے مطابق اپنے اعمال کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے، تو اس کا ذہنی سکون اور سکونت بڑھتی ہے۔ اس بات کی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے، ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں بار بار تفکر اور تدبر کا ذکر آیا ہے، جیسے کہ سورہ آل عمران (3:191) میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں" :یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں"۔ یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ ہمیں اپنے عقائد پر غور و فکر کرنا چاہیے اور اپنے اعمال کو بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ ہم اپنے زندگی میں توازن اور سکون حاصل کر سکیں۔

عقائد اور اعمال کی ہم آہنگی کو برقرار رکھنے کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ انسان کو اپنے فیصلوں میں حکمت اور تدبر سے کام لینا چاہیے۔ جب انسان حکمت کے ساتھ فیصلے کرتا ہے، تو وہ اپنے عقائد اور اعمال کو ایک ہی لائن میں رکھتا ہے اور اس کے اندرونی تضاد ختم ہو جاتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا" :جو حکمت سے کام لیتا ہے، وہ اپنی زندگی میں کبھی بھی الجھن کا شکار نہیں ہوتا"۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسان کو اپنے ہر عمل میں حکمت اپنانی چاہیے تاکہ وہ اپنے عقائد کے مطابق زندگی گزار سکے۔

آخر کار، ذہنی الجھن کا جال انسان کے اندر اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اس کے عقائد اور اعمال میں تضاد ہو۔ اس تضاد کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے عقائد کو فطری اصولوں سے ہم آہنگ کرے اور اپنے اعمال کو ان عقائد کے مطابق ڈھالے۔ اس کے لیے مطالعہ، مشاہدہ اور غور و فکر کی ضرورت ہے تاکہ انسان اپنے اندرونی سکون کو حاصل کر سکے اور زندگی کے سفر میں کامیاب ہو سکے۔

ذہنی الجھن کا جال (Cognitive Dissonance) صرف فرد کی اندرونی زندگی میں ہی نہیں، بلکہ اس کے باہر کی دنیا میں بھی اثرات ڈال سکتا ہے۔ جب ایک شخص اپنے عقائد اور اعمال میں تضاد محسوس کرتا ہے، تو یہ اس کے رویوں اور فیصلوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے، جس سے اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں پریشانی پیدا ہوتی ہے۔ اس الجھن کی حالت میں، فرد یا تو اپنے عقائد کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے، یا پھر اپنے اعمال کو عقائد کے مطابق بنانے کے لیے محنت کرتا ہے۔ لیکن جب اس کے عقائد اور اعمال میں تضاد برقرار رہتا ہے، تو وہ اپنی ذہنی سکونت اور کامیابی سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دین اسلام میں عقیدہ اور عمل کی ہم آہنگی کو اہمیت دی گئی ہے، تاکہ انسان اپنے اندرونی سکون کو حاصل کرے اور فلاح کی راہ پر گامزن ہو۔

اسلامی تعلیمات میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ ایمان اور عمل کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا" :جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیے، ان کے لیے جنت کی بشارت ہے "(سورہ البقرہ، 2:25)۔ اس آیت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایمان کا

درست ہونا اور عمل کا درست ہونا دونوں ایک دوسرے کے لیے ضروری ہیں۔ اس لیے انسان کو ہمیشہ یہ کوشش کرنی چاہیے کہ اس کے عقائد اور اعمال میں ہم آہنگی ہو، تاکہ وہ سکون اور فلاح کی زندگی گزار سکے۔

ذہنی الجھن سے نجات پانے کا ایک اہم طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے عقائد کو فطری اصولوں سے ہم آہنگ کرے، جیسا کہ آپ نے ذکر کیا۔ جب انسان اپنے عقائد کو فطرت کے مطابق ڈھالتا ہے، تو وہ اندر سے مطمئن ہوتا ہے، کیونکہ فطری اصول ہمیشہ سچائی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ حضرت امام علی علیہ السلام نے فرمایا" :انسان اپنی فطرت کی پیروی کرے تو کبھی گمراہ نہیں ہوتا"۔ اس بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کا فطری اصولوں سے ہم آہنگ رہنا اس کی ذہنی سکونت کے لیے ضروری ہے۔

ذہنی الجھن کی حالت میں، انسان کو سب سے پہلے اپنے عقائد پر غور و فکر کرنا چاہیے۔ یہ غور و فکر اسے اپنے عقائد کے بارے میں مزید واضح کرنے میں مدد دیتا ہے اور اس کے اندر پیدا ہونے والی الجھن کو دور کرتا ہے۔ اسلام میں تدبر اور تفکر کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کا قول ہے" :جس شخص نے تفکر کو اپنا شیوہ بنایا، وہ ہر مسئلے کا حل پا لیتا ہے"۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان کو اپنے عقائد میں اتنی گہرائی سے غور کرنا چاہیے کہ وہ اپنے اعمال کو اپنے عقائد کے مطابق ڈھال سکے۔

اسی طرح، انسان کو اپنے اعمال کو بھی اپنی سوچ اور عقائد کے مطابق بہتر بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب انسان اپنے اعمال میں اللہ کی رضا کو مدنظر رکھتا ہے اور اپنی سوچ کے مطابق

عمل کرتا ہے، تو وہ ذہنی سکونت کی حالت میں ہوتا ہے اور اس کا اندرونی تضاد ختم ہو جاتا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا" :جو لوگ اللہ کی رضا کی خاطر کام کرتے ہیں، ان کے لیے ان کے اعمال کی بہترین جزا ہے "(سورہ النحل، 16:97)۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ انسان کو اپنے اعمال میں اللہ کی رضا کو مقصد بنانا چاہیے، تاکہ وہ اپنی زندگی میں سکون اور کامیابی حاصل کرے۔

مزید برآں، ذہنی الجھن سے بچنے کے لیے انسان کو اپنی زندگی میں توازن قائم رکھنا ضروری ہے۔ جب انسان اپنے عقائد، اعمال اور مقصد میں توازن برقرار رکھتا ہے، تو اس کا ذہن صاف رہتا ہے اور وہ سکون محسوس کرتا ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا: "توازن میں رہنا کامیابی کی سب سے بڑی علامت ہے"۔ اس قول سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان کو اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں میں توازن قائم رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ ذہنی الجھن سے بچ سکے اور کامیاب زندگی گزار سکے۔

آخرکار، ذہنی الجھن کا جال انسان کی زندگی میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اس کے عقائد اور اعمال میں تضاد ہوتا ہے۔ اس تضاد کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے عقائد کو فطری اصولوں سے ہم آہنگ کرے، اپنی سوچ اور عمل میں ہم آہنگی پیدا کرے اور اپنی زندگی میں توازن برقرار رکھے۔ اس کے لیے تدبر، تفکر اور عمل کی ضرورت ہے تاکہ انسان اپنے اندرونی سکون کو حاصل کر سکے اور فلاح کی راہ پر گامزن ہو سکے۔

فطرت کیا ہوتی ہے؟!

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ کسی چیز کی فطرت کے اثرات اور مقاصد پر غور کرنا ضروری ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر چیز ایک خاص نظام اور قانون کے تحت وجود میں آتی ہے اور اس کا ایک معین مقصد ہوتا ہے۔ فطرت اصل میں وہ خاصیت یا صفت ہے جو کسی وجود کے ساتھ اس کے خالق یا موجد کی جانب سے منسلک ہوتی ہے، اور اسی خاصیت کے ذریعے وہ اپنے مقصد کو پورا کرتا ہے۔

مثال کے طور پر، سورج کی فطرت یہ ہے کہ وہ روشنی اور گرمی فراہم کرے۔ اس کے اثرات یہ ہیں کہ روشنی سے دن کا اجالا ممکن ہوتا ہے اور گرمی زندگی کی بقا کے لیے ضروری عوامل کو متحرک کرتی ہے۔ اسی طرح پانی کی فطرت یہ ہے کہ وہ گیلا کرے، اور اس کے اثرات یہ ہیں کہ وہ پیاس بجھانے، صفائی کرنے اور زراعت کے لیے لازمی ہے۔ گاڑی کی فطرت یہ ہے کہ وہ تیزی سے سفر ممکن بنائے، اور اس کے اثرات یہ ہیں کہ وہ وقت کی بچت کرتے ہوئے مسافروں کو ان کی منزل تک پہنچاتی ہے۔

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہر وجود کا ایک معین نظام ہوتا ہے، جسے ہم اس کی فطرت کہتے ہیں۔ جب اس وجود کو اس کے اصل مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، تو وہ

اپنے مطلوبہ اثرات پیدا کرتا ہے۔ لیکن اگر اس وجود کو اس کے بنیادی مقصد سے ہٹا کر کسی اور طریقے سے استعمال کیا جائے، تو اس کے اثرات یا تو کم ہو جاتے ہیں یا ختم ہو جاتے ہیں۔ ایسے حالات میں ہم اسے "غیر فطری" کہہ سکتے ہیں، کیونکہ وہ اپنے خالق کی جانب سے دی گئی فطری ترتیب یا نظام سے ہٹ چکا ہوتا ہے۔

یہ بات اہم ہے کہ فطرت اصل میں ایک نظام یا قانون ہے، جس کے تحت ہر وجود خلق کیا گیا ہے۔ یہ قانون اس وجود کے مقصد اور اس کے اثرات کو واضح کرتا ہے۔ جب کسی چیز کو اس کے معین اصولوں کے مطابق استعمال کیا جاتا ہے، تو اس کے نتائج بھی ویسے ہی سامنے آتے ہیں جیسا کہ اس کے خالق نے متعین کیے تھے۔ لیکن جب اس اصول یا مقصد سے انحراف کیا جائے، تو نہ صرف اس کے اثرات کمزور ہو جاتے ہیں بلکہ وہ وجود خود بھی اپنی اصل سے دور ہو جاتا ہے۔

لہٰذا، فطرت کا مفہوم صرف کسی چیز کی طبیعی یا قدرتی حالت تک محدود نہیں ہے، بلکہ یہ ایک جامع نظام ہے جو کسی وجود کے مقصد اور اس کے اثرات کو بھی واضح کرتا ہے۔ فطرت دراصل کسی بھی وجود کی تخلیق کا وہ قانون ہے جو اس کے وجود کی غایت اور اس کے اثرات کو متعین کرتا ہے۔

آیئے ان مطالب کو تھوڑی وضاحت سے دیکھتے ہیں۔ فطرت دراصل کسی وجود کے اندر وہ خاصیت یا نظام ہے جسے اس کے خالق نے اسے تفویض کیا ہے تا کہ وہ اپنے مقصد کو پورا کر

سکے اور اس کے اثرات ظاہر ہوں۔ یہ قانون یا نظام وجود کی ہر شکل میں نمایاں ہوتا ہے، چاہے وہ طبیعی ہو، انسانی و سماجی ہو، یا انسان ساختہ ہو۔ ہر وجود اپنے اندر ایک مقصد رکھتا ہے اور اس کے اثرات اسی مقصد سے جڑے ہوتے ہیں۔ اگر اس مقصد سے ہٹ کر اسے استعمال کیا جائے یا اس کے اصولوں سے انحراف کیا جائے، تو وہ غیر فطری ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر، سورج کو دیکھیں۔ سورج کی فطرت یہ ہے کہ وہ روشنی اور گرمی فراہم کرے۔ اس کا مقصد زمین پر زندگی کے لیے ضروری توانائی مہیا کرنا اور ماحول کو متوازن رکھنا ہے۔ اس کے اثرات یہ ہیں کہ دن کی روشنی سے ہمیں دیکھنے کی صلاحیت ملتی ہے، زمین گرم ہوتی ہے، اور زراعت ممکن ہوتی ہے۔ اگر کسی طرح سورج کی روشنی یا گرمی کا یہ نظام ختم ہو جائے یا اس میں خلل پڑ جائے، تو زمین پر زندگی برقرار نہیں رہ سکتی۔ یہی اس کی فطرت کا بنیادی پہلو ہے۔

پانی کی مثال لیں۔ پانی کی فطرت یہ ہے کہ وہ گیلے پن کا حامل ہو اور اشیاء کو تر کرے۔ اس کا مقصد زندگی کو برقرار رکھنا، پیاس بجھانا، زمین کو زرخیز بنانا، اور صفائی کو ممکن بنانا ہے۔ اگر پانی اپنی فطرت کھو دے، یعنی گیلا نہ کرے یا جم کر پتھر بن جائے، تو اس کے اثرات زندگی پر مہلک ہو سکتے ہیں۔ یہی پانی کی فطرت کا نظام ہے، جو اس کے مقصد اور اثرات کو واضح کرتا ہے۔

انسانی وجود کی طرف آئیں تو انسان کی فطرت میں سوچنا، سمجھنا، اور عمل کرنا شامل ہے۔ اس کا مقصد اپنی زندگی کو بہتر بنانا، معاشرتی تعلقات قائم کرنا، اور اللہ کی بندگی کرنا ہے۔ ان فطری خصوصیات کے اثرات انسانی ترقی، اخلاقی اقدار، اور سماجی ہم آہنگی کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن اگر انسان اپنی فطرت سے ہٹ کر چلنے لگے، یعنی سوچنے کے بجائے جذبات کے بہاؤ میں بہہ جائے یا دوسروں کے حقوق پامال کرے، تو اس کی فطرت سے انحراف نہ صرف اسے نقصان پہنچاتا ہے بلکہ معاشرے کو بھی بگاڑ دیتا ہے۔

سماجی نظام کی مثال لیں، تو شادی کو دیکھ سکتے ہیں۔ شادی کی فطرت مرد اور عورت کے درمیان ایک پاکیزہ تعلق قائم کرنا اور نسل انسانی کو آگے بڑھانا ہے۔ اس کے اثرات خاندان کی تشکیل، محبت، اور ذمہ داری کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن اگر شادی کو صرف ذاتی خواہشات کی تسکین کے لیے استعمال کیا جائے یا اس میں فطری اصولوں کی خلاف ورزی ہو، تو اس کے اثرات بگاڑ اور سماجی عدم استحکام کی صورت میں نظر آتے ہیں۔

انسان ساختہ چیزوں میں گاڑی ایک بہترین مثال ہے۔ گاڑی کی فطرت یہ ہے کہ وہ لوگوں اور اشیاء کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جلدی اور آسانی سے منتقل کرے۔ اس کا مقصد وقت کی بچت اور زندگی کو آسان بنانا ہے۔ اس کے اثرات تیز سفر، سہولت، اور معاشی ترقی کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ لیکن اگر گاڑی کو غلط استعمال کیا جائے، جیسے کہ بہت زیادہ رفتار سے چلایا جائے یا اسے نقصان پہنچایا جائے، تو نہ صرف یہ اپنے مقصد کو پورا کرنے میں ناکام ہوگی بلکہ یہ نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔

یہی اصول انسان کی دیگر تخلیقات پر بھی لاگو ہوتا ہے، جیسے کمپیوٹر یا موبائل فون۔ ان کی فطرت معلومات کو آسانی سے محفوظ اور منتقل کرنا ہے، اور ان کے اثرات تیز تر مواصلات، سیکھنے کے نئے ذرائع، اور کاروباری ترقی کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ان کا استعمال صرف وقت ضائع کرنے یا اخلاقی بگاڑ کے لیے کیا جائے، تو یہ اپنے مقصد سے ہٹ جاتے ہیں اور غیر فطری استعمال کی مثال بن جاتے ہیں۔

فطرت دراصل ہر وجود کے لیے وہ نظام ہے جو اس کے مقصد اور اثرات کو متعین کرتا ہے۔ چاہے وہ سورج ہو، پانی ہو، انسان ہو، سماجی ادارے ہوں، یا انسان ساختہ اشیاء، ہر ایک کی فطرت میں ایک خاص مقصد اور اثرات موجود ہیں۔ جب ان کے اصولوں کے مطابق عمل کیا جائے تو یہ خیر کے حامل ہوتے ہیں، لیکن جب ان اصولوں سے انحراف کیا جائے تو نقصان اور بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ یہی فطرت کا وہ قانون ہے جس پر غور کرنا ضروری ہے۔

کارپوریٹ محبت

(سرمایہ داری نظام کا پیدا کردہ محبت کا تصور)

کارپوریٹ محبت سے مراد وہ تصور ہے جس میں کمپنیاں انسانی جذبات، خاص طور پر محبت، اپنائیت اور تعلق کے احساس کو اپنے کاروباری مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ یہ محبت حقیقی انسانی جذبات کی بجائے ایک مصنوعی اور تجارتی شکل میں ظاہر ہوتی ہے، جس کا مقصد صارفین کی توجہ حاصل کرنا، ملازمین کی وفاداری بڑھانا، اور مالی منافع حاصل کرنا ہوتا ہے۔

یہ تصور سرمایہ داری نظام کی پیداوار ہے، جہاں محبت اور جذبات کو نفع کمانے کے ذرائع میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، کمپنیاں اپنی مصنوعات کو اس طرح پیش کرتی ہیں کہ وہ محبت اور جذبات کے اظہار کے لیے ضروری معلوم ہوں۔ ویلنٹائن ڈے، مدرز ڈے، یا دیگر مواقع کو تجارتی مواقع میں تبدیل کر دیا گیا ہے، جہاں یہ دکھایا جاتا ہے کہ محبت کا اظہار صرف تحائف اور مادی اشیاء کے ذریعے ممکن ہے۔

اسی طرح، کام کی جگہ پر بھی "کارپوریٹ محبت" کا استعمال کیا جاتا ہے۔ کمپنیاں اپنے ملازمین کے ساتھ ایک "کارپوریٹ فیملی" کا ماحول بنانے کی کوشش کرتی ہیں، تاکہ وہ زیادہ محنت اور

وفاداری کے ساتھ کام کریں۔ ملازمین سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ کمپنی کی محبت اور وفاداری کا جواب اپنی اضافی محنت سے دیں۔

تاہم، کارپوریٹ محبت حقیقی انسانی جذبات کی جگہ نہیں لے سکتی۔ یہ ایک مصنوعی تصور ہے جو عموماً استحصالی ہوتا ہے، جہاں محبت اور اپنائیت کو صرف کاروباری مفادات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے، محبت ایک بے غرض عمل ہے جو اخلاص، احترام، اور انسانیت پر مبنی ہے، نہ کہ مادی یا تجارتی مقاصد پر۔

کارپوریٹ محبت سرمایہ داری نظام کی پیداوار ہے، جس میں انسانی جذبات اور تعلقات کو تجارتی مفادات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس تصور کے تحت کمپنیاں محبت، اپنائیت اور تعلقات جیسے جذبات کو اپنے برانڈز اور مصنوعات کے فروغ کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ یہ عمل انسانی ضروریات اور جذبات کو نفع کے ذرائع میں تبدیل کر دیتا ہے۔

سرمایہ داری میں کمپنیاں اپنے اشتہارات اور مارکیٹنگ کے ذریعے اس تصور کو فروغ دیتی ہیں کہ محبت کا اظہار مادی اشیاء کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ تحائف، کارڈز، اور دیگر مصنوعات کو انسانی جذبات کے اظہار کے لیے ضروری بنادیا گیا ہے۔ خاص مواقع، جیسے ویلنٹائن ڈے یا سالگرہ، کو تجارتی مواقع میں تبدیل کر دیا گیا ہے، جہاں محبت کا معیار مادی تحفوں سے ناپا جاتا ہے۔ اس سے معاشرتی رویوں میں ایک تبدیلی آ گئی ہے، جہاں محبت اور تعلقات کی اصل روح کو تجارتی سامان سے جوڑ دیا گیا ہے۔

کام کی جگہ پر بھی کارپوریٹ محبت کا مظاہرہ دیکھا جا سکتا ہے۔ کمپنیاں "کارپوریٹ فیملی" کا تصور پیش کرتی ہیں، جس کے تحت ملازمین سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنی وفاداری اور جذبات کو کمپنی کے ساتھ منسلک کریں۔ اس کے لیے مختلف حکمت عملیوں کا استعمال کیا جاتا ہے، جیسے ٹیم ورک اور دوستانہ ماحول پیدا کرنا۔ تاہم، یہ سب کچھ اکثر ملازمین پر اضافی دباؤ ڈال دیتا ہے کہ وہ کمپنی کی محبت کا جواب زیادہ محنت اور وفاداری سے دیں۔ جذباتی محنت، خاص طور پر کسٹمر سروس کے شعبے میں، ملازمین سے یہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ خوش اخلاق اور ہمدرد نظر آئیں، چاہے وہ حقیقت میں ایسا نہ محسوس کر رہے ہوں۔ اس طرح کارپوریٹ محبت ایک استحصالی عمل میں تبدیل ہو جاتی ہے، جہاں ملازمین کی جذباتی صحت کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

سرمایہ داری نظام کی اس حکمت عملی نے سماجی اور ثقافتی اثرات مرتب کیے ہیں۔ محبت، جو کبھی اخلاص اور بے غرضی کی علامت تھی، اب مادی اشیاء سے جوڑ دی گئی ہے۔ تحائف اور اشیاء کے ذریعے محبت کا اظہار ایک ثقافتی معیار بن چکا ہے، جس سے حقیقی انسانی تعلقات متاثر ہو رہے ہیں۔ سرمایہ داری محبت کو ایک لین دین کی صورت میں پیش کرتی ہے، جہاں جذبات اور تعلقات کو تجارتی مصنوعات کے ذریعے ماپا جاتا ہے۔

اسلامی تعلیمات اس تصور کے برعکس ہیں۔ اسلام محبت اور تعلقات کو اخلاص، ایمان، اور بے غرضی کی بنیاد پر دیکھتا ہے۔ محبت کا مقصد خاندانی اور سماجی تعلقات کو مضبوط کرنا اور اللہ کی رضا حاصل کرنا ہے، نہ کہ اسے مادی اشیاء کے ذریعے ظاہر کرنا۔ اسلامی معیشت میں

تعلقات اور محبت کو تجارتی مقاصد کے لیے استعمال کرنا قابل قبول نہیں ہے۔ یہ تعلیمات اس بات پر زور دیتی ہیں کہ حقیقی محبت اور تعلقات انسانیت، احترام، اور اخلاص پر مبنی ہوں۔

کارپوریٹ محبت سرمایہ داری کا ایک پیچیدہ پہلو ہے، جو جذبات کو تجارتی فائدے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اگرچہ یہ عارضی طور پر تسکین فراہم کر سکتی ہے، لیکن اس کی اصل نوعیت انسانوں کے جذبات اور تعلقات کو نقصان پہنچاتی ہے۔ ایک متوازن زندگی کے لیے ضروری ہے کہ ہم حقیقی انسانی تعلقات کو مادی اشیاء پر ترجیح دیں اور محبت کو اس کی اصل روح کے مطابق سمجھیں، جیسا کہ اسلامی تعلیمات ہمیں رہنمائی فراہم کرتی ہیں۔

کارپوریٹوکریسی اور اس سے نجات

کارپوریٹوکریسی ایک ایسانظام حکومت یاطاقت کاڈھانچہ ہے جس میں بڑی کارپوریشنیں اور مالیاتی ادارے حکومت اور معاشرتی پالیسیوں پر بالادستی حاصل کرلیتے ہیں۔ اس نظام میں سیاسی اختیارات کامرکزعوامی مفاد کے بجائے کارپوریٹ مفادات بن جاتاہے۔ اس کامقصد زیادہ سے زیادہ منافع کمانا ہوتاہے، چاہے اس کے لیے قدرتی وسائل کی بے دریغ لوٹ مار، مزدوروں کے استحصال، یا مقامی ثقافتوں کی تباہی جیسے منفی اقدامات ہی کیوں نہ اٹھانے پڑیں۔ کارپوریٹوکریسی میں حکومتوں کو کارپوریشنز کے اثرورسوخ کے تحت چلایا جاتاہے، جہاں سیاستدان، قانون ساز، اور بیوروکریٹس کارپوریٹ فنڈنگ اور مراعات کے باعث عوامی مفادات کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔

سامراجی طاقتیں، جو بظاہر آزادی اور ترقی کے نعرے بلند کرتی ہیں، اس نظام کو اپنی اجارہ داری کو برقرار رکھنے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ ان طاقتوں کابنیادی مفاد یہ ہے کہ وہ کمزور اور ترقی پذیر ممالک کے وسائل پر قابو پا سکیں اور اپنی مصنوعات کے لیے نئے منافع بخش بازار پیدا کر سکیں۔ یہ طاقتیں کارپوریٹوکریسی کے ذریعے اپنے معاشی اور سیاسی ایجنڈے کو نافذ کرتی ہیں، جس میں عالمی مالیاتی ادارے، بین الاقوامی تجارتی معاہدے، اور مقامی حکومتوں پر دباؤ ڈالنے کے لیے قرضے شامل ہیں۔ ترقی پذیر ممالک کو قرضوں کے جال میں

پھنسا کر ان کی خود مختاری کو کمزور کیا جاتا ہے، اور ان کی پالیسیوں کو اس طرح سے ڈھالا جاتا ہے کہ وہ بین الاقوامی کارپوریشنوں کے مفادات کو پورا کریں۔

کارپوریٹوکریسی مختلف طریقوں سے کام کرتی ہے۔ یہ مقامی وسائل کو بڑے پیمانے پر حاصل کرنے کے لیے حکومتوں کے ساتھ معاہدے کرتی ہے، مزدوروں کو کم اجرت پر کام کرنے پر مجبور کرتی ہے، اور مقامی معیشتوں کو عالمی منڈی کے تابع بنا دیتی ہے۔ کارپوریٹ میڈیا عوامی شعور کو متاثر کرنے کے لیے بیانیے تخلیق کرتا ہے جو ان کے ایجنڈے کو تقویت بخشتے ہیں۔ مزید بر آں، قانونی اور عدالتی نظام کو بھی کارپوریٹ مفادات کی حمایت کے لیے تبدیل کر دیا جاتا ہے تاکہ ان کے اقدامات کو قانونی تحفظ فراہم کیا جا سکے۔

کارپوریٹوکریسی کے دنیا پر کئی منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہ نظام قدرتی وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم اور ماحولیاتی تباہی کا سبب بنتا ہے، کیونکہ کارپوریشنز صرف قلیل مدتی منافع پر توجہ دیتی ہیں۔ اس سے سماجی عدم مساوات میں اضافہ ہوتا ہے، کیونکہ دولت کا بڑا حصہ چند ہاتھوں میں مرکوز ہو جاتا ہے، جبکہ غریب اور محنت کش طبقہ مزید پسماندگی کا شکار ہوتا ہے۔ مقامی ثقافتیں اور روایات ختم ہوتی ہیں کیونکہ کارپوریٹ برانڈنگ اور مصنوعات مقامی شناخت کو مٹا دیتی ہیں۔ سیاسی نظام غیر جمہوری اور کرپٹ ہو جاتا ہے، کیونکہ حکومتیں عوامی مسائل حل کرنے کے بجائے کارپوریشنز کی خدمت میں لگی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ، کارپوریٹوکریسی بین الاقوامی تنازعات اور جنگوں کو بھی ہوا دیتی ہے تاکہ ہتھیاروں کی صنعت اور قدرتی وسائل پر قبضے کے ذریعے منافع حاصل کیا جا سکے۔

مختصراً، کارپوریٹوکریسی ایک ایسا نظام ہے جو دنیا کو عدم مساوات، استحصال، اور ماحولیاتی بحران کی طرف دھکیل رہا ہے۔ سامراجی طاقتیں اس نظام کو اپنی سلطنت کو مضبوط کرنے کے لیے استعمال کرتی ہیں، جس کے نتیجے میں کمزور ممالک اور عوام مزید مشکلات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کے خاتمے کے لیے ضروری ہے کہ عالمی سطح پر عوامی شعور اجاگر کیا جائے اور نظام کی اصلاح کے لیے جدوجہد کی جائے۔

کارپوریٹوکریسی سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے ایک جامع اور مربوط حکمت عملی درکار ہے، جو سماجی شعور، سیاسی اقدامات، اور معاشی اصلاحات کے ذریعے نافذ کی جا سکتی ہے۔ سب سے پہلا قدم عوامی شعور کو بیدار کرنا ہے تاکہ لوگ اس نظام کے مضر اثرات کو سمجھ سکیں۔ تعلیم اور میڈیا کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے تاکہ عوام کو آگاہ کیا جائے کہ کارپوریٹوکریسی کس طرح ان کے وسائل، حقوق، اور مستقبل کو نقصان پہنچا رہی ہے۔ سماجی تحریکوں اور تنظیموں کا کردار بھی اہم ہے، جو لوگوں کو منظم کر کے ان کی آواز کو طاقت دے سکتی ہیں۔

معاشی اصلاحات کا نفاذ بھی ضروری ہے۔ حکومتوں کو چاہیے کہ وہ کارپوریشنوں پر سخت قوانین نافذ کریں، ان کے منافع پر ٹیکس لگائیں، اور غیر منصفانہ تجارتی معاہدوں کو ختم کریں۔ قدرتی وسائل کو قومی ملکیت میں لانا اور ان کے استعمال کے لیے شفاف اور منصفانہ نظام وضع کرنا بھی ناگزیر ہے۔ اس کے علاوہ، مقامی صنعتوں اور کاروباروں کو فروغ دینے کی

ضرورت ہے تاکہ معیشت مقامی سطح پر مضبوط ہو اور لوگ کارپوریشنوں پر انحصار کم کر سکیں۔

سیاسی سطح پر، عوام کو ایسے رہنما منتخب کرنے چاہییں جو کارپوریٹ اثرورسوخ سے آزاد ہوں اور عوامی مفادات کو ترجیح دیں۔ انتخابی نظام میں اصلاحات کی جائیں تاکہ دولت اور طاقت کا سیاست پر اثر کم ہو سکے۔ سیاسی جماعتوں کی فنڈنگ کو شفاف بنایا جائے تاکہ کارپوریٹ سرمایہ کاری کے ذریعے پالیسیوں پر اثرانداز ہونے کا عمل ختم کیا جا سکے۔

ماحولیاتی تحفظ کے اقدامات بھی اس جنگ میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ عوامی دباؤ کے ذریعے حکومتوں کو مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ ماحولیاتی قوانین سخت کریں اور کارپوریشنوں کو ماحولیاتی نقصان کے ذمہ دار ٹھہرائیں۔ پائیدار طرزِ زندگی کو فروغ دینا اور قدرتی وسائل کا دانشمندانہ استعمال اس نظام کی جڑوں کو کمزور کر سکتا ہے۔

ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ عوام کو اپنی روزمرہ زندگی میں ایسے اقدامات کرنے چاہییں جو کارپوریٹ طاقت کو کمزور کریں۔ مثلاً، مقامی مصنوعات خریدیں، چھوٹے کاروباروں کی حمایت کریں، اور غیر ضروری صارفیت سے گریز کریں۔ سوشل میڈیا اور دیگر ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کے ذریعے کارپوریشنوں کی غیر اخلاقی پالیسیوں کے خلاف مہم چلائی جا سکتی ہے تاکہ انہیں عوامی دباؤ کے تحت اپنے طریقوں میں تبدیلی لانے پر مجبور کیا جا سکے۔

عالمی سطح پر اتحاد بھی کارپوریٹوکریسی کے خلاف ایک مضبوط ہتھیار ہے۔ ترقی پذیر ممالک کو ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے تاکہ وہ سامراجی طاقتوں کے دباؤ کا سامنا کر سکیں۔ مشترکہ معاشی اور تجارتی پالیسیوں کے ذریعے ان ممالک کو خود کفیل بننے اور اپنے وسائل کی حفاظت کرنے کا موقع فراہم کیا جاسکتا ہے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ جدوجہد مستقل اور متحرک رہے۔ کارپوریٹوکریسی ایک مضبوط نظام ہے جو مختلف طریقوں سے اپنا دفاع کرتا ہے، لیکن اگر عوام متحد ہو جائیں، سیاسی اور معاشی اصلاحات نافذ ہوں، اور سماجی شعور بلند کیا جائے، تو یہ نظام کمزور ہو سکتا ہے اور بالآخر ختم کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے صبر، حکمت، اور مسلسل کوشش کی ضرورت ہے تاکہ دنیا کو ایک منصفانہ اور پائیدار نظام کی طرف لے جایا جاسکے۔

ماضی، ہدایت کا موثر ذریعہ

ماضی کو مثالی سمجھنے کا رجحان انسانی فطرت کا ایک عام پہلو ہے۔ ہم عموماً ماضی کے واقعات کو یاد کرتے وقت صرف ان کی مثبت باتوں پر توجہ دیتے ہیں اور ان کے ساتھ جڑی مشکلات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ رویہ ہمیں ایک ایسی خیالی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں ماضی ہر لحاظ سے بہتر اور کامل لگتا ہے، اور موجودہ دور کی حقیقتوں کو کم تر سمجھا جاتا ہے۔ اس تصوراتی ماضی کا شکار ہو جانا ہمیں نہ صرف حال کی نعمتوں کو پہچاننے سے روکتا ہے بلکہ ہماری ترقی اور آگے بڑھنے کی صلاحیت کو بھی محدود کر دیتا ہے۔

ماضی کے بارے میں مثبت خیالات رکھنا، ان سے سبق لینا، اور ان کی یاد کو زندہ رکھنا یقیناً اہم ہے، لیکن ان خیالات کو اس حد تک بڑھا دینا کہ وہ ہماری موجودہ زندگی پر حاوی ہو جائیں، غیر متوازن طرزِ فکر کی نشانی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر دور کے اپنے مسائل اور چیلنجز ہوتے ہیں، اور ماضی کو مثالی سمجھنا ان چیلنجز کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے جن کا سامنا اس وقت کے لوگوں کو کرنا پڑا تھا۔ اگر ہم صرف ماضی کی روشنی میں حال کو پرکھیں اور موجودہ وقت کی ترقیوں اور مواقع کو نظر انداز کریں، تو ہم ان امکانات کو کھو بیٹھتے ہیں جو ہمیں اپنے حال کو بہتر بنانے اور مستقبل کی تیاری کرنے میں مددگار ہو سکتے ہیں۔

ماضی کو مثالی سمجھنے کے بجائے ہمیں حال کو اپنانا سیکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں " :فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا "(بے شک تنگی کے ساتھ آسانی بھی ہے)۔ یہ آیت ہمیں یہ سمجھاتی ہے کہ ہر دور میں چیلنجز کے ساتھ مواقع بھی موجود ہوتے ہیں، اور ان مواقع کو پہچاننا اور ان سے فائدہ اٹھانا ہمارے اختیار میں ہے۔

حال کو قبول کرنے کا مطلب ہے کہ ہم اپنی موجودہ حقیقت کا سامنا کریں، اس کی خوبیاں اور خامیاں سمجھیں، اور ان بنیادوں پر ایک بہتر مستقبل کی تعمیر کریں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی توانائی ماضی کی یادوں میں کھونے کے بجائے اپنے حال کی تعمیر میں لگائیں۔ ہمیں اپنی موجودہ ذمہ داریوں کو سمجھنا ہوگا، ان کا صحیح انداز میں سامنا کرنا ہوگا، اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے منصوبہ بندی کرنی ہوگی۔

ماضی کی یادوں کو ہماری رہنمائی کا ذریعہ بننا چاہیے، نہ کہ ہماری راہ میں رکاوٹ۔ ہمیں ان سے سبق لینا چاہیے اور ان مثبت پہلوؤں کو اپنانا چاہیے جو ہمارے حال اور مستقبل کو سنوار سکیں۔ ماضی کی محبت کو حال کی حقیقتوں اور مستقبل کی تیاری کے ساتھ جوڑنے سے ہم ایک متوازن زندگی گزار سکتے ہیں جو نہ صرف ہمارے لیے فائدہ مند ہو بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی مشعل راہ بنے۔

ماضی اور تاریخ انسانی زندگی کے لیے ایک نہایت اہم ذریعہ ہے جس کے ذریعے ہم اپنے حال کو بہتر بنا سکتے ہیں اور مستقبل کے لیے رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ تاریخ کو صرف ایک کہانی سمجھ کر فراموش کر دینا یا اس میں محض جذباتی دلچسپی لینا درحقیقت اس کے حقیقی

مقصد کو نظر انداز کرنا ہے۔ تاریخ کا اصل مقصد یہ ہے کہ ہم اس سے سبق حاصل کریں، ان تجربات اور اصولوں کو سمجھیں جو مختلف قوموں کی کامیابی یا زوال کا سبب بنے، اور انہیں اپنے حالات کے مطابق ڈھال کر اپنی زندگی اور معاشرت کو بہتر بنائیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی مقامات پر ماضی کی قوموں اور ان کے واقعات کو بیان کیا ہے تاکہ ہم ان سے سبق حاصل کریں۔ مثلاً قومِ عاد، ثمود، اور فرعون کے قصے صرف داستانیں نہیں ہیں بلکہ یہ بتاتے ہیں کہ جب انسان نے غرور، ناانصافی، یا فطری قوانین کی خلاف ورزی کی، تو وہ زوال کا شکار ہوا۔ قرآن میں ان واقعات کے ذریعے اللہ نے یہ واضح کیا ہے کہ کامیابی کا راز عدل، تقویٰ، اور حق کی پیروی میں ہے، اور زوال کا سبب تکبر، ظلم، اور نافرمانی ہے۔

ماضی کے رہنماؤں کو موجودہ دور کی شخصیات میں تلاش کرنا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ تاریخ میں ایسے بے شمار رہنما ملتے ہیں جنہوں نے اپنے وقت کے چیلنجز کا سامنا حکمت اور جرات کے ساتھ کیا اور اپنی قوموں کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ آج کے دور میں بھی ہمیں ایسے افراد اور کردار تلاش کرنے ہوں گے جو انہی اصولوں پر عمل کرتے ہوئے ہماری رہنمائی کر سکیں۔ یہ کام اس وقت ممکن ہو گا جب ہم ماضی کی شخصیات کو محض تعریفی کلمات کے لیے نہ دیکھیں بلکہ ان کے اعمال اور افکار کا گہرا مطالعہ کریں اور ان اصولوں کو سمجھیں جن پر انہوں نے اپنی زندگی استوار کی۔

اسی طرح ماضی کے واقعات کو حال پر منطبق کرنے کا مطلب ہے کہ ہم ان حالات اور مسائل کا جائزہ لیں جن کا سامنا ماضی کی قوموں کو تھا اور یہ دیکھیں کہ انہوں نے ان سے کیسے نبرد آزما ہو کر کامیابی حاصل کی یا ناکامی کا سامنا کیا۔ ان تجربات کو موجودہ دور کے مسائل پر لاگو کر کے ہم اپنے چیلنجز کے لیے مؤثر حل تلاش کر سکتے ہیں۔ مثلاً، اگر ہم ماضی کے علمی زوال کے اسباب کا جائزہ لیں، تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ کس طرح علم کی اہمیت کو نظر انداز کرنا اور اتحاد کو پس پشت ڈالنا ایک قوم کے زوال کا باعث بنتا ہے۔ اس کے برعکس، جب ہم ان قوموں کو دیکھتے ہیں جنہوں نے علم، اتحاد، اور اخلاقی اصولوں کو اپنایا، تو وہ ترقی کی بلندیوں پر پہنچ گئیں۔

تاریخ کو ایک آئینہ سمجھا جا سکتا ہے جو ہمیں اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کو پہچاننے کا موقع دیتا ہے اور ہمیں ان اصولوں کی طرف لوٹنے کی ترغیب دیتا ہے جو ہمیشہ سے کامیابی کے ضامن رہے ہیں۔ ان اصولوں کو اپنے حال میں شامل کر کے ہم نہ صرف اپنی زندگی میں مثبت تبدیلی لا سکتے ہیں بلکہ اپنی آنے والی نسلوں کے لیے بھی ایک روشن مستقبل کا راستہ ہموار کر سکتے ہیں۔

اس لیے ضروری ہے کہ ہم ماضی کو صرف ایک رومانوی انداز میں نہ دیکھیں بلکہ اس سے حکمت، بصیرت، اور فطری قوانین اخذ کریں۔ ان اصولوں کو اپنی زندگی میں عملی طور پر نافذ کریں اور اپنے معاشرتی، اقتصادی، اور روحانی مسائل کے حل کے لیے استعمال کریں۔ یہی طریقہ ہے جو ہماری زندگی کو حقیقت میں کامیاب اور بامقصد بنا سکتا ہے۔

محبت کیا ہے؟

محبت کے غلط معنی لینا (Misunderstanding Love) ایک عام نفسیاتی رجحان ہے جس میں محبت کو صرف جذباتی تعلق یا جنس مخالف کے ساتھ وابستگی تک محدود سمجھا جاتا ہے۔ حقیقت میں محبت ایک وسیع اور عمیق جذبہ ہے جو نہ صرف انسان کے جذباتی اور جسمانی پہلو کو چھوتی ہے، بلکہ اس میں ایثار، احترام، قربانی اور دوسروں کی بھلائی کے لیے کام کرنے کی صلاحیت بھی شامل ہوتی ہے۔ جب ہم محبت کو صرف اپنی خواہشات اور ضروریات کے دائرے میں محدود کر دیتے ہیں، تو ہم اس کے حقیقی مفہوم اور گہرائی سے غافل رہ جاتے ہیں۔

اسلامی تعلیمات میں محبت کو ایک انتہائی اہم مقام دیا گیا ہے، اور یہ صرف جسمانی تعلقات تک محدود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت، اور اہل بیت علیہ السلام کی محبت کو ایک اصولی اور روحانی سطح پر سمجھنا ضروری ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں" :اور جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے اعمال کیے، وہ اللہ سے زیادہ محبت رکھتے ہیں "(سورہ البقرہ، 2:165)۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ محبت کا اصل مفہوم اللہ کی رضا، اس کی ہدایت، اور اچھے اعمال کے ذریعے اس کے قریب ہونے سے ہے۔

محبت کی حقیقی نوعیت ایثار میں چھپی ہوتی ہے۔ جب ہم محبت کرتے ہیں تو ہم اپنی خواہشات کو کبھی کبھی پس پشت ڈال کر محبوب کی بھلائی کے لیے کام کرتے ہیں۔ محبت میں قربانی شامل ہے، اور یہ قربانی صرف جسمانی یا جذباتی وابستگی تک محدود نہیں ہوتی، بلکہ اس میں دوسرے شخص کے لیے اپنی آرام دہ زندگی کو قربان کرنا بھی شامل ہوتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا" :محبت وہ نہیں جو دل میں ہو، بلکہ وہ ہے جو عمل میں دکھائی دے"۔ اس قول میں امام علی علیہ السلام نے محبت کے عمل کو ہی اصل محبت قرار دیا ہے، جو دوسروں کے لیے ایثار، قربانی اور بھلائی کی صورت میں ظاہر ہو۔

جب محبت کو صرف ایک جذباتی وابستگی یا جسمانی تعلق کے طور پر دیکھا جاتا ہے تو اس میں اکثر خود غرضی کی بھی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ہم اپنی ضروریات اور خواہشات کو اولیت دیتے ہیں، اور یہ سوچتے ہیں کہ محبت صرف ہمارے لیے کچھ حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس نوعیت کی محبت زیادہ دیرپا اور پائیدار نہیں ہوتی، کیونکہ یہ ہمیشہ فرد کی ذاتی ضروریات اور توقعات پر مبنی ہوتی ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے محبت کا مطلب اپنی خواہشات کو خدا کی رضا اور دوسرے انسانوں کی بھلائی کے لیے قربان کرنا ہے۔

ایک حقیقی محبت میں محبوب کے لیے خود کو فنا کر دینا، اس کی خوشی اور سکون کے لیے اپنی زندگی کو وقف کرنا ہوتا ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کا کردار اس بات کا بہترین نمونہ ہے۔ امام حسین علیہ السلام نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی قربانی اپنی امت کی بھلائی اور

دین کی بقاء کے لیے دی۔ ان کی محبت اللہ کے ساتھ تھی اور اس محبت کی بنیاد پر انہوں نے اپنی جان، مال، اور اہل خانہ کی قربانی دی۔

محبت کی اصل روح کو سمجھنا اور اس میں ایثار اور قربانی کو شامل کرنا انسان کے لیے بہت ضروری ہے تاکہ وہ ایک سچی اور پائیدار محبت کا تجربہ کر سکے۔ جب محبت محض ذاتی خواہشات اور تقاضوں تک محدود ہو جاتی ہے، تو یہ خودغرضی کی صورت اختیار کر لیتی ہے، جو کہ کبھی بھی اصل سکون اور خوشی کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ حقیقی محبت وہ ہے جو دوسروں کی بھلائی، ان کے درد اور خوشی میں شریک ہونے، اور ان کے لیے خود کو قربان کرنے میں ظاہر ہو۔

محبت کی حقیقی نوعیت کو سمجھنا ہمیں اپنی زندگی کے مقصد کی جانب رہنمائی فراہم کرتا ہے، جس میں نہ صرف ہم اللہ کی رضا کو مقدم رکھتے ہیں بلکہ اپنے قریبی لوگوں، معاشرے اور پوری انسانیت کے لیے بھی محبت کے اصولوں پر عمل کرتے ہیں۔ اس طرح کی محبت ایک پائیدار رشتہ قائم کرتی ہے جو فطرت کے اصولوں اور دین کی ہدایات کے مطابق ہوتی ہے۔

محبت کو اگر صرف جذباتی تعلقات یا جسمانی رغبت تک محدود سمجھا جائے تو اس کی اصل روح سے غفلت برتی جاتی ہے۔ محبت کا مقصد صرف اپنی خواہشات اور ضرورتوں کو پورا کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا اصل مفہوم ایثار، قربانی، احترام، اور دوسروں کی بھلائی میں پایا جاتا ہے۔

اسلام میں محبت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور یہ محض جذبات یا تعلقات تک محدود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبروں سے محبت، انسانوں کے ساتھ حسن سلوک، اور دنیا و آخرت کی فلاح کے لیے کام کرنا، یہ سب محبت کی حقیقی شکلیں ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا ذکر کیا گیا ہے" : اللہ سے محبت کرنے والے وہ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اور عمل صالح کرتے ہیں "(سورہ آل عمران، 3:31)۔ اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ محبت کا اصل معیار ایمان اور اچھے اعمال ہیں، نہ کہ محض جذبات یا دنیاوی تعلقات۔

محبت کی حقیقی نوعیت کو سمجھنے کے لیے ہمیں اپنی ذاتی خواہشات اور ضروریات کو اس کے ذریعے سمجھنا چاہیے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا" : محبت وہ نہیں جو دل میں ہو، بلکہ وہ ہے جو عمل میں دکھائی دے "۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ محبت محض دل کے جذبات تک محدود نہیں ہوتی بلکہ یہ ہمارے عمل اور رویوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ محبت میں خود کو قربان کرنا، دوسرے کی بھلائی کے لیے جدوجہد کرنا اور اس کی خوشی میں شریک ہونا اس کی اصل حقیقت ہے۔

محبت کا مطلب ہمیشہ دوسروں سے اپنے مفادات کی قربانی دینا اور ان کی ضروریات کو اپنی خواہشات پر ترجیح دینا ہے۔ اس کے لیے ہمیں اپنی زندگی میں ایثار کی روح کو جگہ دینی چاہیے۔ جب ہم محبت کو صرف اپنے فائدے کے لیے دیکھتے ہیں، تو یہ ایک خود غرضی کی صورت اختیار کر لیتی ہے، جس سے نہ صرف رشتہ کمزور ہوتا ہے بلکہ دل میں فاصلہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ حقیقت میں محبت کا مفہوم یہ ہے کہ ہم اپنے محبوب کے لیے اپنی خواہشات اور

خواہشوں کو قربان کرنے کے لیے تیار ہوں، تاکہ اس کی خوشی اور سکون کی فضا پیدا ہو سکے۔

محبت کی اصل حقیقت میں قربانی ہے، جو کسی دوسرے شخص کے لیے اپنی آرام دہ زندگی کو ترک کرنے کی صلاحیت پر مبنی ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کا کردار اس کی بہترین مثال ہے۔ امام حسین علیہ السلام نے اپنے جان و مال کی قربانی دے کر انسانیت کو یہ سبق دیا کہ محبت کا اصل مفہوم اللہ کی رضا کے لیے اپنی جان تک قربان کرنا ہے۔ امام حسین علیہ السلام کی قربانی نے ہمیں سکھایا کہ محبت صرف جذباتی تعلقات تک محدود نہیں ہوتی، بلکہ یہ ایک اعلیٰ مقصد کے لیے اپنی تمام تر خواہشات کو پس پشت ڈالنے کا عمل ہے۔

محبت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ شخصی خود غرضی کو ختم کرتی ہے اور انسان کو دوسروں کی بھلا ئی کے لیے کام کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ محبت میں دوسروں کی خوشی، سکون اور فلاح کے لیے قربانی دی جاتی ہے، اور یہی قربانی محبت کی اصل حقیقت ہے۔ اس طرح کی محبت انسان کو روحانی سکون فراہم کرتی ہے اور اس کے اندر ایک بلند مقصد کی جستجو پیدا کرتی ہے، جو نہ صرف فرد کی فلاح کے لیے بلکہ پورے معاشرے کے لیے فائدہ مند ہوتی ہے۔

جب ہم محبت کو محض جسمانی تعلقات یا جذبات تک محدود کر دیتے ہیں تو ہم اس کے اصل مقصد سے غافل ہو جاتے ہیں۔ محبت کا اصل مفہوم یہ ہے کہ ہم دوسرے انسانوں کے ساتھ اپنے رشتہ کو اللہ کی رضا کے لیے استوار کریں، اور اس رشتہ میں ایثار، قربانی، اور بھلائی کو

شامل کریں۔ اس کے ذریعے نہ صرف ہم اپنے تعلقات کو مضبوط کرتے ہیں بلکہ اپنے اخلاقی اور روحانی مقام کو بھی بلند کرتے ہیں۔

محبت کے حقیقی مفہوم کو سمجھنا انسان کے لیے ایک روحانی سفر کی مانند ہے، جس میں وہ اپنے جذبات، خواہشات، اور مفادات کو ایک بلند مقصد کے لیے قربان کرتا ہے۔ اس طرح کی محبت انسان کو نہ صرف اندرونی سکون دیتی ہے بلکہ اس کے تعلقات میں بھی گہرائی اور پائیداری پیدا کرتی ہے۔

فرقہ پرستی سے کیا نقصانات ہوتے ہیں؟

سامراجی طاقتیں مسلمانوں میں تفرقہ پھیلانے کے لیے مختلف طریقے اپناتی ہیں۔ سب سے پہلے، وہ فرقہ وارانہ اور لسانی تقسیم کو بڑھاوا دیتی ہیں۔ مختلف مسلمانوں کے گروپوں کے درمیان اختلافات کو اُبھار کر، وہ ان کے درمیان دشمنی پیدا کرتی ہیں تاکہ ایک متحد مسلم معاشرہ وجود میں نہ آسکے۔ ان طاقتوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ مسلم دنیا کو داخلی طور پر کمزور کر دیں، تاکہ وہ عالمی سطح پر ایک مضبوط اور متحد موقف اختیار نہ کر سکیں۔

یہ طاقتیں وسائل اور حکومتی اداروں میں بھی تقسیم کی حکمت عملی اپناتی ہیں تاکہ مسلمانوں کے درمیان اعتماد کا فقدان ہو جائے۔ ان کا مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ مسلم ممالک کی سیاسی و اقتصادی ترقی میں رکاوٹ ڈالیں اور انہیں بیرونی طور پر بھی کمزور کر دیں۔ اس کے ذریعے وہ اپنے مفادات کے حصول کے لیے مسلم دنیا میں اختلافات اور کمزوری کا فائدہ اُٹھاتی ہیں۔

سامراجی طاقتیں مسلمانوں میں تفرقہ انگیزی کے ذریعے ایک ایسی حالت پیدا کرنا چاہتی ہیں جس میں مسلمان اپنے مشترکہ مسائل پر متفق نہ ہو سکیں اور ان کے اندر انتشار اور تقسیم کا ماحول برقرار رہے۔ اس طرح وہ اپنی حکمت عملیوں کو نافذ کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں اور مسلم دنیا کو اپنے مفادات کے تابع کر لیتی ہیں۔

سامراجی طاقتیں مسلمانوں میں تفرقہ پھیلانے کے لیے ذہنی اور ثقافتی سطح پر بھی حملے کرتی ہیں۔ وہ مسلمانوں کے تاریخی ورثے اور ایک مشترکہ شناخت کو مٹا دینے کی کوشش کرتی ہیں تاکہ وہ اپنے اصلی عقائد و اصولوں سے دور ہوں اور ان کی فطری یکجہتی کو کمزور کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ، وہ مختلف مسلم اقوام اور فرقوں کے درمیان فرقوں اور عقائد کی بنیاد پر اختلافات کو بڑھاوا دیتی ہیں، جیسے سنی اور شیعہ کے درمیان تنازعات کو اُبھار کر۔ اس طرح وہ مسلمانوں کو اپنے داخلی اختلافات میں مشغول کر کے انہیں عالمی سطح پر موثر طور پر مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہنے دیتی ہیں۔

ایک اور اہم طریقہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے تعلیمی اداروں اور میڈیا کے ذریعے ایک خاص قسم کا فکری ماحول پیدا کرتی ہیں، جس سے نوجوانوں کو ایک دوسرے کے خلاف اکسانا اور شدت پسندی کی طرف راغب کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ ان طاقتوں کا مقصد صرف داخلی اختلافات کو بڑھانا نہیں ہوتا بلکہ مسلمانوں کے درمیان ایک ایسا ذہنی خلاء پیدا کرنا بھی ہوتا ہے جس میں وہ اپنی اجتماعی جدوجہد کے بجائے فردی طور پر ٹوٹ کر رہ جائیں۔

سامراجی طاقتیں مسلمانوں میں تفرقہ انگیزی کے ذریعے ایک نفسیاتی جنگ بھی لڑ رہی ہوتی ہیں تاکہ مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ تصور بیٹھ سکے کہ ان کے اندر اختلافات بہت زیادہ ہیں اور وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس قسم کی حکمت عملی نہ صرف مسلم ممالک کے

سیاسی استحکام کو متاثر کرتی ہے بلکہ یہ مسلم دنیا کی عالمی سطح پر آواز کو بھی دبانے میں مدد دیتی ہے۔ ان طاقتوں کے لیے یہ تفرقہ انگیزی ایک مستقل ہتھیار بن جاتی ہے جس کے ذریعے وہ اپنی عالمی حکمت عملیوں کو زیادہ موثر طریقے سے نافذ کر پاتی ہیں۔

تفرقہ انگیزی کے نتیجے میں مسلمان معاشروں میں کئی قسم کے فساد جنم لیتے ہیں جو نہ صرف داخلی انتشار کا سبب بنتے ہیں بلکہ ان کے اجتماعی استحکام کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ جب مسلمان مختلف فرقوں یا قوموں میں تقسیم ہو جاتے ہیں، تو یہ ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور دشمنی کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر، معاشرتی ہم آہنگی کمزور پڑ جاتی ہے، اور افراد کی توجہ اپنے مشترکہ مسائل کے بجائے آپس کے اختلافات پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ اس سے نہ صرف فکری اور نظریاتی خلفشار بڑھتا ہے بلکہ ایک ہی کمیونٹی کے اندر شدید نوعیت کی تصادم اور فسادات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تصادم کئی صورتوں میں خودکش بمباری، فرقہ وارانہ فسادات، اور دہشت گردی کی شکل میں ظاہر ہو سکتے ہیں، جس سے معاشرتی امن تباہ ہو جاتا ہے اور لوگوں میں خوف وہراس پیدا ہوتا ہے۔

تفرقہ انگیزی کا ایک اور نقصان یہ ہے کہ یہ مسلم معاشروں کی سیاسی قوت کو بھی کمزور کرتی ہے۔ جب لوگ اپنے فرقہ وارانہ یا نسلی اختلافات میں ملوث ہو جاتے ہیں، تو وہ اپنی اجتماعی ترقی اور ایک مضبوط حکومتی نظام کے لیے مشترکہ جدوجہد کرنے کے بجائے اپنے فرقوں یا گروپوں کی حمایت میں متحرک ہو جاتے ہیں۔ اس سے نہ صرف حکومتی استحکام متاثر ہوتا ہے بلکہ یہ بیرونی قوتوں کے لیے مداخلت کا موقع فراہم کرتا ہے، جو داخلی انتشار کا فائدہ اٹھا

کر اپنے مفادات کو آگے بڑھا سکتی ہیں۔ اس طرح مسلم معاشروں میں ایک کمزور داخلی سٹرکچر پیدا ہوتا ہے جو عالمی سطح پر ان کی پوزیشن کو کمزور کر دیتا ہے۔

تفرقہ انگیزی کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر ایک عدم اعتماد کی فضا بھی پیدا ہوتی ہے، جس سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور یکجہتی کے بجائے شک و شبہات کی بنیاد پر فیصلے کرتے ہیں۔ اس سے معاشرتی ترقی، علم و تحقیق، اور معاشی ترقی میں رکاوٹیں آتی ہیں۔ مسلم اقوام کی آپس میں فکری ہم آہنگی اور تعاون کی کمی کے باعث وہ عالمی مسائل کے حل میں بھی مؤثر کردار ادا نہیں کر پاتیں۔ ان حالات میں، نہ صرف داخلی نقصان ہوتا ہے بلکہ مسلم دنیا عالمی سطح پر بھی اپنی طاقت اور اثر و رسوخ کو کھو دیتی ہے۔

تفرقہ انگیزی مسلمان معاشروں کی معیشت اور ثقافت و تہذیب پر گہرے منفی اثرات ڈالتی ہے۔ جب مسلمان مختلف فرقوں یا گروپوں میں بٹ جاتے ہیں، تو ان میں آپس کا تعاون اور یکجہتی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ تقسیم معاشی ترقی کے لیے ایک بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے کیونکہ افراد اور گروہ اپنے مفادات کو فوقیت دینے لگتے ہیں اور اجتماعی مقاصد کے حصول میں تعاون کرنے کے بجائے ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں۔ اس نتیجے میں تجارتی روابط، سرمایہ کاری، اور دیگر اقتصادی سرگرمیاں متاثر ہوتی ہیں، جس سے پورے معاشی نظام کو نقصان پہنچتا ہے۔ معاشرتی سرمایہ، جو کہ ایک ملک کی ترقی کا اہم حصہ ہے، ضائع ہو جاتا ہے کیونکہ لوگ اپنی ہی کمیونٹی کے مفاد کے بجائے اپنے فرقے کے مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔

ثقافت اور تہذیب کی سطح پر بھی تفرقہ انگیزی مسلمانوں کی مشترکہ وراثت کو نقصان پہنچاتی ہے۔ مسلمانوں کی ثقافت ہزاروں سالوں سے ایک متنوع اور غنی تاریخ پر مشتمل ہے، جس میں مختلف خطوں، اقوام اور فرقوں کی مشترکہ کوششوں سے ایک عظیم تہذیب پروان چڑھ چکی ہے۔ لیکن جب مسلمان فرقوں میں بٹ جاتے ہیں تو یہ مشترکہ ورثہ اور تہذیبی اقدار خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔ اس تفرقے کی وجہ سے مختلف ثقافتی روایات ایک دوسرے سے کٹ جاتی ہیں اور ہر فرقہ اپنی علیحدہ ثقافتی شناخت بنانے کی کوشش کرتا ہے، جس سے مجموعی طور پر مسلمانوں کی ثقافت میں یکجہتی اور ہم آہنگی کم ہو جاتی ہے۔

مزید یہ کہ تفرقہ انگیزی مسلمانوں کی علمی وفکری ترقی کو بھی محدود کرتی ہے۔ جب مختلف فرقوں یا گروپوں کے درمیان تصادم اور تنازعات بڑھتے ہیں، تو لوگ آپس میں معلومات کا تبادلہ اور مشترکہ منصوبوں پر کام کرنے کے بجائے اپنے اختلافات میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اس سے تعلیمی اداروں، تحقیقاتی اداروں اور ثقافتی سرگرمیوں میں کمی آتی ہے، جو کسی معاشرے کی ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ اس طرح تفرقہ انگیزی مسلمانوں کی معیشت اور ثقافت کو جمود کا شکار بنا دیتی ہے اور انہیں عالمی سطح پر اپنے اثر ورسوخ کو قائم رکھنے میں مشکلات پیش آتی ہیں۔

مسلمانوں کی اپنے ہی ہاتھوں خودکشی

ماضی کی تاریخ اور موجودہ وقت میں مسلمانوں کی حالت کا جائزہ لینے پر یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ وہ اپنی اصل قوتوں اور طاقتوں کو چھوڑ کر مختلف فکری، ثقافتی اور سیاسی محاذوں پر پسپائی اختیار کر چکے ہیں۔ اس میں سب سے بڑی وجہ مسلمانوں کی ترجیحات کا بدلنا اور دنیا کی عارضی خواہشات میں غرق ہونا ہے۔ مسلمانوں نے اپنی کامیابی کے حقیقی ذرائع، جو اسلام کی تعلیمات اور عقل و دانش کے اصولوں پر مبنی ہیں، ترک کر دیے ہیں اور اس کی جگہ دنیا کی عارضی خوشیوں اور لذتوں نے لے لی ہے۔ یہ تبدیلی ایک طرف مسلمانوں کی فکری اور روحانی حالت کو کمزور کرنے کا باعث بنی، تو دوسری طرف اس نے انہیں اندرونی طور پر تقسیم اور انتشار کا شکار کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے خلاف شیطانی و سامراجی طاقتوں نے اپنے اثرات کو مزید مستحکم کیا اور ان کی شکست کو دوچند کر دیا۔

اسلام میں عقل و دانش کو بہت بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ قرآن اور احادیث میں عقل کا استعمال اور اس کے ذریعے حقائق کو سمجھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی تاریخی کامیابیاں اس بات کا غماز ہیں کہ جب انہوں نے عقل و فہم کو اپنے مسائل کے حل کے لیے استعمال کیا، تو وہ دنیا کی عظیم ترین قوم بنے۔ لیکن جب مسلمانوں نے عقل کو ترک کر دیا اور

دنیاکی عارضی لذتوں کی طرف قدم بڑھایا، تو اس کا اثر ان کی فکری اور اخلاقی حالت پر پڑا۔ معاشرتی زندگی میں جو توازن اور کامیابی حاصل کی تھی، وہ تیزی سے کمزور ہونے لگی۔

اس فکری غفلت کے نتیجے میں مسلمانوں نے اپنے روحانی، معاشرتی اور سیاسی نظام میں انتشار پیدا کیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں نے اپنی ترجیحات میں تبدیلی کی اور عارضی لذتوں اور دنیوی خوشیوں کو ہمیشہ کے سکون اور اطمینان سے مقدم جانا۔ نتیجتاً، وہ اپنی اقدار، روایات اور دین سے دور ہوتے چلے گئے۔ اس کے علاوہ، مسلمانوں کی اندرونی تقسیم اور ایک دوسرے کے ساتھ اختلافات نے ان کی طاقت کو مزید کمزور کیا۔

شیطانی و سامراجی طاقتوں کا کردار اس بات کو مزید پیچیدہ بناتا ہے۔ جدید دور میں شیطانی و سامراجی طاقتوں نے مسلمانوں کو سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی سطح پر کمزور کر دیا ہے۔ ان طاقتوں نے نہ صرف مسلمانوں کی اندرونی طاقتوں کو شکست دی، بلکہ ان کے وسائل، معیشت اور معاشرتی ڈھانچے کو بھی اپنا تابع کر لیا۔ ان طاقتوں نے مسلمانوں کے اندر فکری انتشار پیدا کیا اور ان کی مذہبی، سیاسی، اور ثقافتی شناخت کو کمزور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مسلمانوں کی روحانیت اور علم کے حقیقی ذخائر کو چھوڑ کر شیطانی و سامراجی طاقتوں کی غلامی میں مبتلا ہونا، مسلمانوں کے لیے ایک بڑی ناکامی کی علامت بن چکا ہے۔

مسلمانوں کی شکست میں ان کی داخلی کمزوریوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ جب مسلمان اپنے فکری و روحانی ذرائع کو چھوڑ کر دنیا پرستی کی طرف راغب ہوئے، تو ان کی اجتماعیت، یکجہتی اور

قوت متزلزل ہوگئی۔ اس کا فائدہ شیطانی و سامراجی طاقتوں نے اٹھایا، جنہوں نے مسلمانوں کے درمیان اختلافات پیدا کر کے ان کی طاقت کو کمزور کر دیا۔ یہ اختلافات اور تقسیم نہ صرف مسلمانوں کے لیے داخلی طور پر نقصان دہ ثابت ہوئے، بلکہ عالمی سطح پر بھی ان کی پوزیشن کو متاثر کیا۔

اگر مسلمان اپنی اصل طاقت کو دوبارہ دریافت کریں اور اپنے فکری اور روحانی ذرائع کو اہمیت دیں، تو وہ نہ صرف اپنی داخلی حالت کو بہتر بنا سکتے ہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی اپنے حقوق اور مقام کو دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے دین اسلام کی تعلیمات، جو علم، حکمت اور عقل پر مبنی ہیں، کو زندگی کے تمام شعبوں میں نافذ کریں۔ ان کی کامیابی اس بات میں ہے کہ وہ دنیا کے عارضی فوائد کی جگہ اپنے روحانی، اخلاقی اور فکری خزانے کو دوبارہ اجاگر کریں اور اپنے اختلافات کو ختم کر کے ایک جرٔت کی طرف قدم بڑھائیں۔

اس مقصد کے لیے مسلمانوں کو اپنی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے اپنی تاریخ اور ثقافت کی اہمیت کو سمجھنا ہوگا اور شیطانی و سامراجی طاقتوں کی سازشوں کے خلاف اتحاد کے ذریعے ایک نیا روڈ میپ تیار کرنا ہوگا۔ جب تک مسلمان اپنی اصل شناخت، اصولوں اور تعلیمات کو نہیں اپنائیں گے، تب تک وہ نہ صرف شیطانی و سامراجی طاقتوں کے تسلط سے آزاد نہیں ہو سکتے، بلکہ اپنی فلاح و بہبود کی طرف بھی گامزن نہیں ہو سکتے۔

مغربی ممالک کی ترقی کی انسان سوز بنیادیں

مغربی طاقتوں کی ترقی کو اگر اخلاقی تناظر میں تجزیہ کیا جائے تو یہ ایک پیچیدہ اور متضاد حقیقت سامنے آتی ہے۔ مغربی طاقتوں کی ترقی کی بنیادیں اگرچہ سائنس، تعلیم، ٹیکنالوجی، اور اقتصادی نمو پر رکھی گئی ہیں، لیکن ان کی حقیقت میں پس پردہ ظلم، دھوکہ، استحصال، اور فریب کے کئی مظاہر پوشیدہ ہیں۔ یہ قوتیں بنیادی طور پر نیوکالونیل نظام کے تحت اپنے مفادات کے لیے دنیا کے دوسرے حصوں کو تسخیر کرتی رہی ہیں، اور ان کی ترقی کا ایک بڑا حصہ ان استعماری پالیسیوں اور عملوں سے جڑا ہوا ہے جن میں مقامی عوام کی طاقت چھینی گئی اور ان کی معاشی و سماجی ترقی کو محدود کیا گیا۔

تعلیمی میدان میں مغربی طاقتوں نے اپنے استعماری مقاصد کے لیے علم کو ایک طاقت کے طور پر استعمال کیا۔ تعلیم کو ایک ذریعہ بنایا گیا جس کے ذریعے مقامی تہذیبوں اور روایات کو کمزور کیا گیا اور ان کی جگہ مغربی نظریات کو مسلط کیا گیا۔ یہ عمل نہ صرف ثقافتی سطح پر ظلم تھا بلکہ علمی میدان میں بھی ایک فریب تھا کیونکہ مقامی علوم اور تدابیر کو اکثر نظرانداز کر دیا گیا۔ سائنسی تحقیق اور تعلیم کا ارتقاء مغربی دنیا میں ہوا، لیکن اس میں بھی ایک اخلاقی تضاد تھا کیونکہ زیادہ تر سائنسی ترقیوں کا مقصد یا تو جنگی مقاصد کو حاصل کرنا تھا یا پھر دوسرے علاقوں پر قبضہ جمانا تھا۔ ایٹمی ہتھیاروں کی تخلیق اور ان کا استعمال اس کا واضح مثال ہیں۔

سیاست میں مغربی طاقتوں نے جمہوریت اور آزادی کے علمبردار ہونے کا دعویٰ کیا، لیکن حقیقت میں انہوں نے اپنی سلطنتوں کو وسعت دینے اور اپنے مفادات کے لیے مقامی سیاست میں مداخلت کی۔ جب مغربی ممالک نے اپنی سیاسی طاقت کو پھیلایا، تو اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے مقاصد کے لیے دوسرے ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی، جمہوریت کو پامال کیا اور عوامی حقوق کو سلب کیا۔ ان کی سیاست نے طاقت کی بنیاد پر ظلم و جبر کا نظام قائم کیا جس میں مقامی رہنماؤں کو تباہ کیا گیا اور مغربی مفادات کو فروغ دیا گیا۔ معاشی میدان میں مغربی طاقتوں نے سرمایہ داری کے اصولوں پر اپنی معیشت کو استوار کیا، لیکن اس کے اثرات دوسرے ممالک پر تباہ کن ثابت ہوئے۔ نیوکالونیل دور میں مغربی طاقتوں نے افریقا، ایشیا، اور لاطینی امریکہ کے ممالک کے قدرتی وسائل کو لوٹا اور ان کے اقتصادی وسائل کو اپنی ترقی کے لیے استعمال کیا۔ اس کے بدلے میں ان ممالک کو غربت اور معاشی پسماندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ سرمایہ داری کے اصولوں نے دنیا کو اقتصادی ناہمواریوں کا شکار بنایا، جس میں ایک طرف چند طاقتور ممالک یا ادارے بے پناہ دولت کے مالک بنے، تو دوسری طرف لاکھوں لوگ بدحال ہو گئے۔

سماجی سطح پر بھی مغربی طاقتوں کا رویہ اخلاقی طور پر سوالیہ نشان ہے۔ مغرب نے آزادی، حقوق، اور مساوات کے اصولوں کا پرچار کیا، لیکن ان اصولوں کو اپنے مفادات کے لیے منتخب طور پر استعمال کیا۔ جب تک یہ اصول مغربی طاقتوں کے مفاد میں تھے، تب تک ان کا پرچار کیا گیا، لیکن جب یہ اصول دوسرے علاقوں میں مظلوم اقوام کے حق میں ہوتے تھے، تو انہیں نظر انداز کیا گیا یا ان پر حملہ کیا گیا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی طاقتوں کی ترقی کا بڑا حصہ اخلاقی طور پر تضادات سے بھرا ہوا ہے۔

اخلاقی تناظر میں مغربی ترقی کی اس بنیاد کو دیکھتے ہوئے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان طاقتوں کی ترقی کے پیچھے جو ظلم، استحصال، اور فریب کے عناصر کارفرما ہیں، وہ ان کے عالمی اثر و رسوخ اور ترقی کے اصولوں کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہیں۔ اگر مغربی طاقتیں اپنی ترقی کو سچائی، انصاف، اور اخلاقی ذمہ داریوں کے ساتھ ہم آہنگ کرتیں، تو ان کی ترقی نہ صرف خود ان کے لیے بلکہ پوری دنیا کے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکتی تھی۔

مغربی طاقتوں کی ترقی کا تجزیہ کرتے ہوئے جب اس کے اخلاقی پہلو کو گہرائی سے دیکھا جاتا ہے تو ایک اور اہم زاویہ سامنے آتا ہے جو ان کی ترقی کے عمل میں چھپے ہوئے تضادات اور غیر اخلاقی طریقوں کو مزید اجاگر کرتا ہے۔ اگر ہم مغربی طاقتوں کی ترقی کی تاریخ کو مزید وسیع تناظر میں دیکھیں، تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان طاقتوں نے صرف ظلم اور استحصال کو اپنے مفادات کے حصول کے لیے استعمال نہیں کیا، بلکہ ان کے ساتھ ساتھ ایک ذہنی نوعیت کی بالادستی، ثقافتی تسلط، اور اخلاقی جواز کا مفہوم بھی وابستہ ہے۔ اس کا مقصد اپنی سلطنتوں کی توسیع کے دوران دوسروں کو ان کے اخلاقی، ثقافتی اور معاشی نظاموں سے منحرف کرنا تھا تاکہ وہ ان کے سامنے غیر اہم نظر آئیں اور ان کے ساتھ جبر کی بنیاد پر تعلقات قائم کیے جا سکیں۔

مغربی طاقتوں نے ترقی کے ساتھ جو ایک بنیادی پہلو متعارف کرایا وہ "علمی بالادستی" کا تھا۔ مغرب نے اپنی سائنس اور ٹیکنالوجی کو نہ صرف اقتصادی و صنعتی ترقی کے لیے استعمال کیا، بلکہ انہیں اپنے غیر اخلاقی مقاصد کے لیے بھی منظم طریقے سے استعمال کیا۔ مغربی قوموں

کی علمی ترقی نے جہاں ان کی زندگی کے معیار کو بلند کیا، وہیں ان کی سائنسی تحقیق اکثر دوسرے قوموں کے استحصال کے لیے استعمال ہوئی۔ مثال کے طور پر، مختلف سامراجی طاقتوں نے مقامی لوگوں کی زندگیوں اور صحت کو نظرانداز کرتے ہوئے مختلف جینیاتی تجربات کیے یا ان کی افرادی قوت کو کمزور کرنے کے لیے جنگی ہتھیاروں کی تحقیق کی۔ اسی طرح، سائنسی تحقیق نے جہاں ایک طرف انسانیت کے لیے فائدہ پہنچایا، وہیں دوسری طرف اسے جنگوں، تباہی اور قدرتی وسائل کی لوٹ مار کے لیے بھی استعمال کیا گیا۔

ان تمام علمی و سائنسی ترقیوں کے پیچھے مغربی طاقتوں کی ایک نہایت پیچیدہ اور غالب ثقافتی حکمت عملی بھی چھپی ہوئی تھی جس کا مقصد دوسرے قوموں کے ثقافتی اور روحانی تصورات کو نظرانداز کرنا تھا۔ مغربی دنیا نے اپنے نظام تعلیم اور سائنسی اصولوں کو عالمی سطح پر تسلیم کرانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوسرے ثقافتی نظاموں اور تہذیبوں کو کم تر سمجھا جانے لگا۔ مغرب نے خود کو انسانیت کا معیاری معیار قرار دیتے ہوئے دوسرے ممالک کے ثقافتی ورثے کو حقیر جانا اور ان کی تاریخ و روایتوں کو محض "پسماندہ" تصور کیا۔ اس حکمت عملی نے نا صرف اخلاقی غیرت کے منافی تھا بلکہ اس نے انسانوں کی اصل شناخت اور ان کے آزادی کے حق کو بھی پامال کیا۔

معاشی ترقی اور سرمایہ داری کے حوالے سے مغربی طاقتوں کی ترقی کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ان کی ترقی کا بڑا حصہ ان استعماری تعلقات پر منحصر تھا جو انہوں نے دوسری قوموں کے ساتھ استحصال کی بنیاد پر قائم کیے۔ سرمایہ داری کے اصولوں نے یہ

حقیقت واضح کر دی کہ دولت کا حصول ہی سب کچھ تھا اور اس کے لیے کسی بھی اخلاقی قید یا انسانی حقوق کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ مغربی طاقتوں نے دنیا کے مختلف حصوں میں اپنی طاقت کا استعمال کیا تا کہ وہ اپنے مفادات کو یقینی بنائیں، چاہے اس کے نتیجے میں ان قوموں کے عوام کو اقتصادی پسماندگی اور غربت کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ اس اقتصادی نظام نے نہ صرف دنیا میں عدم مساوات کو بڑھایا، بلکہ اس نے ان قوموں کی محنت کو کم قیمت پر خرید کر خود اپنی دولت میں اضافہ کیا۔

اسی طرح سیاست میں بھی مغربی طاقتوں نے جمہوریت اور آزادی کے اصولوں کا پرچار کیا، لیکن ان کے داخلی و عالمی سطح پر اس کا عمل مختلف تھا۔ انہوں نے جب اپنی سلطنتوں کو توسیع دی، تو مقامی حکومتوں اور عوام کی آزادی کو سلب کیا اور ان کی مرضی کے خلاف حکومتی پالیسیوں کو مسلط کیا۔ دوسری جنگ عظیم میں مغربی طاقتوں نے جو جمہوریت اور انسانی حقوق کے اصولوں کا پرچار کیا، وہ صرف ان کے اپنے مفادات کے لیے تھے۔ جب دوسرے ممالک میں ان مفادات کا تصادم ہوتا، تو مغربی طاقتوں نے اپنی طاقت کا استعمال کر کے اپنے مخالفین کو کچلا، چاہے ان کے خلاف جتنے بھی اخلاقی دلائل دیے گئے ہوں۔

اس کے علاوہ، مغربی دنیا میں آزادیت پسندی اور انفرادی آزادی کو جتنا بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا، وہ ایک دوسرے اخلاقی مسئلے کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ انفرادی آزادی کا دائرہ اتنا وسیع کیا گیا کہ سماجی اور اخلاقی ذمہ داریوں کا تصور کمزور پڑ گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغربی معاشرے میں مادیت پرستی، فرد پرستی اور اخلاقی زوال نے جنم لیا۔ یہ سب چیزیں دراصل اس ترقی کے اخلاقی و روحانی پہلو کو ایک سوالیہ نشان بنا دیتی ہیں۔

اسلامی اخلاقیات کے تناظر میں مغرب کی ترقی کو دیکھیں تو ایک بالکل مختلف حقیقت سامنے آتی ہے۔ اسلام نے انسان کی مادی اور روحانی ترقی کو ایک ساتھ مربوط کیا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں انسان کی ترقی صرف اس کی مادی فلاح کے لیے نہیں ہے، بلکہ اس میں اخلاقی، روحانی اور معاشرتی اقدار کی بھی اہمیت ہے۔ قرآن میں یہ واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ انسانیت کی فلاح اس وقت ممکن ہے جب انسان اپنی زندگی کو اخلاقی اصولوں اور حقوق العباد کے تحت گزارے۔ اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ مادی ترقی کو اخلاقی و روحانی اقدار کے ساتھ ہم آہنگ کرنا ضروری ہے، تاکہ وہ ترقی انسانیت کے فائدے کے لیے ہو، نہ کہ کسی مخصوص طبقے یا قوم کے لیے استحصال کا ذریعہ بنے۔ اس کے برعکس، مغربی طاقتوں کی ترقی کے پیچھے جو غیر اخلاقی اور استحصالی عمل کارفرما ہیں، وہ نہ صرف انسانوں کے حقوق کی پامالی ہیں، بلکہ یہ عالمی سطح پر انسانیت کے لیے ایک سنگین خطرہ بھی بن چکے ہیں۔

مغربی ترقی کی اس حقیقت کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ترقی ایک غیر متوازن اور غیر اخلاقی عمل کا نتیجہ ہے۔ اس میں انسانیت کے لیے جتنا فائدہ تھا، اتنا ہی نقصان بھی تھا۔ اگر مغربی طاقتیں اپنی ترقی کو اخلاقی اقدار اور انسانیت کی فلاح کے اصولوں کے ساتھ ہم آہنگ کرتیں، تو ان کی ترقی کا اثر دنیا بھر میں مثبت اور فائدہ مند ہوتا۔ یہ توازن اب ضروری ہے تاکہ انسانیت کی فلاح کے لیے ایسی ترقی ممکن ہو سکے جو دنیا کے ہر فرد کے حق میں ہو۔

مقابلہ بازی سے پرہیز کریں

غیر ضروری مقابلہ (Unnecessary Competition) ایک ذہنی دباؤ پیدا کرنے والی حالت ہے جس میں انسان اپنے آپ کو دوسروں سے موازنہ کر کے اپنے آپ کو کمتر یا بہتر ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا آغاز عموماً اس خواہش سے ہوتا ہے کہ "میں دوسروں سے آگے بڑھوں" یا "میں سب سے بہتر بنوں"، لیکن جب یہ مقابلہ غیر ضروری اور زیادہ ہوتا ہے، تو یہ انسان کو ذہنی پریشانی اور تناؤ کا شکار بنا دیتا ہے۔ اس سے انسان کی ذہنی سکون اور داخلی سکون متاثر ہوتا ہے، اور وہ اپنی حقیقی صلاحیتوں اور مقصد کو بھول کر صرف دوسروں سے آگے نکلنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔

اسلام میں ہمیں اپنے مقاصد کو اللہ کی رضا کی طرف مائل کرنے کی تعلیم دی گئی ہے، اور یہ بھی سکھایا گیا ہے کہ انسان کی حقیقی کامیابی اس کے اخلاق، عمل اور نیت میں ہے، نہ کہ صرف مادی دنیا کی پیمائش میں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا" :تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو تقویٰ میں سب سے آگے ہو "(سورہ الحجرات، 49:13)، جو ہمیں بتاتا ہے کہ ہمارا اصل مقصد خود کو بہتر بنانا اور اللہ کے قریب ہونا ہے، نہ کہ دوسروں سے آگے نکلنے کی دوڑ میں شامل ہونا۔

غیر ضروری مقابلہ انسان کی توانائی اور وقت کو ضائع کرتا ہے، کیونکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو صرف اس مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے کہ وہ دوسروں سے بہتر ثابت ہو۔ اس کا نتیجہ یہ

ہوتا ہے کہ انسان اپنی ذاتی ترقی اور مقصد سے دور ہو جاتا ہے، اور اس کی تمام تر کوششیں خارجی عوامل اور دوسروں کی کامیابیوں کے مقابلے میں محدود ہو کر رہ جاتی ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا" : تمہاری سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ تم دوسروں سے مقابلہ کرنے کی بجائے اپنی صلاحیتوں کو بہتر بناؤ"۔ اس قول میں حضرت علی علیہ السلام نے ہمیں یہ سکھایا کہ کامیابی کا راستہ دوسروں سے موازنہ کرنے میں نہیں، بلکہ اپنی صلاحیتوں کو بہتر بنانے میں ہے۔

غیر ضروری مقابلہ کرنے کی عادت سے بچنے کے لیے ہمیں اپنی زندگی کے مقصد کو سمجھنا ضروری ہے۔ ہر شخص کی زندگی اور اس کی ترقی کی شرائط مختلف ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو ایک خاص مقصد کے لیے پیدا کیا ہے، اور ہم اسی مقصد کی تکمیل کے لیے زندگی گزاریں۔ ہمیں یہ سمجھنا ہو گا کہ ہر شخص کی تقدیر اور راہ مختلف ہوتی ہے، اور ہمیں اپنی راہ پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے، نہ کہ دوسروں سے آگے بڑھنے کی فکر میں پڑنا چاہیے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے کربلا میں اپنی جدوجہد سے یہ سبق دیا کہ انسان کا مقصد صرف اللہ کی رضا اور انصاف کے قیام کے لیے ہونا چاہیے، نہ کہ دوسروں سے برتری حاصل کرنے کے لیے۔ امام حسین علیہ السلام کا یہ قول ہے" : ہمیں اپنی جنگ اپنے اصولوں اور اللہ کی رضا کے لیے لڑنی چاہیے، نہ کہ دوسروں سے مقابلہ کرنے کے لیے"۔

ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ حقیقت میں انسان کا مقابلہ صرف اپنے آپ سے ہونا چاہیے۔ اپنی ماضی کی کمزوریوں کو دور کرنا، اپنی صلاحیتوں کو بہتر بنانا، اور اپنے مقصد کو واضح کرنا وہ راستے ہیں جن پر چل کر ہم اپنی زندگی میں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم

دوسروں سے سیکھ نہ کریں یا ان کی کامیابیوں کو نظر انداز کریں، بلکہ ہمیں اپنی زندگی میں انسپیریشن اور رہنمائی کے طور پر دوسروں کو دیکھنا چاہیے، لیکن ان سے موازنہ کیے بغیر۔

اسلام میں ہمیں ایک دوسرے کی مدد کرنے اور ان کے ساتھ حسن سلوک رکھنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ دوسرے لوگوں سے حسد یا غیر ضروری مقابلہ کرنے کی بجائے، ہمیں اپنی محنت اور اللہ کی رضا کے مطابق اپنے راستے پر توجہ دینی چاہیے۔ حضرت امام علی علیہ السلام نے فرمایا" :اگر تم اپنی زندگی میں سکون چاہتے ہو تو دوسروں سے مقابلہ کرنے کی بجائے اپنی کوششوں کو بہتر بناؤ"۔ اس قول میں امام علی علیہ السلام نے ہمیں بتایا کہ سکون اور کامیابی کا راز دوسروں سے موازنہ کرنے میں نہیں، بلکہ اپنی محنت اور نیت میں ہے۔

غیر ضروری مقابلہ سے بچنے کے لیے ہمیں اپنی ذاتی ترقی پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ ہمیں اپنی صلاحیتوں کو بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے، نہ کہ دوسروں کے ساتھ مقابلہ کرنے کی۔ جب ہم اپنی زندگی کے مقصد کو سمجھ کر اس پر عمل کرتے ہیں، تو ہم نہ صرف اپنے آپ کو کامیاب بناتے ہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی ایک اچھا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اس طرح، ہم حقیقی سکون اور کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔

جب ہم ہمیشہ دوسروں سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم اپنی زندگی کی اصل خوشیوں اور سکون کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے خود کو مسلسل موازنہ کرنے کی حالت میں ڈال دیتا ہے، جس سے اندرونی سکون اور مطمئن زندگی کا حصول مشکل ہو جاتا ہے۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم کس مقصد کے لیے یہاں ہیں اور ہمیں اپنے ذاتی ترقی کے

راستے پر فوکس کرنا چاہیے۔ اس سے ہماری شناخت اور مقاصد میں کمی آتی ہے، کیونکہ ہم صرف یہ دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ دوسرے کیا کر رہے ہیں۔

اسلام میں ہمیں اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ ہم اپنی محنت کو اللہ کی رضا کے لیے کریں، نہ کہ صرف دوسروں سے آگے بڑھنے کے لیے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا" : تمہارا عمل تمہارے لیے ہے اور میرے عمل میرے لیے ہیں "(سورہ الاسراء، 17:12)، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا عمل، ہماری نیت اور ہماری کوشش اللہ کی رضا کے لیے ہونی چاہیے، نہ کہ دوسروں سے مقابلہ کرنے یا ان کی کامیابیوں کو دیکھ کر اپنے آپ کو کمتر یا بہتر محسوس کرنے کے لیے۔

غیر ضروری مقابلہ کی عادت انسان کو صرف جسمانی یا مادی سطح پر جیتنے کی فکر میں ڈالتی ہے، لیکن اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ حقیقی کامیابی روحانیت میں ہے۔ جب ہم اپنی اصل حقیقت اور مقصد کو سمجھتے ہیں، تو ہم دوسروں سے موازنہ کرنے کے بجائے اپنی روحانی اور اخلاقی ترقی پر توجہ دیتے ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا" : جو شخص اپنے نفس سے مقابلہ کرتا ہے وہ ہمیشہ کامیاب رہتا ہے "۔ اس قول میں امام علی علیہ السلام نے ہمیں سکھایا کہ ہمارا سب سے بڑا مقابلہ اپنے آپ سے ہوتا ہے۔ ہمیں اپنی کمزوریوں کو دور کر کے اپنی صلاحیتوں کو بہتر بنانا چاہیے، اور اپنی زندگی کو اللہ کی رضا کی طرف مائل کرنا چاہیے۔

غیر ضروری مقابلہ کی ایک اور منفی اثر یہ ہے کہ یہ انسان کو عارضی کامیابیوں میں خوش ہونے کی عادت ڈال دیتا ہے، جس کا نتیجہ طویل مدتی سکون یا اطمینان میں کمی ہوتی ہے۔ ہم

جب دوسروں سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم اپنے اندرونی سکون اور خوشی کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کی جگہ ہمیں اپنی کامیابیوں اور زندگی کے ہر لمحے کی قدر کرنی چاہیے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے کربلا میں اپنے عمل سے یہ سبق دیا کہ دنیا کی فانی کامیابیاں اور مادی فوائد عارضی ہیں، اور حقیقی کامیابی اللہ کی رضا اور اصولوں کی پیروی میں ہے۔

غیر ضروری مقابلہ کرنے کی بجائے ہمیں اپنی زندگی کی شرائط میں، جو ہمیں اللہ کی طرف سے دی گئی ہیں، بہتر بننے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہمیں اپنے اندر سے موازنہ کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے اور اپنی بہتری کی طرف کام کرنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اپنے مقاصد کو ترک کر دیں، بلکہ ہمیں اپنے راستے کو انفرادی طور پر دیکھنا چاہیے، اپنی کوششوں اور محنت میں سچی نیت رکھنی چاہیے اور اس بات کا عزم کرنا چاہیے کہ ہم ہر دن اپنے آپ کو بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔

جب ہم اپنی زندگی کو اپنے مقصد کے مطابق ڈھالتے ہیں اور دوسروں سے موازنہ کرنے کی بجائے اپنی محنت اور نیت پر توجہ دیتے ہیں، تو ہم نہ صرف اپنے اندر سکون اور اطمینان حاصل کرتے ہیں بلکہ اپنے ارد گرد کے لوگوں کے لیے بھی ایک مثبت نمونہ بن جاتے ہیں۔ اس طرح ہم اپنی زندگی کو حقیقت میں کامیاب اور خوشگوار بنا سکتے ہیں۔

مقاصد کی روشنی میں ترجیحات کا تعین

غلط ترجیحات کا تعین (Misplaced Priorities) ایک ایسی عادت ہے جس میں انسان اپنی زندگی کی اہمیت اور مقصد کو صحیح طور پر سمجھنے میں ناکام رہتا ہے، اور اس کے بجائے وہ غیر ضروری چیزوں اور عارضی خوشیوں کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ یہ عادت انسان کی توانائیوں اور وسائل کو ایسی سمت میں لگاتی ہے جو اس کے حقیقی مقصد سے ہم آہنگ نہیں ہوتی۔ جب ہم اپنی زندگی میں غلط ترجیحات کو منتخب کرتے ہیں، تو ہم اس اہم مقصد کو نظر انداز کر دیتے ہیں جس کے لیے ہم اس دنیا میں بھیجے گئے ہیں۔ یہ مسئلہ نہ صرف فرد کی روحانی ترقی کو روکتا ہے بلکہ اس کے دنیاوی اور اخروی کامیابی کے راستے کو بھی پیچیدہ بنا دیتا ہے۔

اسلام میں انسان کی زندگی کا مقصد بہت واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا" : میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں "(سورہ الذاریات، 51:56)۔ اس آیت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسان کا اصل مقصد اللہ کی عبادت ہے اور اس کا مقصد محض دنیاوی کامیابیوں اور عارضی خوشیوں کی تلاش نہیں ہے۔ جب انسان اپنی ترجیحات کو اس مقصد کے مطابق ترتیب دیتا ہے، تو اس کی زندگی کا ہر لمحہ سکون اور تسلی کے ساتھ گزرتا ہے۔ تاہم، اگر وہ اپنے دنیاوی مفادات اور عارضی خواہشات کو اولیت دے کر اپنی اصل مقصد سے غافل ہو جاتا ہے، تو وہ ایک بڑی روحانی کمی کا شکار ہو جاتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا" :جو شخص اپنی ترجیحات کو اللہ کی رضا کے مطابق مرتب کرتا ہے، اس کی زندگی میں ہر چیز اپنے صحیح مقام پر آجاتی ہے "۔اس قول میں یہ درس دیا گیا ہے کہ انسان جب اپنی زندگی کے مقصد کو صحیح طور پر پہچانتا ہے اور اللہ کی رضا کو اپنی ترجیح بناتا ہے، تو اس کی زندگی کا ہر پہلو خود بخود بہتر ہو جاتا ہے۔ اس کے فیصلے، اعمال اور حتیٰ کہ اس کے ذہنی سکون میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

غلط ترجیحات کا تعین فرد کی زندگی میں غیر ضروری فکری انتشار پیدا کر سکتا ہے۔ جب انسان دنیاوی چیزوں کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھ لیتا ہے، تو وہ اپنے روحانی اور اخلاقی مقاصد کو نظر انداز کر دیتا ہے، اور اس کی روحانیت کمزور پڑ جاتی ہے۔ اس کے بجائے، جب انسان اپنی ترجیحات میں عبادت، اچھے اخلاق، علم کا حصول، اور خدمت خلق کو مقدم رکھتا ہے، تو اس کی زندگی میں سکون، کامیابی اور اللہ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔

حضرت امام علی علیہ السلام نے ایک اور جگہ فرمایا" :جو شخص اپنے اصل مقصد کو پہچان کر اس کے مطابق عمل کرتا ہے، وہ کبھی نہیں گمراہ ہوتا"۔ اس بات کا مقصد یہ ہے کہ انسان جب اللہ کے راستے کو اپنی ترجیح بنا لیتا ہے، تو وہ دنیاوی پریشانیوں اور چیلنجز کے باوجود صحیح راستے پر گامزن رہتا ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد واضح ہوتا ہے، اور وہ ہر قدم پر اللہ کی رضا کی کوشش کرتا ہے۔

غلط ترجیحات کا تعین صرف فرد کی روحانی زندگی کو متاثر نہیں کرتا بلکہ اس کے دنیاوی تعلقات اور معاشرتی زندگی پر بھی اثر ڈالتا ہے۔ جب انسان اپنی ترجیحات میں اللہ کی رضا اور انسانوں کی خدمت کو اولیت دیتا ہے، تو اس کے رشتہ داروں، دوستوں اور ساتھیوں کے

ساتھ تعلقات بھی بہتر ہو جاتے ہیں۔ وہ لوگوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا ہے اور اپنی دنیاوی ذمہ داریوں کو بھی ایمانداری سے ادا کرتا ہے۔

اس لیے ہمیں اپنی زندگی میں ترجیحات کو درست طور پر ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اپنے مقصد کو پہچاننا چاہیے اور اس کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔ اس کے لیے ہمیں اللہ کی رضا، عبادت، اور دوسروں کی خدمت کو اپنی زندگی کے اہم حصے کے طور پر قبول کرنا چاہیے۔ جب ہم اپنے مقصد کے مطابق زندگی گزاریں گے، تو ہمیں نہ صرف دنیا میں سکون اور کامیابی ملے گی بلکہ آخرت میں بھی اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہو گی۔

غلط ترجیحات کا تعین (Misplaced Priorities) انسان کی زندگی میں ایک پیچیدہ مسئلہ بن سکتا ہے جب وہ اپنی حقیقی ضروریات کو نظر انداز کر کے عارضی اور غیر ضروری چیزوں کو اہمیت دینے لگتا ہے۔ یہ نہ صرف اس کی ذاتی سکون اور اطمینان کو متاثر کرتا ہے بلکہ اس کے اخلاقی، روحانی، اور معاشرتی تعلقات میں بھی مسائل پیدا کرتا ہے۔ انسان جب اپنی ترجیحات میں دنیاوی خواہشات اور آرام کو اہمیت دیتا ہے اور روحانی، اخلاقی اور دینی ذمہ داریوں کو نظر انداز کرتا ہے، تو وہ دراصل اپنی زندگی کا مقصد سمجھنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ قرآن اور حدیث میں بار بار اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ انسان کا اصل مقصد اللہ کی رضا اور اس کی عبادت ہے، اور دنیاوی چیزیں عارضی اور فانی ہیں۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی اصل ذمہ داری اور مقصد کو بہت واضح کیا ہے" : اور میں نے جنات اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں"(سورہ الذاریات، 51:56)۔ اس آیت کی روشنی میں، انسان کو اپنی ترجیحات کا تعین اس مقصد کی روشنی میں کرنا چاہیے۔ جب انسان اللہ کی رضا کو اپنی زندگی کا بنیادی مقصد بناتا ہے تو وہ اپنے

دیگر امور، جیسے معاشرتی تعلقات، تعلیم، اور دنیاوی کامیابیوں کو بھی اللہ کی رضا کے تابع کر لیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ، وہ ان چیزوں کی حقیقت کو سمجھتا ہے اور ان کے پیچھے دوڑنے کی بجائے ان کا استعمال اس کے مقصد کے مطابق کرتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا" :جو شخص اپنے مقصد کو صحیح طور پر پہچان لیتا ہے، وہ کبھی اپنے راستے سے نہیں بھٹکتا"۔ اس قول کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان اپنی زندگی کے مقصد کو درست طور پر سمجھتا ہے، اور اس مقصد کے مطابق اپنی ترجیحات کو ترتیب دیتا ہے، تو وہ دنیا کی فانی لذتوں کے پیچھے نہیں بھاگتا بلکہ اللہ کی رضا کے راستے پر قائم رہتا ہے۔ اس کے فیصلے، عمل اور حتیٰ کہ اس کے دل کا سکون بھی اللہ کی رضا کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

اگر انسان اپنی زندگی میں غلط ترجیحات کو اپناتا ہے تو وہ اکثر دنیاوی لذتوں میں خوشی اور سکون کی تلاش کرتا ہے، جو عارضی ہوتے ہیں۔ جب وہ اس سکون کو حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے یا یہ سکون عارضی طور پر ختم ہو جاتا ہے تو اسے مایوسی، بے سکونی اور پریشانی کا سامنا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، جب انسان اپنی ترجیحات میں حقیقت اور سکون کی جستجو کرتا ہے، جو اللہ کی رضا اور عبادت میں ملتا ہے، تو وہ اپنے اندر حقیقی سکون اور اطمینان کا تجربہ کرتا ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا" :حقیقی سکون صرف اللہ کی رضا اور عبادت میں ہے"۔ یہ قول ہمیں بتاتا ہے کہ جب انسان اپنی زندگی میں اللہ کی رضا اور عبادت کو اپنی ترجیح بناتا ہے، تو اس کا دل سکون اور اطمینان سے بھر جاتا ہے۔

غلط ترجیحات کی عادت انسان کو اپنے اخلاقی مقاصد سے بھی غافل کر دیتی ہے۔ انسان جب دنیاوی کامیابیوں کی بھاگ دوڑ میں مشغول ہو جاتا ہے، تو وہ دوسروں کے ساتھ حسن سلوک اور تعاون کو فراموش کر دیتا ہے، اور اپنی روحانیت کو کمزور کر لیتا ہے۔ اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ انسان کا اصل مقصد اللہ کی رضا کے ساتھ ساتھ دوسروں کے ساتھ حسن سلوک، احترام، اور مدد کرنا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" :تم میں سے بہترین وہ ہے جو دوسروں کے لیے سب سے زیادہ فائدہ مند ہو "(سورہ آل عمران، 3:110)۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اپنی زندگی میں دوسروں کی فلاح و بہبود کو بھی اپنی ترجیح بنانا چاہیے تاکہ وہ نہ صرف خود کو بلکہ دوسروں کو بھی سکون اور خوشی دے سکے۔

اس لیے اپنی ترجیحات کو صحیح طریقے سے ترتیب دینا اور اپنی زندگی کے مقصد کو پہچاننا بہت ضروری ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اللہ کی رضا اور عبادت کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے، اور اس کے مطابق دنیاوی چیزوں کو اپنی ترجیحات میں جگہ دے۔ اس کے علاوہ، انسان کو دوسروں کے ساتھ حسن سلوک اور تعاون میں بھی اپنے مقصد کا حصہ بنانا چاہیے تاکہ وہ ایک متوازن اور سکون بھری زندگی گزار سکے۔

نکولس میکسویل اور سائنس کی مابعد الطبیعات

مابعد الطبیعات (Metaphysics) وہ فلسفیانہ شعبہ ہے جو حقیقت کی نوعیت، اس کی بنیادی ساخت اور اس کے وجودی پہلوؤں کا مطالعہ کرتا ہے۔ نکولس میکسویل کی سائنس کی مابعد الطبیعات سے مراد وہ بنیادی تصورات اور مفروضات ہیں جو سائنسی تحقیق اور سائنسی نظریات کے پیچھے ہوتے ہیں، اور جو سائنس کو سمجھنے اور اس کے طریقہ کار کو تشکیل دینے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

میکسویل کا یہ خیال ہے کہ سائنس محض تجربات اور مشاہدات پر مبنی نہیں ہوتی، بلکہ اس میں ایک مابعد الطبیعاتی سطح بھی موجود ہوتی ہے جسے اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ سائنسی طریقہ کار میں جو مفروضات اور بنیادی اصول شامل ہوتے ہیں، وہ مابعد الطبیعاتی نوعیت کے ہوتے ہیں اور ان پر اکثر سوالات اٹھائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر، یہ مفروضہ کہ کائنات میں کوئی سسٹم موجود ہے جو قابلِ پیش گوئی اور ہم آہنگ ہے، ایک مابعد الطبیعاتی خیال ہے جو سائنس کو اس کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اگر یہ مفروضہ غلط ہو تو سائنسی نظریات اور تجربات بھی متاثر ہو سکتے ہیں۔

میکسویل کی بحث اس بات پر ہے کہ سائنس کو ہمیشہ ایک ہی طریقے سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ہر سائنسی تحقیق کی اپنی بنیاد ہوتی ہے، اور ان بنیادوں کی نوعیت کو سمجھنا ضروری ہے۔ ان بنیادی مفروضات میں یہ شامل ہے کہ فطرت میں قانونیت ہے، کہ ہم کائنات کو ایک منطقی

اور مرتب طریقے سے سمجھ سکتے ہیں، اور کہ سائنس اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ ہمارے علم میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ چیز چھپی رہتی ہے، جو ہمیں مزید تحقیق سے سمجھنی ہوتی ہے۔ یہ مفروضات مابعد الطبیعاتی نوعیت کے ہوتے ہیں کیونکہ یہ حقیقت کی نوعیت اور ہماری اس کے بارے میں سمجھ کو تشکیل دیتے ہیں۔

میکسویل نے یہ بھی کہا کہ سائنسی طریقہ کار میں ہمیں صرف حقیقت کو دریافت کرنے کا نہیں، بلکہ اس حقیقت کو ایک ایسی تفصیل میں سمجھنے کا مقصد بھی ہونا چاہیے جو ہر پہلو سے آپس میں جڑی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سائنسی نظریات محض تجربات سے نکالے جانے والے نتائج نہیں ہوتے، بلکہ یہ نظریات اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کس طرح مختلف حقیقتیں آپس میں جڑی ہوتی ہیں اور ایک مکمل اور ہم آہنگ نظام تشکیل دیتی ہیں۔

سائنس کی مابعد الطبیعات یہ بھی بتاتی ہے کہ سائنسی تصورات اور تھیوریز ہمیشہ ایک خاص فریم ورک میں کام کرتی ہیں، اور ان کا مقصد سچائی کو نہ صرف دریافت کرنا ہوتا ہے، بلکہ اس سچائی کو انسانوں کی فلاح کے لیے بھی استعمال کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے، سائنس کا مقصد محض تفصیلات کو جمع کرنا نہیں، بلکہ ان تفصیلات کو ایک معقول اور جامع تصویر میں ڈھالنا ہوتا ہے تاکہ وہ انسانیت کے لیے فائدہ مند ثابت ہوں۔

آخر کار، میکسویل کا یہ کہنا ہے کہ سائنس کی مابعد الطبیعاتی سطح کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ سائنس کے اندرونی اصولوں، اہداف اور مفروضات کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ یہ وہ بیسک فریم ورک فراہم کرتی ہے جس پر سائنسی علم اور تحقیق کی عمارت کھڑی ہوتی ہے،

اور اگر ہم اس فریم ورک کو بہتر بنائیں تو نہ صرف سائنسی تحقیق کی بنیاد مستحکم ہو سکتی ہے بلکہ ہم اسے زیادہ فلاحی اور انسانیت کے مفاد میں بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

نو دولتیوں اور نو عالموں کی نشانیاں

نو دولتیوں اور نو عالموں کی کچھ مخصوص نشانیاں ہوتی ہیں جو ان کی ناپختگی اور نئی کامیابی یا علم کے اثرات کو ظاہر کرتی ہیں۔ یہ نشانیاں مختلف میدانوں میں مختلف طریقوں سے ظاہر ہوتی ہیں، اور یہ ظاہر کرتی ہیں کہ یہ افراد ابھی اپنے نئے مقام پر پختگی حاصل نہیں کر پائے ہیں۔

نو دولتی افراد اکثر اپنی دولت کا بہت زیادہ دکھاوا کرتے ہیں۔ وہ مہنگی گاڑیاں، زیورات، گھریلو سامان اور برانڈڈ اشیاء خرید کر اپنے امیر ہونے کا تاثر دیتے ہیں۔ ان کا مقصد اپنی دولت کو دوسروں کے سامنے لانا ہوتا ہے تاکہ وہ خود کو معاشرے میں "کامیاب" دکھا سکیں، لیکن یہ صرف ایک بیرونی تاثراتی حکمت عملی ہوتی ہے۔ ان لوگوں میں فضول خرچی کی عادت بھی عام ہوتی ہے، جہاں وہ اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے بجائے صرف اس لیے چیزیں خریدتے ہیں تاکہ دوسروں کے سامنے اپنی حیثیت کو بڑھا سکیں۔ یہ عادت انہیں عارضی خوشی دے سکتی ہے لیکن طویل مدتی سکون یا استحکام فراہم نہیں کرتی۔

نو دولتی افراد عموماً مالی طور پر خود کو غیر محفوظ محسوس کرتے ہیں اور ان کی توجہ صرف اس بات پر مرکوز ہوتی ہے کہ وہ اپنی دولت کو کیسے بچا سکتے ہیں یا اس پر فخر کیسے کر سکتے ہیں۔ ان میں پختگی کی کمی ہوتی ہے اور وہ بھاری ایگوز کے ساتھ سماج میں اپنی شناخت بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان افراد کا ایک اور نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ سوشل میڈیا پر اپنی زندگی کو نمائش

کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنی خریداریوں، تعطیلات اور دیگر ذاتی لمحوں کو بار بار شیئر کرتے ہیں تاکہ اپنی حیثیت کو لوگوں کے سامنے بڑھا سکیں۔

یہ افراد دولت کی حقیقت کو سمجھنے میں ناکام رہتے ہیں اور اسے صرف مادی اشیاء سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ انہیں اس بات کا شعور نہیں ہوتا کہ دولت کا اصل مقصد انسان کی روحانیت، اخلاقی اور سماجی ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہے۔

نوعالم عموماً اپنے نئے علم کا اظہار زیادہ کرتے ہیں۔ جب بھی وہ کسی موضوع پر عبور حاصل کرتے ہیں تو اسے دوسروں تک پہنچانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ انہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اب دوسروں سے زیادہ جانتے ہیں، اور وہ اس علم کو نمایاں کرنے کے لیے اکثر بحث ومباحثے میں شریک ہو جاتے ہیں۔ نوعالم افراد میں یہ رجحان بھی پایا جاتا ہے کہ وہ اپنے نئے سیکھے گئے علم کو اپنی عقل کی بلند سطح سمجھتے ہیں اور دوسروں کے علم کو کمتر تصور کرنے لگتے ہیں۔ ان کا یہ گمان ہوتا ہے کہ چونکہ وہ اب ایک نئے علم کے حامل ہیں، اس لیے وہ دوسروں سے زیادہ بہتر اور باخبر ہیں۔

یہ افراد بحث ومباحثے میں حصہ لینے کو بہت پسند کرتے ہیں اور اپنی رائے دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی یہ عادت اکثر اس وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ اپنے نئے علم کا مسلسل مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں اور اپنی برتری جتانے کا موقع تلاش کرتے ہیں۔ نوعالم افراد اپنی نئ سیکھنے کی مہارتوں یا معلومات کو غیر ضروری طور پر پیش کرتے ہیں اور علمی

اصطلاحات کا بے جا استعمال کرتے ہیں تاکہ دوسروں کو متاثر کر سکیں، حالانکہ ان کی اپنی سمجھ اکثر سطحی یا غیر مکمل ہوتی ہے۔

نوعالم افراد میں پختگی کی کمی بھی نمایاں ہوتی ہے۔ وہ ابھی تک اپنے نئے علم کا مکمل اور وسیع فہم حاصل نہیں کر پاتے اور اکثر سطحی طور پر ہی اسے استعمال کرتے ہیں۔ ان میں یہ عادت بھی پائی جاتی ہے کہ وہ مفروضات پر یقین کر لیتے ہیں اور اپنے علم کو حتمی سچائی سمجھ کر دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے علم میں ایک خاص حد ہوتی ہے، لیکن وہ اسے مکمل سمجھ کر دوسروں کی رائے یا تنقید کو نظر انداز کرتے ہیں۔

۳۔ مختلف میدانوں میں نو دولتیوں اور نوعالموں کی نشانیاں: کاروباری میدان میں، نو دولتی افراد اپنی کامیابی کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنی کمپنیوں کی کامیابی کی داستانیں سناتے ہیں لیکن ان کے پاس نہ تو پختہ حکمت عملی ہوتی ہے اور نہ ہی کارگر کاروباری اصول۔ اکثر وہ اپنے کاروباری مسائل کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اپنی حیثیت کو برقرار رکھ سکیں۔ تعلیمی میدان میں، نوعالم اساتذہ یا محققین اپنے نئے سیکھے گئے تصورات یا نظریات کو غرور کے ساتھ دوسروں کو بتاتے ہیں۔ ان کا یہ خیال ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ جانتے ہیں، وہ کسی اور کو معلوم نہیں، اور اس طرح وہ اپنی علمی برتری کا اظہار کرتے ہیں۔

سماجی میدان میں، نو دولتی اور نو عالم افراد اکثر تعلقات میں خود کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کی حیثیت ثابت ہو سکے۔ یہ لوگ دوسروں سے بڑھ کر دکھنے کی کوشش کرتے ہیں، حالانکہ ان کے تعلقات میں گہرائی یا حقیقت نہیں ہوتی۔ فنون اور ثقافت کے شعبے میں، نو دولتی افراد یا نو عالم اکثر خود کو ایک ماہر دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ان کا علم اور ذوق عموماً سطحی ہوتا ہے، اور وہ اکثر دوسروں کے کام کی نقل پر انحصار کرتے ہیں۔

نو دولتی اور نو عالم افراد کی یہ نشانیاں ان کی ناپختگی کو ظاہر کرتی ہیں۔ وہ اپنے نئے مقام یا علم کو نمایاں کرنے کے لیے مخصوص طرز عمل اختیار کرتے ہیں، لیکن یہ نہیں سمجھ پاتے کہ اصل کامیابی کا معیار پختگی ہے، نہ کہ محض دکھاوا اور نمائش۔

نو دولتی اور نو عالم افراد کی یہ نشانیاں ان کی ناپختگی کو ظاہر کرتی ہیں۔ وہ اپنے نئے مقام یا علم کو دوسروں کے سامنے پیش کرنے کے لیے مخصوص طرز عمل اختیار کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس بات کو نہیں سمجھ پاتے کہ پختگی اصل کامیابی کا معیار ہے، نہ کہ محض دکھاوا اور نمائش۔

زندگی کا ہدف کیا ہونا چاہیے ؟!!

آج کے دور میں شیعوں اور حق پرست انسانوں کے لیے زندگی کا بنیادی ہدف یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے وجود کو اللہ تعالیٰ کی معرفت، عبادت، اور اس کے احکامات کے نفاذ کا محور بنائیں۔ یہ ہدف محض عبادات تک محدود نہیں ہونا چاہیے، بلکہ زندگی کے تمام پہلوؤں کو شامل کرنا چاہیے تاکہ ان کی روزمرہ زندگی کے تمام معاملات اس بلند مقصد کے تحت آسکیں۔

زندگی کا یہ ہدف اسی وقت حقیقی معنوں میں پایا جاسکتا ہے جب انسان اپنی شخصیت کو ایسا بنا لے جو اللہ کی رضا کے لیے مکمل طور پر وقف ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ انسان اپنی ذاتی، خاندانی، سماجی، اور معاشرتی ذمہ داریوں کو بھی اللہ کی بندگی کا حصہ سمجھے۔ اپنے کاروبار، تعلیم، اور دیگر تمام معاملات میں عدل، انصاف، اور صداقت کے اصولوں پر کاربند رہے۔ اللہ کے رسول ﷺ اور اہل بیت علیہم السلام کی سیرت کو اپنا نمونہ بنائے اور ان کے تعلیمات کو اپنے قول و عمل میں ظاہر کرے۔

نظامِ امامت کا قیام انبیاء کرامؑ کے مشن کا تسلسل اور انسانیت کی حقیقی نجات کا ذریعہ ہے۔ انبیاء علیہم السلام نے انسانوں کو اللہ کی توحید کی طرف دعوت دی، حق و باطل کے درمیان فرق واضح کیا، اور زندگی کے ہر پہلو میں الٰہی اصولوں کے نفاذ کی بنیاد رکھی۔ ان کے بعد ائمہ

معصومین علیہم السلام کا بنیادی ہدف اس نظام کو عملی شکل دینا اور انسانیت کو اللہ کے قریب ترلانا تھا۔ یہی نظامِ امامت وہ مرکزی ہدف ہے جو دنیا و آخرت کی کامیابی کو یکجا کرتا ہے اور جس کے قیام سے حق کا ظہور اور باطل کا خاتمہ ممکن ہے۔

اس ہدف کے حصول کے لیے سب سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اپنے عقائد کو مضبوط کریں اور امامت کے تصور کو اپنے دل و دماغ میں گہرائی سے جگہ دیں۔ ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ ائمہ معصومین علیہم السلام نہ صرف دینی رہنما ہیں بلکہ وہ انسانیت کے لیے کامل نمونہ اور الٰہی نظام کے حقیقی محافظ ہیں۔ ان کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے، اور ان کے فرامین پر عمل ہی ہمیں اس بلند مقصد تک پہنچا سکتا ہے۔

نظامِ امامت کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے عمل کو اس ہدف سے مربوط کریں۔ مثلاً، اگر ہم تعلیم حاصل کر رہے ہیں تو ہماری نیت یہ ہونی چاہیے کہ ہم علم کے ذریعے اسلام کی خدمت کریں اور ائمہ علیہم السلام کے مشن کو آگے بڑھائیں۔ اگر ہم معاشی سرگرمیاں انجام دے رہے ہیں تو ہمارا مقصد صرف دنیاوی فوائد حاصل کرنا نہیں بلکہ اسلامی معیشت کے اصولوں کو اپنانا اور پھیلانا ہونا چاہیے۔ اسی طرح، سماجی تعلقات میں عدل، انصاف، اور محبت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیں لوگوں کو نظامِ امامت کی حقانیت سے روشناس کرانا چاہیے۔

یہ ہدف اس وقت مکمل طور پر حاصل ہوگا جب ہم اپنی ذاتی اصلاح کے ساتھ ساتھ معاشرے کی اصلاح پر بھی توجہ دیں۔ ہمیں اپنے اندر تقویٰ، اخلاص، اور صبر جیسی صفات

پیدا کرنی ہوں گی تا کہ ہم اس الٰہی مشن کے حقیقی کارکن بن سکیں۔ ساتھ ہی، ہمیں ظلم کے خلاف آواز اٹھانی ہو گی، حق کی حمایت کرنی ہو گی، اور مظلوموں کے حق میں کھڑے ہونا ہو گا۔ یہ تمام اعمال نظامِ امامت کے قیام کی سمت میں ایک قدم ہیں۔

اس کے علاوہ، نظامِ امامت کے قیام کے لیے ہمیں تبلیغِ دین کو اپنی زندگی کا اہم حصہ بنانا ہو گا۔ یہ تبلیغ محض زبانی کلامی نہیں ہونی چاہیے بلکہ ہمارے کردار اور عمل سے ظاہر ہونی چاہیے۔ ہمارے قول و فعل میں اتنی ہم آہنگی ہو کہ لوگ ہماری زندگی میں اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات کی جھلک دیکھ سکیں۔ ہمیں اس بات کا ادراک ہونا چاہیے کہ ہم امام زمانہ عجل اللہ تعالی فرجہ الشریف کے دورِ غیبت میں ان کے سپاہی ہیں اور ہمارا ہر عمل ان کے ظہور کی زمینہ سازی کر رہا ہے۔

نظامِ امامت کے قیام کے لیے ایک اور اہم پہلو مسلمانوں کے درمیان اتحاد ہے۔ ہمیں فرقہ واریت کو ترک کر کے مشترکہ اصولوں پر ایک دوسرے کے قریب آنا ہو گا۔ ائمہ معصومین علیہم السلام نے ہمیشہ امت کو وحدت کی دعوت دی اور اختلافات کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ ہمیں ان کے اس مشن کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک ایسے معاشرے کی بنیاد رکھنی ہو گی جہاں تمام مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور بھائی چارے کے ساتھ رہ سکیں۔

نظامِ امامت کا قیام انسانیت کے لیے اللہ کی طرف سے عطا کردہ سب سے بڑا ہدف ہے، اور ہمیں اپنی زندگی کے ہر پہلو کو اس کے مطابق ڈھالنا ہو گا۔ ہر چھوٹے سے چھوٹا عمل، اگر

اس ہدف کے تحت کیا جائے، تو وہ نہ صرف دنیاوی معاملات میں کامیابی کا سبب بنے گا بلکہ آخرت کی نجات کا ذریعہ بھی ہو گا۔ یہی وہ راستہ ہے جو ہمیں حق کی بالادستی اور باطل کے خاتمے کی طرف لے جائے گا۔

یہ ہدف زندگی کے ہر پہلو میں توازن پیدا کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ ایک مومن کو اپنی روحانی، ذہنی، اور جسمانی ترقی کے لیے کوشش کرتے ہوئے دنیاوی اور اخروی معاملات میں اعتدال اختیار کرنا چاہیے۔ قرآن کریم کی تعلیمات اور اہل بیتؑ کے ارشادات ہمیں یہ سمجھاتے ہیں کہ دنیا اور آخرت دو الگ الگ حقیقتیں نہیں ہیں، بلکہ دنیاوی زندگی کو آخرت کی کامیابی کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے۔

لہذا، ہر چھوٹا عمل جیسے کہ کسی کو مسکرا کر دیکھنا، کسی کی مدد کرنا، اپنے گھر کے افراد کے ساتھ محبت اور حسنِ سلوک سے پیش آنا، یہ سب اس بڑے ہدف کے جزو ہو سکتے ہیں اگر ان اعمال کا مقصد اللہ کی خوشنودی ہو۔ اسی طرح معاشرتی سطح پر عدل و انصاف کا قیام، ظالم کے خلاف قیام اور مظلوم کی حمایت، علم کی ترویج، اور اسلامی اقدار کی حفاظت جیسے کام بھی اس ہدف کا حصہ ہیں۔

اس ہدف کے حصول کے لیے خود سازی اور تزکیہ نفس ضروری ہے۔ انسان کو اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرنا ہو گا، اپنی خواہشات کو قابو میں رکھنا ہو گا، اور اپنے اعمال کو اللہ کی کتاب اور اہل بیتؑ کے فرامین کے مطابق ڈھالنا ہو گا۔ اس کے ساتھ ساتھ اجتماعی ذمہ داریوں کو سمجھنا اور ان پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ اپنے ارد گرد کے ماحول کو بہتر بنانا، دوسروں کی

اصلاح کی کوشش کرنا، اور معاشرے میں حقیقی اسلامی اقدار کو پروان چڑھانا ہر مومن کا فرض ہے۔

مختصر یہ کہ شیعوں اور حق پرستوں کی زندگی کا ہدف اللہ کی رضا اور دینِ اسلام کی سربلندی ہونا چاہیے۔ یہ ہدف اس قدر وسیع اور جامع ہونا چاہیے کہ زندگی کی ہر جزئیات اس کے تحت آجائے۔ اگر ہر عمل، خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو، اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے تو وہی عمل عبادت بن جاتا ہے، اور یہی وہ فلسفہ ہے جو انسان کو دنیا و آخرت دونوں میں کامیاب بنا سکتا ہے۔

قدامت پسندی اور جدت پسندی کی جدید تقسیم اور مکتب تشیع

مغرب میں ریناسنس اور روشن خیالی کے ادوار میں مذہب اور جدیدیت کے درمیان ایک واضح خلیج پیدا کی گئی۔ ان ادوار میں نصرانیت سمیت تمام روایتی مذاہب کو قدامت پسندی کی علامت قرار دیا گیا، جبکہ جدیدیت کو عقل و دانش اور تحقیق کے ساتھ منسلک کیا گیا۔ اس تقسیم نے ایک ایسا نظریہ پیش کیا جو مذہب کو جدید زندگی کے تقاضوں سے غیر ہم آہنگ قرار دیتا تھا۔ تاہم، جب ہم تشیع کے بنیادی اصولوں اور تعلیمات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ تشیع اس مصنوعی تقسیم پر کسی طور پورا نہیں اترتا۔

تشیع کی بنیاد قرآن اور سنتِ محمد و آل محمدؐ پر ہے، جو عقل و اجتہاد کو بنیادی اہمیت دیتی ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر عقل کے استعمال، غور و فکر، اور تحقیق کی ترغیب دی ہے۔ سورۃ الزمر میں ارشاد ہوتا ہے :

"فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَاهُمُ اللَّهُ وَأُولَٰئِكَ هُمْ أُولُو الْأَلْبَابِ (39:18) "

ترجمہ: "میرے ان بندوں کو بشارت دے دو جو بات کو سنتے ہیں اور پھر اس کے بہترین پہلو کی پیروی کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی ہے اور یہی عقلمند ہیں۔ "

یہ آیت اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام اور بالخصوص تشیع، انسان کو ہر معاملے میں غور و فکر کرنے اور بہترین راستہ اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اہل بیتؑ کی تعلیمات میں بھی یہی اصول نظر آتا ہے۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: "جس کے پاس عقل نہیں، اس کا دین نہیں۔" یہ روایت عقل کو دین کا لازمی جزو قرار دیتی ہے، جو تشیع کی فطری ہم آہنگی کو جدیدیت کے ساتھ جوڑتی ہے۔

تشیع میں اجتہاد کی روایت بھی اس بات کا مظہر ہے کہ یہ مکتب ہر دور میں عقل و استدلال کے ذریعے نئے مسائل کا حل پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اجتہاد کے ذریعے فقیہ دین کے اصولوں کو جدید دور کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کرتا ہے۔ یہ روایت امام علیؑ کے اس قول سے ماخوذ ہے: "حقائق کی گہرائیوں میں اتر جاؤ، کیونکہ ہر حقیقت کے پیچھے مزید حقائق چھپے ہیں۔"

تشیع نہ صرف روایات کو محفوظ رکھتا ہے بلکہ انہیں نئے حالات میں عملی طور پر نافذ کرنے کی راہ بھی دکھاتا ہے۔ مثلاً، قرآن کے اصولِ عدل کو دیکھیں۔ یہ اصول صرف ایک عقیدہ نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے، بشمول معیشت، سیاست، اور معاشرت میں عملی رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

مزید یہ کہ اہل بیتؑ کی زندگیوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے ہر دور میں اپنی تعلیمات کو اس وقت کے معاشرتی، سیاسی، اور فکری تقاضوں کے مطابق پیش

کیا۔ امام حسینؑ کا قیام اور ان کے اصلاحی اصول اسی سلسلے کی ایک روشن مثال ہیں۔ امام حسینؑ نے اپنی تحریک کو صرف روایت کی بنیاد پر نہیں بلکہ زمانے کے حالات اور لوگوں کی ضروریات کے مطابق ترتیب دیا۔

تشیع اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس کی تعلیمات میں روایت اور جدیدیت کو ایک دوسرے سے متضاد نہیں بلکہ متکامل سمجھا جاتا ہے۔ یہ مکتب فطری طور پر ایک ایسی ہم آہنگی کا حامل ہے جو اسے ہر دور کے ساتھ ہم قدم بناتی ہے۔ لہٰذا، مغرب کی قدامت پسندی اور جدیدیت کی تقسیم تشیع پر لاگو نہیں ہوتی، کیونکہ اس مکتب کی بنیاد ہی عقل و نقل کی ہم آہنگی پر ہے۔

مغرب کی جدیدیت سے مراد وہ فکری، سماجی، اور ثقافتی تحریک ہے جو نشاۃ ثانیہ اور روشن خیالی کے ادوار سے شروع ہوئی اور اس کا مقصد مذہب اور روایت کو انسانی زندگی کے مرکز سے ہٹا کر عقل، تجربے، اور سائنسی تحقیق کو بنیاد بنانا تھا۔ اس تحریک کا بنیادی دعویٰ یہ تھا کہ انسانی ترقی اور خوشحالی کے لیے مذہب کی ضرورت نہیں، بلکہ انسانی عقل اور سائنسی پیشرفت کافی ہے۔ اس کے نتیجے میں مغربی معاشروں میں ایسے نظریات پروان چڑھے جنہوں نے مذہب کو ذاتی اور غیر معاشرتی دائرے میں محدود کر دیا، اور تدریجاً اخلاقیات کو بھی ذاتی ترجیحات تک محدود کر دیا گیا۔

اس جدیدیت کا ایک پہلو یہ تھا کہ ہر قسم کی روایات اور اقدار کو پرکھا جائے اور ان پر سوال اٹھایا جائے۔ اس عمل نے بہت سے سماجی اور اخلاقی معیارات کو کمزور کر دیا۔ مغربی جدیدیت کے تحت آزادی کو ایک بنیادی اصول قرار دیا گیا، لیکن یہ آزادی اکثر بے راہ روی، انفرادیت پسندی، اور اخلاقی حدود سے آزاد ہونے کے مترادف ہو گئی۔ جنسی آزادی کے نام پر فحش مواد کی ترغیب اور LGBT تحریک کو سماجی قبولیت دلانے کی کوششیں اسی سوچ کا نتیجہ ہیں۔ ان رجحانات نے مغربی معاشروں میں اخلاقی انحطاط کو فروغ دیا اور خاندان جیسے بنیادی ادارے کو کمزور کیا۔

جدیدیت کے اس تصور نے مذہب کو ایک رکاوٹ کے طور پر پیش کیا، یہ دعویٰ کرتے ہوئے کہ مذہبی اصول انسان کی فکری اور معاشرتی ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ نتیجتاً، عوام کو مذہب سے دور کرنے کے لیے آزادی اور ترقی کے نام پر ایسے نظریات کو فروغ دیا گیا جو بظاہر پرکشش لیکن حقیقت میں دھوکہ تھے۔

یہ رویہ دراصل ایک گہری فکری بحران کی عکاسی کرتا ہے، کیونکہ مذہب کو محض ایک پرانی روایت کے طور پر رد کرنا انسانی فطرت اور روحانی ضروریات کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔ مذہب، بالخصوص اسلام، نہ صرف اخلاقی اصولوں کی بنیاد فراہم کرتا ہے بلکہ ایک ایسا نظام زندگی پیش کرتا ہے جو انسانی فلاح و بہبود اور معاشرتی ترقی دونوں کو ہم آہنگ کرتا ہے، اسلام جدیدیت کے نام پر فطرت سے بغاوت اور بے راہ روی کو قبول نہیں کرتا، بلکہ ایسے اعمال کو فطرت سے بغاوت شمار کرتا ہے۔ مغربی جدیدیت کی یہ خامی ہے کہ

اس نے انسان کو صرف مادی ترقی کا پجاری بنا دیا اور روحانی و اخلاقی پہلو کو تقریباً نظر انداز کر دیا۔ اس تہذیب میں اخلاقی اقدار کو انفرادیت پسندی کے دائرے میں محدود کر دیا جاتا ہے، جہاں ہر فرد اپنے ذاتی اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کا حق رکھتا ہے، چاہے وہ اصول سماجی یا اخلاقی طور پر نقصان دہ ہی کیوں نہ ہوں۔ روایتی اقدار، جیسے خاندان کا استحکام، معاشرتی ہم آہنگی، اور مذہبی اصول، کو قدامت پسندی یا ترقی کی راہ میں رکاوٹ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس، جنسی آزادی، LGBT حقوق، اور کسی بھی قسم کی اخلاقی پابندیوں سے آزادی کو جدیدیت کا معیار قرار دیا جاتا ہے۔

مغرب کی جدیدیت ایک ایسی تحریک ہے جس کا مقصد انسانی زندگی سے مذہب اور روایت کے اثرات کو ختم کرکے عقل، تجربے، اور سائنسی تحقیق کو محور بنانا تھا۔ اس کے پیچھے یہ دعویٰ تھا کہ انسانی ترقی اور خوشحالی کے لیے مذہب کی ضرورت نہیں، بلکہ صرف عقل اور سائنسی پیشرفت کافی ہیں۔ لیکن اگر اس تصور کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ اس کے کئی بنیادی مفروضے خود تشیع کی تعلیمات کے ساتھ ہم آہنگ ہیں، لیکن ان میں ایک اہم فرق ہے۔ تشیع عقل، تجربے، اور سائنسی تحقیق کو تسلیم کرتا ہے، مگر ان کی محدودیت کو بھی واضح کرتا ہے، اور یہ بات بیان کرتا ہے کہ ہر چیز عقل اور تجربے کے دائرے میں نہیں آسکتی۔

تشیع کی تعلیمات کا مرکز عقل ہے، جیسا کہ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: "عقل ہی دین کا ستون ہے، اور اسی کے ذریعے انسان اپنے رب کو پہچانتا ہے۔" تشیع نہ صرف عقل کے

استعمال کی دعوت دیتا ہے بلکہ سائنس اور تجربے کو بھی دین کے فہم اور عمل کا حصہ بناتا ہے۔ تاہم، یہ مکتب یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ انسانی عقل محدود ہے اور تمام حقائق کو مکمل طور پر سمجھنے سے قاصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تشیع وحی کو عقل کے لیے رہنما سمجھتا ہے، کیونکہ وحی انسانی فہم کی حدود سے آگے کی رہنمائی فراہم کرتی ہے۔

یہ حقیقت سائنس کے میدان میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر، گوڈیل کے تھیورم نے یہ ثابت کیا کہ کسی بھی منطقی نظام میں ایسے حقائق موجود ہوتے ہیں جو اس نظام کے اندر رہتے ہوئے ثابت نہیں کیے جاسکتے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سائنس اور منطق اپنی حدود رکھتی ہیں اور ہر چیز کو ان کے دائرے میں لانا ممکن نہیں۔ نیز مغرب کی سائنس پرستی کے دھکوسلے اس بات سے بھی ثابت ہوتے ہیں کہ وہ مغربی سائنسدان جو شیطانی تحریک سے جداگانہ فکر کے حامل تھے قتل کر دیئے گئے ۔ جن میں سے چند نام یہ ہیں۔ جردانو برونو(Giordano Bruno)، نکولا ٹیسلا(Nikola Tesla)،ایلن ٹورنگ(Alan Turing)، گلیلیو گلیلی(Galileo Galilei)، چارلس بابج(Charles Babbage)، سیوک ہوکن(Stevo Puhanovitch)، ماڈم کیوری(Marie Curie)،جان ناش(John Nash) یکتیسوتانی (Yukteswar Giri)وغیرہ وغیرہ۔ یہ افراد اپنی آزادانہ سوچ اور غیر روایتی تحقیق کی وجہ سے اکثر مشکلات کا شکار ہوئے یا ان کے حالاتِ زندگی کے اختتام کو پراسرار سمجھا جاتا ہے۔ نیز سائنس پر من مانی اجارہ داری قائم رکھنے کیلئے دوسری اقوام کے سائنسدانوں کو قتل کیا گیا۔

جیسے کہ غسان کنفانی (فلسطینی دانشور اور محقق)، سمیر منصور (عراقی سائنسدان، جو عراق جنگ کے دوران ہدف بنے) نیز ایران میں کئی ممتاز سائنسدانوں کو قتل کیا گیا ہے، خاص طور پر وہ جو جوہری پروگرام یا حساس تحقیقی منصوبوں سے وابستہ تھے۔ ان میں شامل ہیں: مسعود علی محمدی، مجید شہریاری، داریوش رضائی نژاد، مصطفی احمدی روشن، محسن فخری زادہ۔

مزید بر آں، جدید سائنسدانوں اور فلسفیوں نے بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ مابعد الطبیعات انسانی زندگی کا ایک لازمی پہلو ہے۔ مثال کے طور پر، سائنس اس بات کی وضاحت نہیں کر سکتی کہ کائنات کی ابتدا کیوں ہوئی یا انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ یہ سوالات صرف مذہب اور وحی کے ذریعے سمجھ میں آسکتے ہیں۔

تشیع کی منفرد خصوصیت یہ ہے کہ یہ عقل، سائنس، اور وحی کے درمیان ایک متوازن تعلق قائم کرتا ہے۔ تشیع سائنس کی اہمیت کو قبول کرتا ہے اور تحقیق کو فروغ دیتا ہے، لیکن یہ بھی واضح کرتا ہے کہ سائنس صرف مادی حقائق تک محدود ہے۔ جہاں سائنس خاموش ہو جاتی ہے، وہاں وحی انسان کو رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تشیع ہر دور میں جدیدیت کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی صلاحیت رکھتا ہے، کیونکہ یہ نہ صرف عقل کو اہمیت دیتا ہے بلکہ اس کے حدود کو بھی پہچانتا ہے۔

لہذا، مغربی جدیدیت کے برعکس، جو مذہب کو غیر ضروری سمجھتی ہے، تشیع ایک ایسا متوازن نظام پیش کرتا ہے جو عقل، تجربے، سائنس، اور وحی کو ہم آہنگ کرتا ہے۔ یہ مکتب انسان کو یہ شعور دیتا ہے کہ تمام سچائیاں عقل و تجربے کے ذریعے حاصل نہیں کی جاسکتیں، بلکہ وحی اور مابعد الطبیعات بھی انسانی فہم کے لیے ناگزیر ہیں۔ اس طرح تشیع ایک جامع اور پائیدار نظام حیات پیش کرتا ہے جو نہ صرف مادی ترقی کو فروغ دیتا ہے بلکہ روحانی اور اخلاقی ترقی کو بھی ممکن بناتا ہے۔

اسلام میں علمی ملکیت، اجارہ داری اور علمی سرقہ کے احکام

اسلامی تعلیمات میں علم کو ایک امانت اور نعمت کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جس کا مقصد انسانی فلاح و بہبود اور ترقی ہے۔ علم سے استفادہ کرنا یا کسی کی علمی تخلیق پر عارضی ملکیت قائم کرنا مخصوص اصولوں اور مقاصد کے تابع ہے۔ علم اس وقت علمی سرقہ نہیں کہلائے گا جب اس کا مقصد مثبت ہو، جیسے دوسروں کو فائدہ پہنچانا، معاشرتی مسائل کا حل نکالنا، یا انسانیت کی خدمت کرنا۔ اگر علم کو ذاتی شہرت، مالی مفاد، یا کسی اور ناجائز مقصد کے لیے استعمال کیا جائے تو یہ اخلاقی خیانت کے زمرے میں آتا ہے۔

کسی کے علمی کام سے استفادہ کرتے وقت اس کے اصل ماخذ یا مصنف کا حوالہ دینا ضروری ہے، تاکہ کسی کی محنت کا اعتراف کیا جا سکے اور اس کی امانت میں خیانت نہ ہو۔ یہ عمل اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ علمی دیانت داری کو برقرار رکھا گیا ہے۔ رسول اللہ (ص) نے فرمایا: "امانت کو اس کے اہل تک پہنچانا ایمان کا حصہ ہے۔" اسی طرح اسلامی نقطہ نظر کے مطابق، علم ایک اجتماعی امانت ہے اور اسے عام کرنا صدقہ جاریہ کے زمرے میں آتا ہے۔ کسی بھی علمی کام سے فائدہ اٹھانا یا اسے آگے بڑھانا اس وقت جائز ہے جب اس کا مقصد عوامی بھلائی ہو اور اس سے کوئی نقصان نہ ہو۔ اہل بیت (علیہم السلام) نے علم کو چھپانے کی

سخت مذمت کی ہے۔ حضرت علی (ع) فرماتے ہیں: "علم وہ ہے جو دوسروں کو فائدہ پہنچائے؛ علم پر کنجوسی جہالت ہے۔"

علم پر انفرادی اجارہ داری اس وقت جائز ہو سکتی ہے جب وہ علم ایسا ہو جسے غلط استعمال سے بچانے کی ضرورت ہو یا اس کا مقصد تحقیق اور ترقی کو فروغ دینا ہو، نہ کہ دوسروں کو نقصان پہنچانا۔ کسی شخص کی جانب سے تخلیق یا اختراع کیے گئے علمی کام پر اس کی عارضی ملکیت جائز ہے، جیسا کہ تحقیقاتی کام، کتابیں، یا سائنسی ایجادات۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مصنف یا موجد کو اس کی محنت کا صلہ مل سکے۔ تاہم، یہ ملکیت مطلق نہیں بلکہ محدود ہے، اور ایک مخصوص مدت کے بعد وہ علم عوامی ملکیت بن جاتا ہے تاکہ دوسرے لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

علم کے استعمال کے دائرے میں اگر علم کو بغیر کسی نقصان یا جھوٹ کے دوسروں کے فائدے کے لیے استعمال کیا جائے تو یہ علمی سرقہ نہیں کہلائے گا۔ مثلاً کسی کتاب سے مواد لے کر طلبہ کو پڑھانا، علمی تحقیق میں حوالہ دینا، یا کسی ماہر کے نظریات کو عام فہم انداز میں بیان کرنا۔ اسلامی تعلیمات میں علم کے حقوق کا احترام کیا گیا ہے، لیکن علم کو صرف مخصوص افراد یا گروہوں تک محدود رکھنے کے عمل کو ناپسندیدہ سمجھا گیا ہے۔ علم کو دوسروں تک پہنچانا اور اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچانا دین اسلام کا بنیادی مقصد ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ کسی کے علم سے استفادہ اس وقت علمی سرقہ نہیں کہلائے گا جب اس کا مقصد عوامی بھلائی، ماخذ کا اعتراف، اور علم کی اشاعت ہو۔ اسی طرح کسی کی علم پر اجارہ داری یا ملکیت اس وقت جائز ہو سکتی ہے جب اس کا مقصد اس علم کی حفاظت، ترقی، اور غلط استعمال سے بچاؤ ہو۔ اسلام میں علم کو امانت قرار دیا گیا ہے، اور اس امانت کی حفاظت اور اسے دوسروں تک پہنچانے کے اصول انسانیت کی خدمت اور معاشرتی انصاف پر مبنی ہیں۔

اسلام میں علمی ملکیت کا تصور:

اسلام میں علم کی ملکیت کا تصور بہت وسیع اور عمیق ہے۔ قرآن مجید اور اہل بیت (علیہم السلام) کے فرامین میں علم کو ایک عظیم نعمت، امانت، اور صدقہ جاریہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جس کی ملکیت کو انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر سمجھنا ضروری ہے۔

قرآن کی نظر میں علم کی ملکیت:

قرآن مجید کے مطابق، علم کا اصل مالک اللہ ہے اور وہ جسے چاہتا ہے، اپنے فضل سے علم عطا کرتا ہے۔ علم کو امانت کے طور پر سمجھا گیا ہے، جسے نیک نیتی اور دوسروں کی بھلائی کے لیے استعمال کرنا ضروری ہے۔ قرآن نے علم کی اشاعت اور دوسروں کو فائدہ پہنچانے پر زور دیا ہے۔

اہل بیت (علیہم السلام) کی تعلیمات میں علم کی ملکیت:

اہل بیت (علیہم السلام) نے علم کو سب سے بڑی دولت قرار دیا اور اس کی ملکیت کو ذاتی یا محدود رکھنے کے بجائے اسے عوامی فلاح کے لیے استعمال کرنے پر زور دیا۔ حضرت علی (علیہ السلام) نے علم پر کنجوسی کرنے کو جہالت قرار دیا اور فرمایا کہ علم کی زینت یہ ہے کہ اسے دوسروں کے فائدے کے لیے استعمال کیا جائے۔ حضرت علی (علیہ السلام) نے یہ بھی فرمایا کہ علم دولت سے بہتر ہے کیونکہ علم تمہاری حفاظت کرتا ہے، جبکہ دولت کی حفاظت تمہیں خود کرنی پڑتی ہے۔

علم کی ملکیت کے اہم اصول:

علم حاصل کرنے کا انفرادی حق ہے، لیکن اس کا استعمال دوسروں کی بھلائی کے لیے کیا جانا چاہیے۔ علم کو چھپانا یا اس پر اجارہ داری قائم کرنا اسلامی اصولوں کے خلاف ہے۔ علم رکھنے والا شخص اپنی معلومات کو صحیح طریقے سے دوسروں تک پہنچانے اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کا ذمہ دار ہے۔

زمان و مکان کے تناظر میں علم کی ملکیت:

جدید دور میں علم کو ٹیکنالوجی، تحقیق، اور سائنسی ایجادات کے ذریعے عام کرنے کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ مختلف خطوں میں علم کی رسائی کو یقینی بنانا اسلامی اصولوں کا حصہ ہے، تاکہ کوئی بھی شخص محروم نہ رہے۔

قرآن اور اہل بیت (علیہم السلام) کی تعلیمات کے مطابق، علم کی ملکیت کا تصور نہایت جامع اور عالمگیر ہے۔ علم اللہ کی نعمت ہے، جسے ذاتی فائدے کے بجائے اجتماعی فلاح، انصاف، اور ترقی کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے۔

تشیع کی سیاسی نفسیات

شیعہ سیاسی نفسیات کو سمجھنے کے لیے اس مکتبِ فکر کی تاریخی، اعتقادی اور سماجی بنیادوں کا گہرا جائزہ لینا ضروری ہے۔ شیعہ عقائد اور تاریخ نے اس جماعت کی سیاسی سوچ اور رویے پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں، جو ان کی اجتماعی شناخت میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ شیعہ فکر کی بنیاد قرآن، سنت اور اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات پر ہے۔ شیعہ عقیدے میں قیادت کو خاص اہمیت حاصل ہے، جو عقیدۂ امامت کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے۔ امام کو نہ صرف دینی بلکہ سیاسی اور سماجی رہنما بھی سمجھا جاتا ہے۔ اس قیادت کی بنیاد الٰہی منصوبے پر ہے اور یہی تصور شیعہ سیاسی نفسیات کی جڑ ہے۔

کربلا کا واقعہ شیعہ تاریخ کا ایک اہم ترین موڑ ہے، جہاں امام حسین علیہ السلام نے ظلم اور جبر کے خلاف قیام کیا۔ یہ واقعہ شیعہ نفسیات میں مظلومیت کے احساس، انصاف کی جدوجہد اور قربانی کے جذبے کو ہمیشہ کے لیے مرکزی حیثیت دے گیا۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ سیاسی رویوں میں مظلوموں کی حمایت، حق کی سربلندی اور عدل و انصاف کے قیام کی جستجو نمایاں رہتی ہے۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں شیعہ برادری کو سیاسی اور سماجی جبر کا سامنا کرنا پڑا۔ خلافت کے ابتدائی ادوار سے لے کر عباسیوں، امویوں اور دیگر حکومتوں کے تحت شیعوں کو دبانے کی کوششیں کی گئیں۔ اس مسلسل جبر نے شیعہ کمیونٹی میں مظلومیت کے احساس کو گہرا کیا اور ان کی اجتماعی شناخت کو مستحکم کیا۔ مظلومیت کا یہ احساس ان کے سیاسی شعور اور حکمت عملی میں اہم کردار ادا کرتا ہے، جس کی بنیاد عدل کے قیام اور ظلم کے خلاف مزاحمت پر ہے۔

شیعہ عقیدے میں امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کا تصور ایک منفرد سیاسی و نفسیاتی پہلو فراہم کرتا ہے۔ یہ تصور امید اور صبر کے ساتھ جدوجہد کے جذبے کو جوڑتا ہے۔ انتظار کا یہ فلسفہ شیعہ برادری کو نہ صرف مایوسی سے بچاتا ہے بلکہ ان کے سیاسی عمل کو حکمت اور طویل المدتی منصوبہ بندی کی طرف بھی راغب کرتا ہے۔ یہ تصور روحانی سکون اور اجتماعی مقصد فراہم کرتا ہے، جو شیعہ کمیونٹی کی نفسیاتی طاقت کا حصہ ہے۔

شیعہ سیاسی نفسیات میں قیادت کی غیر معمولی اہمیت ہے۔ امام علی علیہ السلام کی حکمرانی کے اصول اور ان کے خطبات اس فکر کے بنیادی ماخذ ہیں۔ قیادت کے لیے علم، تقویٰ اور عدل کو معیار سمجھا جاتا ہے۔ شیعہ معاشرت میں قیادت کی یہ صفات ان کے تنظیمی ڈھانچے اور اجتماعی فیصلوں میں جھلکتی ہیں۔ اس کے ساتھ اجتماعی شعور کو بھی خاص اہمیت دی گئی ہے۔ مجالس، عزاداری اور دیگر اجتماعی رسومات نہ صرف مذہبی بلکہ سماجی وسیاسی اتحاد کا ذریعہ بھی ہیں۔ یہ اجتماعات برادری کو منظم رکھنے، ان کے مسائل پر گفتگو کرنے اور مشترکہ جدوجہد کے لیے پلیٹ فارم فراہم کرتے ہیں۔

آج کے دور میں شیعہ سیاسی نفسیات کو مختلف چیلنجز کا سامنا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں سیاسی بحران، فرقہ وارانہ کشیدگی اور عالمی سیاست میں طاقت کا کھیل شیعہ برادری کے لیے نئے امتحانات لے کر آیا ہے۔ ان حالات میں شیعہ برادری اپنے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے مظلوموں کی حمایت اور انصاف کی جدوجہد کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ ایران کا اسلامی انقلاب اور حزب اللہ کی مزاحمتی تحریک اس سیاسی فکر کی عملی مثالیں ہیں، جو اس کے اندر موجود مزاحمت، حکمت اور قربانی کے جذبات کو ظاہر کرتی ہیں۔

شیعہ سیاسی نفسیات عدل، قیادت اور ظلم کے خلاف مزاحمت پر مبنی ہے۔ مظلومیت کا احساس، انتظار کا فلسفہ اور اجتماعی شعور اس نفسیات کی بنیاد ہیں۔ تاریخی تجربات نے شیعہ برادری کو ایک منفرد سیاسی شعور دیا ہے، جو نہ صرف ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے اہم ہے بلکہ دوسروں کے حقوق کی جدوجہد کے لیے بھی محرک ہے۔ شیعہ سیاسی نفسیات نہ صرف ایک سیاسی نظریہ بلکہ اخلاقی، روحانی اور سماجی فکر بھی ہے، جو دنیا کے مظلوموں کے لیے امید کا پیغام دیتی ہے۔

تشیع کے اندرون مکتب سیاسی نفسیات میں کچھ پیچیدگیاں موجود ہیں جو مختلف عوامل کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ پیچیدگیاں تاریخی، اعتقادی، سماجی اور عملی پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہیں اور شیعہ برادری کے سیاسی اور سماجی ارتقا پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

تاریخی طور پر، شیعہ مکتب میں قیادت کا تصور بنیادی حیثیت رکھتا ہے، اور امام کو الٰہی رہنما تسلیم کیا جاتا ہے۔ تاہم، امام مہدی علیہ السلام کی غیبت کبریٰ کے دوران قیادت کا سوال

پیچیدگی پیدا کرتا ہے۔ غیبت کے دور میں فقہا کی قیادت کا تصور (ولایت فقیہ) مختلف شیعہ معاشروں میں مختلف انداز سے قبول کیا گیا ہے، جس سے مکتب کے اندر قیادت اور رہنمائی کے بارے میں اختلاف رائے پیدا ہوا ہے۔ کچھ گروہ ولایت فقیہ کو مانتے ہیں، جبکہ دوسرے اس کے دائرے کو محدود کرنے یا اسے تسلیم نہ کرنے کا نظریہ رکھتے ہیں۔ یہ اختلاف بعض اوقات سیاسی اور عملی مسائل کو جنم دیتا ہے۔

شیعہ مکتب کے اندرون میں سیاسی نفسیات کی ایک اور پیچیدگی فرقہ وارانہ اختلافات ہیں۔ مختلف تاریخی اور ثقافتی پس منظر رکھنے والے شیعہ گروہوں کے درمیان بعض اوقات اجتہاد، فقہی مسائل، یا مقامی سماجی معاملات پر اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ اختلافات صرف نظریاتی نوعیت کے نہیں بلکہ بعض اوقات عملی سطح پر بھی مکتب کے اتحاد کو متاثر کرتے ہیں۔

سماجی سطح پر، تشیع میں عزاداری اور کربلا کے واقعات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ عقیدہ اور عملی شعائر شیعہ کمیونٹی کو مضبوطی سے جوڑتے ہیں، لیکن بعض اوقات ان شعائر کی نوعیت اور اظہار پر اختلافات پیدا ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر، ماتم، زنجیر زنی، یا دیگر مراسم کی شدت اور طریقے پر مختلف آراپائی جاتی ہیں، جو بعض اوقات تنازعات کا سبب بن سکتی ہیں۔

معاشرتی اور سیاسی حالات بھی شیعہ مکتب کی سیاسی نفسیات میں پیچیدگیوں کا باعث بنتے ہیں۔ مختلف ممالک میں شیعہ برادریوں کو متنوع سماجی، سیاسی اور قانونی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا

ہے۔ ایران میں ولایت فقیہ کے تصور نے ایک ریاستی ماڈل کے طور پر نمایاں حیثیت حاصل کی ہے، لیکن دیگر ممالک جیسے عراق، لبنان، اور بحرین میں شیعہ برادریوں کو مختلف سیاسی نظاموں کے تحت اپنی حیثیت کو منوانے کے لیے جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ یہ حالات شیعہ مکتب کے اندر سیاسی نقطہ نظر اور حکمت عملی میں اختلافات پیدا کرتے ہیں۔

ایک اہم مسئلہ جدیدیت اور روایت کے درمیان توازن کا بھی ہے۔ کچھ شیعہ گروہ جدید سیاسی تصورات جیسے جمہوریت، انسانی حقوق، اور سیکولرازم کے ساتھ اپنی تعلیمات کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جبکہ دیگر گروہ ان تصورات کو دینی اصولوں سے متصادم سمجھتے ہیں۔ یہ تنازع مکتب کے اندر ایک فکری اور عملی تقسیم کا باعث بن سکتا ہے۔

شیعہ سیاسی نفسیات کی ایک اور پیچیدگی داخلی تنقید کو قبول کرنے کا رویہ ہے۔ بعض حلقے مکتب کی روایتی تعبیرات پر سختی سے عمل کرتے ہیں اور کسی بھی قسم کی داخلی تنقید کو برداشت نہیں کرتے، جبکہ دیگر افراد یا گروہ ان روایات کو جدید حالات کے مطابق دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے اندرونی سطح پر ایک تنازع پیدا ہوتا ہے جو بعض اوقات فکری ترقی کے عمل کو روک سکتا ہے۔

یہ پیچیدگیاں شیعہ سیاسی نفسیات کو ایک منفرد، لیکن چیلنجنگ پہلو عطا کرتی ہیں۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے اتحاد، رواداری، اور اجتہادی عمل میں وسعت کی ضرورت ہے تاکہ مکتب کے اندر مختلف آرا اور حکمت عملیوں کو جگہ دی جا سکے اور ایک جامع اور

متحرک سیاسی نظریہ تشکیل دیا جا سکے جو نہ صرف شیعہ برادری کے مسائل کو حل کرے بلکہ عالمی سطح پر ان کے کردار کو بھی مضبوط بنائے۔

شیعہ مکتب کے مختلف گروہوں کے درمیان جدید سیاسی تصورات جیسے جمہوریت، انسانی حقوق، اور سیکولرازم کو اپنانے یا مسترد کرنے کے معاملے میں تصفیہ ایک حساس اور اہم موضوع ہے، جس کے لیے سیرت ائمہ علیہم السلام سے رہنمائی لینا ضروری ہے۔ اختلافات کو حکمت، علم، اور دلیل کے ذریعے حل کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ ائمہ علیہم السلام کی زندگی میں بارہا نظر آتا ہے۔ ان کے طرز عمل سے یہ سیکھا جا سکتا ہے کہ تعصب اور جذباتیت سے بچتے ہوئے علمی مکالمے اور اجتہادی عمل کے ذریعے مسائل کو سمجھنے اور ان کا حل پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔ تمام نظریات اور حکمت عملیوں کو قرآن و سنت کی روشنی میں پرکھا جائے، کیونکہ ائمہ علیہم السلام نے ہمیشہ دینی اصولوں کو مقدم رکھا، لیکن حکمت عملی کو حالات کے مطابق ڈھالنے کی اجازت دی۔

رواداری اور اتحاد کو فروغ دینا بھی تصفیے کا اہم جزو ہے۔ ائمہ علیہم السلام کے طرز عمل میں اختلاف رائے کو برداشت کرنے اور امت کو جوڑنے کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ امام علی علیہ السلام کے دور میں مختلف نظریات رکھنے والے گروہوں کے ساتھ ان کے معاملات اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ امت کی تشکیل کے لیے صبر اور برداشت لازمی ہیں۔ اس کے علاوہ، اختلافات کے باوجود مشترکہ مقاصد پر کام کرنے کی اہمیت بھی ائمہ کی سیرت میں نمایاں ہے۔

عملی تجربے کی بنیاد پر فیصلے کرنا ایک اور اہم پہلو ہے۔ تاریخ ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ وہ حکمت عملیاں کامیاب رہیں جو عوامی بھلائی اور سماجی انصاف کو فروغ دیتی ہیں۔ اس لیے مختلف گروہوں کو اپنے نظریات کو عملی میدان میں آزمانا چاہیے اور ان کے نتائج کا جائزہ لے کر حکمت عملی وضع کرنی چاہیے۔ سیرت ائمہ علیہم السلام سے رہنمائی لیتے ہوئے سیاسی بصیرت کا حامل وہ گروہ ہو گا جو عوام کی بھلائی اور انصاف کو مقدم رکھے، دینی اصولوں کی حفاظت کرے، زمانے کے تقاضوں کو سمجھے اور ان کے مطابق عمل کرے، اور امت کے اتحاد کو فروغ دینے کے لیے اپنی تمام تر کوششیں بروئے کار لائے۔

ائمہ علیہم السلام نے ہمیشہ زمانے کے حالات کو سمجھا اور ان کے مطابق حکمت عملی اپنائی۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے علمی تحریک کا آغاز کیا، جبکہ امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام نے سیاسی حالات کے مطابق مختلف حکمت عملیاں اپنائیں۔ اس طرز عمل کی روشنی میں جو گروہ جدید سیاسی تصورات کو اپناتے ہوئے دینی اصولوں کی حفاظت یقینی بنائے اور عوامی بھلائی کے لیے کام کرے، وہ بصیرت کا حامل سمجھا جا سکتا ہے۔ ائمہ علیہم السلام کی زندگی اس بات کا عملی نمونہ پیش کرتی ہے کہ اختلافات کو علمی مکالمے، اجتہادی عمل، اور رواداری کے ذریعے حل کیا جائے اور امت کے درمیان اتحاد و اتفاق کو فروغ دیا جائے۔

ولایت فقیہ کا تصور شیعہ فقہ میں ایک اہم نظریہ ہے، جو اسلام کی اجتماعی زندگی اور دینی قیادت کی ذمہ داریوں کو سمجھنے کا ایک منفرد فریم ورک پیش کرتا ہے۔ تاہم، اس تصور پر

عقیدہ رکھنے اور اسے عملی طور پر تسلیم کرنے کے حوالے سے شیعہ مکتب فکر میں مختلف آراء اور اختلافات موجود ہیں۔ کچھ افراد اور گروہ اس نظریے کو دینی قیادت کا کامل نمونہ سمجھتے ہیں، جو امام معصوم کی غیبت کے دوران مسلمانوں کی رہنمائی کا واحد شرعی اور عقلی حل پیش کرتا ہے۔ ان کے نزدیک ولایت فقیہ دینی اور دنیاوی معاملات میں اسلامی اصولوں کی حاکمیت کو یقینی بنانے کے لیے ضروری ہے۔

دوسری جانب، کچھ گروہوں یا افراد اس تصور کے بارے میں محتاط یا مختلف رائے رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ نظریہ دینی اصولوں کی ایک ممکنہ تعبیر ہے، لیکن اسے اجماعی طور پر تسلیم کرنا ضروری نہیں۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ دین اسلام کے بنیادی اصولوں کی تشریح اور نفاذ مختلف زمانوں اور معاشرتی حالات کے تحت مختلف ہو سکتی ہے۔ اس لیے، ولایت فقیہ کے نظریے کو نافذ کرنے کے لیے وسیع تر اجتہادی اور علمی بحث کی ضرورت ہے۔

ایک اور پہلو ان اختلافات میں یہ ہے کہ ولایت فقیہ کے عملی نفاذ پر بھی مختلف نقطہ نظر پائے جاتے ہیں۔ کچھ افراد یا گروہ اس نظام کو عملی طور پر کامیاب سمجھتے ہیں، جبکہ دیگر اس کے نفاذ میں پیش آنے والے مسائل، غلطیوں، یا تنازعات کو بنیاد بنا کر اس پر تنقید کرتے ہیں۔ وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ ولایت فقیہ کے نظریے کو عملی طور پر لاگو کرنے کے لیے معاصر سیاسی، سماجی، اور عالمی حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے زیادہ جامع حکمت عملی اپنانے کی ضرورت ہے۔

ان اختلافات کے باوجود، سیرت ائمہ علیہم السلام اس معاملے میں رہنمائی فراہم کرتی ہے کہ اختلافات کو برداشت کرتے ہوئے علم، حکمت، اور دلیل کے ذریعے مکالمے کو فروغ دیا جائے۔ ائمہ علیہم السلام نے ہمیشہ امت کے درمیان اتحاد کو ترجیح دی اور اختلافات کے باوجود مشترکہ مقاصد پر کام کیا۔ اس تناظر میں، ولایت فقیہ کے نظریے پر اختلافات کو دینی اصولوں کی بنیاد پر تعمیری مکالمے اور تحقیق کے ذریعے حل کیا جا سکتا ہے۔

اس مسئلے کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ولایت فقیہ کے تصور کو معاصر سیاسی اور سماجی حالات کے مطابق سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ائمہ علیہم السلام کی سیرت ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ قیادت کے اصولوں کو ہمیشہ حق اور انصاف پر مبنی ہونا چاہیے، اور اس میں عوامی بھلائی اور دینی اصولوں کی حفاظت کو مقدم رکھا جائے۔ لہٰذا، ولایت فقیہ کے نظریے کو نہ صرف دینی نصوص کی روشنی میں پرکھا جانا چاہیے، بلکہ اس کے عملی نفاذ کے طریقہ کار کو بھی وسیع تر مشاورت اور اجتہادی عمل کے ذریعے بہتر بنایا جانا چاہیے تاکہ امت میں اتحاد قائم رہے اور دینی اصولوں کی بالادستی یقینی ہو۔

ولایت فقیہ کا تصور شیعہ مکتب فکر میں ایک اہم دینی اور سیاسی نظریہ ہے، جو امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف کے ظہور کی تیاری کے مقصد سے امت کی رہنمائی کو ایک منظم شکل دینے کی کوشش کرتا ہے۔ تاہم، اس نظریے کو ماننے والوں کے درمیان عملی طور پر مختلف آراء اور طریقہ کار پائے جاتے ہیں، جو ان کے نظریاتی تناظر، معاشرتی حالات اور سیاسی ترجیحات کی عکاسی کرتے ہیں۔

ایک اہم اختلاف اس بات پر ہے کہ امام زمانہ کے ظہور کی تیاری کے لیے کون سا طریقہ زیادہ مؤثر اور دینی اصولوں سے قریب تر ہے۔ کچھ افراد اور گروہ جدید سیاسی تصورات جیسے جمہوریت، انسانی حقوق، اور سیکولرازم کو دین کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان تصورات کو اپنانے سے دین کی آفاقیت اور انسانیت کے لیے اس کے حقیقی پیغام کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کا موقع ملتا ہے۔ وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ ان تصورات کے ذریعے اسلامی اصولوں کو بہتر طور پر عملی شکل دی جا سکتی ہے اور معاصر دنیا کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کی جا سکتی ہے۔

اس کے برعکس، دیگر گروہ جمہوریت اور سیکولرازم جیسے تصورات کو دینی اصولوں سے متصادم سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ تصورات اسلامی تعلیمات کو محدود کر دیتے ہیں اور دینی اصولوں کی روح کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اسلامی قیادت کا نظام الٰہی قوانین پر مبنی ہونا چاہیے، جس میں انسانی خواہشات اور محدود عقلی تصورات کی گنجائش نہ ہو۔ یہ گروہ روایتی تعبیرات پر سختی سے عمل کرتے ہیں اور کسی بھی داخلی تنقید یا اصلاح کی کوشش کو مکتب کی بنیادوں کے خلاف سمجھتے ہیں۔

ایران کے اندر بھی ان اختلافات کی جھلک واضح طور پر نظر آتی ہے۔ وہاں اصلاح طلب اور قدامت پسند گروہوں کے درمیان یہ بحث جاری ہے کہ ولایت فقیہ کے نظام کو کس طرح بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ اصلاح طلب گروہ جدید سیاسی، سماجی، اور عالمی حالات کے مطابق دینی اصولوں کی تشریح اور نفاذ پر زور دیتے ہیں، جبکہ قدامت پسند گروہ روایتی اصولوں اور

طریقہ کار کو برقرار رکھنے کے حامی ہیں۔ ان اختلافات کے باوجود، دونوں گروہ امام زمانہ کے ظہور کی تیاری کے مقصد پر متفق ہیں، لیکن ان کی منزل تک پہنچنے کی روشیں مختلف ہیں۔

ایران سے باہر، خاص طور پر پاکستان جیسے ممالک میں بھی، ولایت فقیہ کے حامیوں میں یہی تقسیم نظر آتی ہے۔ کچھ افراد جدید سیاسی نظام اور عالمی تعلقات کے تناظر میں ولایت فقیہ کے نظریے کو ایک وسیع تر دائرے میں دیکھتے ہیں، جبکہ دیگر اس تصور کو مکمل طور پر روایتی طرز پر اپنانے کے قائل ہیں۔ یہ اختلافات کبھی کبھار تنظیموں، علما اور عوام کے درمیان تنازعات اور مباحث کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

یہ اختلافات دراصل اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ولایت فقیہ کے تصور کو عملی شکل دینے میں مختلف عوامل کارفرما ہوتے ہیں، جن میں زمان و مکان کی تبدیلی، سیاسی حالات، اور فکری تنوع شامل ہیں۔ ان اختلافات کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دینی قیادت وسیع تر مشاورت، حکمت عملی، اور مکالمے کو فروغ دے۔ ائمہ علیہم السلام کی سیرت سے یہ سبق ملتا ہے کہ اختلافات کو صبر، حکمت اور محبت کے ساتھ حل کیا جائے اور امت کے اتحاد کو ترجیح دی جائے۔ ولایت فقیہ کے نظام کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس کے ماننے والے نہ صرف دینی اصولوں کو برقرار رکھیں بلکہ معاصر دنیا کے ساتھ بھی ایک متوازن تعلق قائم کریں، تاکہ امام زمانہ کے ظہور کی تیاری کے مقصد کو حقیقی معنوں میں حاصل کیا جاسکے۔

جذباتی عمل اور عقلی عمل

انسانی زندگی میں جذبات اور عملی سوچ کے درمیان توازن کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ جذبات انسانی فطرت کالازمی حصہ ہیں اور یہ ہماری شخصیت، فیصلوں، اور تعلقات میں گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ لیکن اگر جذبات کو بے قابو چھوڑ دیا جائے اور وہ ہمارے فیصلوں پر حاوی ہو جائیں، تو یہ نہ صرف ہماری زندگی کو پیچیدہ بنا سکتے ہیں بلکہ ہمیں ناپسندیدہ نتائج کی طرف بھی لے جا سکتے ہیں۔ جذبات کو قابو میں رکھ کر، عملی انداز اپنانا ہی کامیاب اور متوازن زندگی کی کنجی ہے۔

جذبات اکثر وقتی اور شدت پر مبنی ہوتے ہیں، جیسے غصہ، حسد، یا مایوسی، جو ہمیں جلد بازی میں فیصلے کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ یہ فیصلے بعد میں ندامت کا باعث بن سکتے ہیں کیونکہ وہ حالات کی حقیقی تصویر کے بجائے صرف ہمارے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، کسی بحث میں غصے کی وجہ سے غیر ضروری بات کہہ دینا یا کسی وقتی خوشی کے لیے غیر دانشمندانہ فیصلہ لینا ہماری زندگی پر منفی اثر ڈال سکتا ہے۔

عملیت پسندی ہمیں سکھاتی ہے کہ جذبات کو سمجھنا اور ان کی قدر کرنا ضروری ہے، لیکن ان پر مکمل انحصار نہیں کرنا چاہیے۔ عملی سوچ کا مطلب ہے کہ ہم اپنے جذبات کے پیچھے چھپے عوامل کو سمجھیں، ان پر غور کریں، اور ان کے مطابق ایسے فیصلے کریں جو منطقی اور طویل

مدتی فائدے کے حامل ہوں۔ یہ عمل ہمیں جذباتی اتار چڑھاؤ کے باوجود درست راستہ اختیار کرنے میں مدد دیتا ہے۔

عملی سوچ کا مطلب جذبات کو دبا دینا نہیں ہے بلکہ ان کو ایک صحت مند طریقے سے سنبھالنا ہے۔ یہ ہمیں جذبات کی اہمیت کو سمجھنے اور ان کو ہماری زندگی کے بہتر فیصلوں میں شامل کرنے کا راستہ دکھاتا ہے۔ مثلاً، اگر آپ مایوس ہیں تو اس کے پیچھے کے اسباب کو سمجھ کر اس کا حل نکالنا ایک عملی قدم ہوگا، بجائے اس کے کہ آپ مایوسی کے باعث بے عملی یا منفی رویہ اختیار کریں۔

زندگی میں کامیابی اور سکون حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم جذبات اور عملیت کے درمیان ایک متوازن رویہ اپنائیں۔ جذبات انسان کو زندگی کی خوشیوں اور رشتوں کا احساس دلاتے ہیں، جبکہ عملی سوچ اسے بہتر فیصلے کرنے اور مشکلات کا سامنا کرنے کی طاقت دیتی ہے۔ جذبات کو اپنا غلام بنائیں، آقا نہیں، تاکہ آپ کی زندگی آپ کی اپنی سوچ اور عمل کے مطابق آگے بڑھے، نہ کہ وقتی جذبات کے بہاؤ کے مطابق۔

حسد خود کشی ہے

حسد ایک ایسی کیفیت ہے جو انسان کی روح کو کمزور کرتی ہے اور اس کے ذہن و دل میں ایک ناقابل برداشت بے چینی پیدا کرتی ہے۔ یہ نہ صرف دوسروں کے خلاف نفرت کو بڑھاتی ہے بلکہ حسد کرنے والے کو بھی اندرونی سکون سے محروم کر دیتی ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" : اور اپنے مال و دولت کو نہ دیکھو جو ہم نے ان میں سے بعض کو دنیاوی زندگی کی زینت کے طور پر دی ہے تاکہ ہم انہیں آزمائیں، اور تمہارے رب کا رزق بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔ "(طٰہٰ: 131)۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ انسان کو دنیاوی چیزوں پر حسد کرنے سے منع کرتا ہے اور آخرت کی کامیابی پر توجہ مرکوز کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔

امام علیؑ فرماتے ہیں" : حسد کرنے والے کے لیے کوئی سکون نہیں ہوتا۔ "یہ قول واضح کرتا ہے کہ حسد انسان کی روحانی اور ذہنی حالت کو برباد کر دیتا ہے۔ دوسروں کی کامیابیوں کو دیکھ کر حسد کرنا اس بات کی نشانی ہے کہ انسان اپنی نعمتوں کو بھول رہا ہے اور اللہ کی تقسیم پر شک کر رہا ہے۔ اللہ نے ہر فرد کو اس کی قابلیت اور ضرورت کے مطابق نوازا ہے، اور ہمیں اس کی حکمت پر اعتماد کرنا چاہیے۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا" : حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔ "یہ بیان اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے

کہ حسد ایک ایسی کیفیت ہے جو انسان کی روحانی ترقی کو ختم کر دیتی ہے اور اسے گناہوں کی طرف دھکیلتی ہے۔

حسد کرنے کے بجائے، انسان کو دوسروں کی کامیابیوں کو قبول کرنا اور ان سے سیکھنا چاہیے۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں" : جو شخص اللہ کی دی ہوئی نعمتوں پر شکر ادا کرتا ہے، اللہ اس کی نعمتوں میں اضافہ کرتا ہے۔ "یہ قول ہمیں اس بات کا درس دیتا ہے کہ حسد کے بجائے شکر گزاری کا رویہ اپنانا چاہیے۔ اگر ہم دوسروں کی کامیابیوں کو اللہ کی حکمت کا حصہ سمجھیں اور اپنے حصے کی نعمتوں پر شکر ادا کریں، تو یہ رویہ نہ صرف ہماری اپنی روحانی ترقی کا ذریعہ بنے گا بلکہ ہماری زندگی کو بھی آسان اور سکون بخش بنائے گا۔

حسد ایک بیکار اور تباہ کن جذبات ہے، کیونکہ یہ نہ تو دوسروں کو نقصان پہنچاتا ہے اور نہ ہی حسد کرنے والے کو کچھ فائدہ دیتا ہے۔ دنیا میں ہر شخص کے پاس اپنی قابلیت اور وسائل کے مطابق کامیابی حاصل کرنے کے مواقع موجود ہیں۔ اگر ہم دوسروں کی کامیابیوں کو قبول کریں اور اپنی توانائیاں اپنی ترقی پر مرکوز کریں، تو ہم حسد کے بوجھ سے آزاد ہو سکتے ہیں۔ قرآن اور اہلبیتؑ کی تعلیمات ہمیں اس بات کا درس دیتی ہیں کہ دوسروں کی کامیابیوں کو خوش دلی سے قبول کریں اور اپنی منزل کو حاصل کرنے کے لیے محنت کریں۔

زندگی میں دوسروں کی کامیابیوں کو حسد کے بجائے انسپائریشن کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ ہر فرد کا اپنا سفر اور اپنی منزل ہوتی ہے، اور اللہ ہر کسی کے لیے مختلف راستے اور مواقع پیدا کرتا ہے۔ حسد ایک ایسی کیفیت ہے جو انسان کو اپنے راستے سے ہٹا دیتی ہے اور اسے

اندرونی سکون سے محروم کر دیتی ہے۔ لہذا، حسد کو ترک کر کے اللہ کی تقسیم پر راضی رہنا اور دوسروں کی کامیابیوں کو قبول کرنا ہی حقیقی خوشی اور سکون کا ذریعہ ہے۔

خدا کی خاطر سکون کی پروا نہ کرنا

اندرونی سکون یا "inner peace" کسی بھی رشتے یا تعلقات کو بہتر بنانے سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ انسانی زندگی میں تعلقات بے شک بہت اہم ہیں، کیونکہ یہ ہمارے جذباتی، سماجی، اور نفسیاتی پہلوؤں کو مکمل کرتے ہیں۔ لیکن اگر ان تعلقات کو نبھانے کے لیے آپ کو اپنا اندرونی سکون قربان کرنا پڑے، تو یہ تعلقات نہ صرف بوجھ بن سکتے ہیں بلکہ آپ کی ذہنی صحت اور خوشحالی کو بھی متاثر کر سکتے ہیں۔

اندرونی سکون وہ حالت ہے جہاں انسان اپنی ذات کے ساتھ مطمئن ہو، اپنے فیصلوں پر اعتماد رکھے، اور کسی بھی صورت حال میں ذہنی اور جذباتی توازن برقرار رکھ سکے۔ یہ سکون کسی بیرونی شے یا تعلقات پر منحصر نہیں ہوتا بلکہ انسان کی اپنی ذات سے جڑا ہوتا ہے۔ جب آپ کے اندر سکون موجود ہو، تو آپ تعلقات کو بہتر طریقے سے سمجھنے، سنبھالنے، اور پروان چڑھانے کے قابل ہوتے ہیں۔ لیکن اگر آپ اندرونی طور پر بے چین ہیں، تو آپ کا ہر عمل اور رویہ اس بے سکونی کا عکس بن سکتا ہے، جو تعلقات میں مزید خرابی پیدا کر سکتا ہے۔

کبھی کبھار، تعلقات کو بہتر بنانے کی کوشش میں انسان اپنی ذات کے ساتھ سمجھوتہ کر لیتا ہے، اپنی حدود اور ضروریات کو نظر انداز کرتا ہے، اور مسلسل تناؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ رویہ نہ صرف اندرونی سکون کو ختم کر دیتا ہے بلکہ تعلقات میں بھی حقیقی بہتری نہیں لا پاتا۔ اصل مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم اپنی خوشی اور سکون کو دوسروں کی خوشی یا

قبولیت پر منحصر کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے جذبات کو دباتے رہتے ہیں، اور ایک وقت ایسا آتا ہے جب ہم نہ خود کے لیے اور نہ ہی دوسروں کے لیے کچھ کر پاتے ہیں۔

تعلقات کی اہمیت اپنی جگہ ہے، لیکن ان کی بہتری کے لیے اپنی ذات کے ساتھ بے وفائی نہ کریں۔ جب آپ اپنے اندر سکون پاتے ہیں اور اپنی ذات کو ترجیح دیتے ہیں، تو آپ نہ صرف بہتر فیصلے کر سکتے ہیں بلکہ تعلقات میں بھی زیادہ مخلص اور مستحکم ہو سکتے ہیں۔ حقیقی تعلقات وہی ہوتے ہیں جو آپ کی ذات اور سکون کا احترام کریں اور آپ کی زندگی میں بوجھ کی بجائے سہارا بنیں۔ اندرونی سکون کو اپنی ترجیح بنانا نہ صرف آپ کی شخصیت کو بہتر بناتا ہے بلکہ آپ کے تعلقات کو بھی مضبوط اور با معنی بناتا ہے۔

اندرونی سکون بلاشبہ انسانی زندگی کی ایک بنیادی ضرورت ہے، لیکن جب بات خدا سے تعلق کی ہو تو یہ سکون بھی قربان کیا جا سکتا ہے، کیونکہ خدا ہی وہ ذات ہے جو انسان کے سکون کو حقیقی اور دائمی طور پر دوبارہ تعمیر کر سکتا ہے۔ انسانی تعلقات اور رشتے ہماری زندگی کے اہم پہلو ہیں، لیکن جب یہ تعلقات ہماری زندگی میں خدا کی محبت اور اس کی رضا کے راستے میں رکاوٹ بن جائیں، تو ان سے زیادہ اہم خدا کے ساتھ ہمارا رشتہ ہو جاتا ہے۔

خدا کے ساتھ تعلق وہ سکون فراہم کرتا ہے جو کسی بھی دنیاوی تعلق سے ممکن نہیں۔ جب انسان اپنے اندرونی سکون کو خدا کی رضا کی خاطر قربان کرتا ہے، تو یہ ایک وقتی بے چینی یا اضطراب کی صورت میں سامنے آ سکتا ہے۔ لیکن یہ قربانی ایک ایسی عظیم روحانی ترقی کا ذریعہ بنتی ہے جو دل کو حقیقی سکون اور اطمینان عطا کرتی ہے۔ خدا کے ساتھ تعلق میں انسان

اپنی ذات، اپنے جذبات، اور اپنی خواہشات کو خدا کی محبت کے سپرد کرتا ہے، اور یہی سپردگی اسے وہ مقام عطا کرتی ہے جہاں اندرونی سکون کی حقیقی تعمیر ہوتی ہے۔

بعض اوقات انسان اپنی زندگی کے تعلقات کو نبھانے یا ان میں بہتری لانے کے لیے اپنی ذات کے سکون کو قربان کرتا ہے، لیکن یہ قربانی محدود اور عارضی نتائج دیتی ہے۔ خدا کی محبت کے لیے کیا گیا یہ عمل دائمی ہے، کیونکہ خدا انسان کو اس سے زیادہ سکون اور اطمینان عطا کرتا ہے جتنا وہ اپنی کوششوں سے حاصل کر سکتا ہے۔ خدا کے ساتھ تعلق میں انسان یہ سیکھتا ہے کہ اصل سکون دنیاوی تعلقات کی بھول بھلیوں میں نہیں بلکہ خدا کی رضا اور اس کی محبت میں چھپا ہے۔

جو لوگ خدا کی محبت کی خاطر اپنے سکون کو قربان کرتے ہیں، وہ ایک اعلیٰ مقصد کے لیے اپنی ذات کو پیش کرتے ہیں۔ یہ قربانی انہیں نہ صرف ان کے رشتوں میں بہتر بناتی ہے بلکہ ان کی شخصیت کو بھی زیادہ مضبوط اور بامقصد بنا دیتی ہے۔ خدا وہ ذات ہے جو انسان کی قربانیوں کو بے حد نوازتا ہے، اور انسان کو نہ صرف اس کے اندرونی سکون بلکہ اس کے تعلقات کو بھی بہتر اور مضبوط بنانے کا ذریعہ فراہم کرتا ہے۔ اس لیے اندرونی سکون کو خدا کے لیے قربان کرنے کا فیصلہ نہ صرف روحانی بلکہ عملی طور پر بھی ایک بہتر اور برتر انتخاب ہے۔

دنیا کے مالک بنیں غلام نہیں

مال و دولت اور دنیاوی آسائشوں کی محبت انسان کی فطرت میں شامل ہے، لیکن یہ محبت اس وقت خطرناک ہو جاتی ہے جب یہ انسان کی زندگی اور روحانی سکون پر غالب آ جائے۔ ہمیں اپنی ملکیتوں کے غلام بننے سے بچنا چاہیے۔ وہ چیزیں جو ہم خوشی اور سہولت کے لیے حاصل کرتے ہیں، اگر وہی ہماری زندگی کو پیچیدہ اور مشکل بنا دیں، تو ان کا فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہے۔ قرآن و اہلبیتؑ کی تعلیمات میں بارہا اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ دنیاوی زندگی کی نعمتوں کو اعتدال اور حکمت کے ساتھ استعمال کیا جائے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "مال اور اولاد دنیاوی زندگی کی زینت ہیں، اور باقی رہنے والے نیک اعمال آپ کے رب کے نزدیک ثواب کے لحاظ سے بہتر ہیں اور امید کے اعتبار سے بھی اچھے ہیں۔" (الکہف:46)۔ اس آیت میں واضح کیا گیا ہے کہ دنیاوی نعمتیں، جیسے گھر، مال، اور اولاد، وقتی ہیں اور ان کا حقیقی مقصد ہمیں آخرت کی تیاری میں مدد فراہم کرنا ہے، نہ کہ ہمیں ان کے غلام بنانا۔

اہلبیتؑ کی تعلیمات بھی اس حقیقت پر روشنی ڈالتی ہیں۔ امام علیؑ فرماتے ہیں: "دنیا تمہارے لیے پیدا کی گئی ہے، تم دنیا کے لیے پیدا نہیں کیے گئے۔" اس قول کا مطلب یہ ہے کہ

دنیاوی چیزیں انسان کی خدمت کے لیے ہیں، لیکن اگر انسان خود ان چیزوں کی خدمت میں لگ جائے تو یہ اس کی فطری مقصدیت کے خلاف ہے۔

ایک بڑا گھر، جسے ہم سکون اور سہولت کے لیے خریدتے ہیں، اگر وہی ہماری زندگی میں بوجھ بن جائے تو اس کی قدر و قیمت ختم ہو جاتی ہے۔ صفائی، دیکھ بھال، اور دیگر ذمہ داریاں نہ صرف وقت اور توانائی کو زائل کرتی ہیں بلکہ ہمیں اپنی اہم ترجیحات، جیسے عبادت، علم، اور انسانیت کی خدمت، سے بھی دور کر سکتی ہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: "جس کے پاس دنیا کا زیادہ سامان ہو گا، اس کا حساب بھی زیادہ ہو گا۔" یہ حدیث اس بات پر زور دیتی ہے کہ دنیاوی اشیاء کے حصول میں اعتدال ضروری ہے تاکہ ہم آخرت میں کامیاب ہو سکیں۔ انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ملکیتوں کو اپنے مقصد زندگی پر حاوی نہ ہونے دے۔ دنیاوی اشیاء کو ایک ذریعہ سمجھنا چاہیے، نہ کہ زندگی کا مقصد۔ امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں: "مال اور دنیاوی اشیاء کے بارے میں میانہ روی اختیار کرو، کیونکہ یہ تمہاری ضروریات پوری کرنے کے لیے ہیں، تمہاری زندگی کو پیچیدہ بنانے کے لیے نہیں۔" جب ہم اپنی ضروریات سے زیادہ چیزوں کی خواہش کرتے ہیں تو یہ خواہش ہمیں دنیاوی لذتوں میں جکڑ دیتی ہے اور ہماری روحانی ترقی کو روک دیتی ہے۔ اصل کامیابی اس میں ہے کہ ہم اپنی زندگی کو سادگی اور اعتدال کے ساتھ گزاریں۔ دنیاوی چیزوں کو اپنی زندگی پر حکومت کرنے کا موقع نہ دیں بلکہ انہیں اپنے کنٹرول میں رکھیں۔ یہ رویہ نہ صرف ہماری دنیاوی زندگی کو آسان بنائے گا بلکہ آخرت میں کامیابی کا ذریعہ بھی ہو گا۔

ذاتی و پیشہ ورانہ زندگی کے درمیان توازن

ہمیں زندگی کے دو اہم پہلوؤں ـــ ذاتی زندگی اور پیشہ ورانہ زندگی ـــ کے درمیان توازن کی اہمیت کو سمجھنا چاہیے۔ ہر انسان کی زندگی میں ذاتی تعلقات، خاندان، اور ذاتی سکون اہمیت رکھتے ہیں، جبکہ پیشہ ورانہ زندگی بھی کامیابی، مالی تحفظ، اور ذاتی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ تاہم، اگر ان دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنا ممکن نہ ہو اور ایک کا اثر دوسرے پر پڑنے لگے، تو یہ انسان کی مجموعی خوشی اور سکون کو متاثر کر سکتا ہے۔

پیشہ ورانہ زندگی میں کامیابی اور ترقی کے لیے محنت کرنا ضروری ہے، مگر یہ بھی ضروری ہے کہ اس محنت کی قیمت ہماری ذاتی زندگی اور رشتہ داریوں پر نہ پڑے۔ اگر ہم اپنے کام کو اتنا اہمیت دیں کہ ذاتی تعلقات، خاندان، یا ذاتی سکون پس منظر میں چلے جائیں، تو یہ ایک تباہ کن راستہ ثابت ہو سکتا ہے۔ ذاتی زندگی میں مشکلات، جیسے خاندان کے مسائل یا ذاتی تعلقات میں تناؤ، آپ کی پیشہ ورانہ کارکردگی کو متاثر کر سکتے ہیں، اور اس کے برعکس، پیشہ ورانہ دباؤ اور مشکلات آپ کی ذاتی زندگی میں مداخلت کر سکتی ہیں۔

جب ذاتی زندگی اور پیشہ ورانہ زندگی ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے لگتی ہیں، تو اس سے ذہنی دباؤ اور جسمانی تھکن میں اضافہ ہو سکتا ہے، جو کہ انسان کی مجموعی خوشحالی کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ پیشہ ورانہ کامیابیاں عارضی طور پر خوشی دے سکتی ہیں، لیکن اگر ذاتی زندگی میں سکون نہ ہو تو وہ خوشی مستقل نہیں رہتی۔ اسی طرح، اگر ذاتی زندگی میں تعلقات یا

مسائل کی وجہ سے ذہنی سکون میں کمی آجائے تو اس کا اثر کام پر بھی پڑ سکتا ہے، جس سے پیشہ ورانہ زندگی میں کارکردگی میں کمی آتی ہے۔

ہمیں یہ سیکھنا چاہیے کہ ذاتی اور پیشہ ورانہ زندگی کو ایک دوسرے سے جدا رکھنے کی کوشش کرنا نہ صرف ضروری ہے بلکہ ممکن ہے۔ جب ہم ان دونوں کے درمیان حدود متعین کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی قیمت پر کامیابی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے، تو ہم دونوں پہلوؤں میں بہتر توازن قائم کر سکتے ہیں۔ ذاتی زندگی میں خوشی اور سکون کے بغیر، پیشہ ورانہ کامیابی کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی، اور اسی طرح ذاتی سکون حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم کام کے دباؤ کو مناسب طریقے سے منظم کریں۔

زندگی میں توازن کا مطلب یہ نہیں کہ آپ ایک کو قربان کر دیں اور دوسرے کو اولیت دیں، بلکہ اس کا مطلب ہے کہ آپ دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھ کر کامیابی کی طرف بڑھیں اور اپنی ذاتی زندگی میں سکون پیدا کریں تاکہ پیشہ ورانہ زندگی میں بھی بہترین نتائج حاصل کر سکیں۔

عُمر اور عقل

عمر ہمیشہ انسان کی بلوغت یا سمجھداری کی پیمائش نہیں کر سکتی۔ عام طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے، ویسے ویسے انسان زیادہ سمجھدار اور دانشمند ہوتا جاتا ہے۔ لیکن عملی زندگی میں ہمیں اکثر ایسے افراد ملتے ہیں جو کم عمر ہونے کے باوجود نہایت بالغ نظری کا مظاہرہ کرتے ہیں، اور ایسے بھی جو بڑی عمر کے باوجود جذباتی یا غیر ذمہ دارانہ رویے اپناتے ہیں۔

میچیورٹی یا بلوغت عمر سے زیادہ انسان کے تجربات، تربیت، اور ان کے ردعمل پر منحصر ہوتی ہے۔ کسی شخص کی سمجھداری اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ وہ مسائل کو کس طرح حل کرتا ہے، دوسروں کے جذبات کا کس طرح احترام کرتا ہے، اور اپنی زندگی کے فیصلے کتنی ذمہ داری سے لیتا ہے۔ یہ خوبیاں عمر کے ساتھ خود بخود پیدا نہیں ہوتیں بلکہ انسان کے شعوری عمل، تربیت، اور تجربات کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

کم عمر افراد بعض اوقات زندگی کے سخت تجربات کی وجہ سے زیادہ پختگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، وہ بچے جو کم عمری میں کسی مشکل یا ذمہ داری کا سامنا کرتے ہیں، وہ اکثر جذباتی اور ذہنی طور پر اپنے ہم عمر افراد سے زیادہ بالغ نظر آتے ہیں۔ اسی طرح، وہ افراد جنہیں بہتر تربیت اور مثالی رہنمائی حاصل ہوتی ہے، وہ جلدی سمجھداری حاصل کر

لیتے ہیں۔ دوسری جانب، کچھ افراد زندگی بھر مناسب تربیت یا خود احتسابی سے محروم رہتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی عمر کے ساتھ بلوغت نہیں آتی۔

کسی کی سمجھداری کا اندازہ صرف اس کی عمر دیکھ کر نہیں لگایا جا سکتا۔ ہمیں دوسروں کے ساتھ رویے، ان کے فیصلے، اور ان کی شخصیت کے دیگر پہلوؤں کو دیکھ کر ان کی پختگی کا اندازہ لگانا چاہیے۔ عمر ایک عدد ہے، لیکن بلوغت ایک کیفیت ہے جو شعور، تجربے، اور خود آگاہی سے پروان چڑھتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم عمر کی بنیاد پر کسی کی قابلیت یا بلوغت کو نہ جانچیں، بلکہ ان کی شخصیت اور عمل کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

کبھی نفرت، کبھی محبت

ہمیشہ کوئی نہ کوئی ایسا ہو گا جو آپ سے بے شروط محبت کرے گا۔ چاہے آپ کوئی بھی ہوں، ہمیشہ کوئی نہ کوئی ایسا بھی ہو گا جو آپ سے نفرت کرے گا۔

زندگی میں ہر شخص کو محبت اور نفرت دونوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور یہ حقیقت انسانی فطرت اور سماجی تعلقات کا لازمی حصہ ہے۔ یہ دنیا مختلف خیالات، رجحانات، اور ترجیحات کے حامل لوگوں سے بھری ہوئی ہے، اور ہر شخص اپنے ذاتی تجربات، نظریات، اور سوچ کے دائرے میں آپ کو دیکھتا اور پرکھتا ہے۔

محبت کی حقیقت یہ ہے کہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی ایسا ہو گا جو آپ کو آپ کی خوبیوں اور خامیوں سمیت قبول کرے گا اور آپ سے محبت کرے گا۔ یہ محبت والدین کی بے لوث محبت ہو سکتی ہے، دوستوں کی خلوص بھری چاہت، یا کسی اور رشتے میں موجود ہمدردی اور اپنائیت۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو آپ کی ذات کے لیے اپنی قدر و قیمت کا احساس دلاتے ہیں اور مشکل وقت میں آپ کے لیے سہارا بنتے ہیں۔ ان کا وجود ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ زندگی میں محبت اور اپنائیت کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔

دوسری طرف، دنیا میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو آپ سے نفرت کریں گے، چاہے آپ کتنے ہی نیک اور اچھے کیوں نہ ہوں۔ یہ نفرت اکثر حسد، عدم اتفاق، یا کسی ذاتی تجربے کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ بعض اوقات آپ کے اچھے اعمال اور کامیابیاں بھی دوسروں کے لیے

حسد یا مخالفت کا سبب بن سکتی ہیں۔ یہ حقیقت ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ ہر ایک کی رائے کو اپنی زندگی پر اثر انداز ہونے دینا عقلمندی نہیں ہے۔

زندگی میں ہمیں ان لوگوں کی قدر کرنی چاہیے جو ہم سے محبت کرتے ہیں اور ہمیں اپنی ذات پر اعتماد دلانے والے لمحات فراہم کرتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی، ہمیں ان لوگوں کی نفرت یا مخالفت کو اپنی کامیابی یا سکون کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننے دینا چاہیے۔ اپنی توانائی کو مثبت تعلقات پر مرکوز رکھنا اور منفی رائے کو نظر انداز کرنا ہی وہ راستہ ہے جو ہمیں پرسکون اور کامیاب زندگی کی طرف لے جاسکتا ہے۔

محبت اور نفرت دونوں وقتی تجربے ہوسکتے ہیں، لیکن آپ کی خودی اور اندرونی سکون ہی اصل دولت ہے۔ اگر آپ اپنی ذات کے ساتھ مخلص رہیں، تو دنیا کی محبت اور نفرت دونوں آپ کی زندگی کو متوازن اور بامقصد بنانے کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔

کتابیں جنت ہیں

کتابیں ایک ایسا خزانہ ہیں جو انسان کو نئے خیالات، علم، اور حقیقتوں سے آشنا کرتی ہیں۔ یہ ایک دریا کی طرح ہیں جس میں غوطہ لگا کر انسان اپنی فکری اور روحانی ترقی کے سفر پر روانہ ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید میں علم کی اہمیت پر بار بار زور دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" :اللہ بلند و برتر ہے، جو علم میں اضافے کے لیے انسانوں کو کتابوں سے ہدایت دیتا ہے۔ "(قرآنی آیت کا مفہوم) یہ آیت ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ علم کا حصول انسان کے لیے اللہ کی طرف سے ایک عظیم تحفہ ہے اور یہ انسان کی تقدیر کو بدلنے کی طاقت رکھتا ہے۔

اہلبیتؑ کی تعلیمات بھی علم اور کتابوں کی اہمیت پر روشنی ڈالتی ہیں۔ امام علیؑ نے فرمایا" :علم دولت سے بہتر ہے، کیونکہ علم آپ کا محافظ بنتا ہے، جبکہ دولت آپ کو ترک کر دیتی ہے۔" یہ قول اس بات کو اجاگر کرتا ہے کہ علم انسان کی زندگی میں سب سے قیمتی سرمایہ ہے جو اسے ہر وقت اور ہر حالت میں فائدہ پہنچاتا ہے۔ کتابوں کا مطالعہ انسان کو فکری سطح پر مزید بلند کرتا ہے اور اسے نئی دنیاوں کا سفر کراتا ہے۔

کتابیں ایک انوکھے سفر کی طرح ہیں جہاں آپ جتنی زیادہ کتابوں میں غوطہ لگائیں گے، اتنی ہی زیادہ معلومات اور تجربات کا خزانہ آپ کے ہاتھ آئے گا۔ یہ آپ کی شخصیت کو نکھارتی ہیں اور آپ کو علم و حکمت سے روشناس کراتی ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالی نے فرمایا" :کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں؟"(الزمر:9) یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ علم کا حاصل کرنا انسان کی فلاح اور ترقی کے لیے ضروری ہے۔

کتابوں کے مطالعہ سے انسان نہ صرف اپنے علم میں اضافہ کرتا ہے بلکہ اس کا فکری افق بھی وسیع ہوتا ہے۔ انسان کی زندگی میں یہ "چاکلیٹ کے دریا" کی طرح ہے جس میں غوطہ لگانے سے ایک نیا ذائقہ، نئی خوشبو، اور نئے رنگ سامنے آتے ہیں۔ جیسے چاکلیٹ کا ذائقہ زبان پر گہرے اثرات چھوڑتا ہے، ویسے ہی کتابوں میں غوطہ لگانے سے آپ کے ذہن پر بھی گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں جو آپ کو بہتر انسان بناتے ہیں۔

اہلبیتؑ کا بھی یہی پیغام تھا کہ علم انسان کی شناخت ہے اور یہ اس کی زندگی کا سب سے بہترین سرمایہ ہے۔ امام محمد باقرؑ نے فرمایا" :علم دولت سے بہتر ہے، کیونکہ علم آپ کا دفاع کرتا ہے اور دولت آپ سے دور ہو جاتی ہے، لیکن علم ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتا ہے۔ "یہ ہمیں بتاتا ہے کہ علم کی جستجو ایک ایسا عمل ہے جو ہمیں ہمیشہ ترقی کی راہوں پر گامزن کرتا ہے۔ کتابوں کا مطالعہ ہمیں نہ صرف دنیوی فوائد فراہم کرتا ہے بلکہ یہ ہماری روحانی اور اخلاقی ترقی میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

کتابوں میں غوطہ لگانا، ایک مہم کی طرح ہے جس میں آپ جتنا گہرائی میں جائیں گے، اتنی ہی مزید گہرائی اور معانی کا پتا چلتا ہے۔ یہ انسان کی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کو نکھارنے کا بہترین ذریعہ ہے اور یہی وہ راستہ ہے جو انسان کو ایک کامیاب اور باشعور زندگی کی طرف لے جاتا ہے۔ کتابوں کا مطالعہ کرنے سے انسان نئے نئے تجربات سے آشنا ہوتا ہے اور اس کا ذہن کھلتا ہے، جیسے شربتوں کے دریا میں غوطہ لگانے سے نئے ذائقوں کا پتا چلتا ہے، ویسے ہی کتابوں کا مطالعہ انسان کو نئی دنیاؤں سے آشنا کرتا ہے۔

مال و دولت کی منصوبہ بندی

مال اور دولت زندگی کا ایک اہم حصہ ہے، لیکن یہ اس وقت فائدہ مند ہوتی ہے جب اسے صحیح طریقے سے سمجھا جائے۔ مالی معاملات میں منصوبہ بندی نہ کی جائے تو دولت ہاتھ سے پھسل جاتی ہے، اور انسان پچھتاوے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مالی منصوبہ بندی نہ صرف دنیاوی زندگی کے لیے اہم ہے بلکہ آخرت کی تیاری کا بھی ایک ذریعہ ہے، جیسا کہ قرآن و اہلبیتؑ کی تعلیمات ہمیں مالی معاملات میں توازن اور حکمت اختیار کرنے کی تلقین کرتی ہیں۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اور جو کچھ اللہ نے تمہیں دیا ہے، اس سے آخرت کا گھر طلب کرو اور دنیا سے اپنا حصہ بھی نہ بھولو، اور احسان کرو جیسا کہ اللہ نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے۔" (القصص: 77)۔ یہ آیت ہمیں مال و دولت کے صحیح استعمال کی رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ دولت صرف دنیاوی آسائشوں کے لیے نہیں بلکہ آخرت کی بہتری کے لیے بھی استعمال ہونی چاہیے، اور اس کا انتظام ایک متوازن اور حکیمانہ انداز میں ہونا چاہیے۔

اہلبیتؑ کی تعلیمات بھی ہمیں مالی معاملات میں حکمت اختیار کرنے کی تاکید کرتی ہیں۔ امام علیؑ فرماتے ہیں: "مال ایک بہترین مددگار ہے اگر اسے عقل مندی سے حاصل کیا جائے اور اسے حق کے راستے میں خرچ کیا جائے۔" یہ قول اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مال نہ

تو بذاتِ خود برا ہے اور نہ ہی اچھا؛ بلکہ اس کا صحیح استعمال اور انتظام انسان کی نیت اور عمل پر منحصر ہے۔

زندگی میں مالی منصوبہ بندی کا مقصد صرف دولت جمع کرنا نہیں بلکہ اس کا ایسا استعمال ہے جو دنیا و آخرت دونوں میں فائدہ مند ہو۔ اگر انسان صرف موجودہ وقت کے لطف و لذت پر توجہ دے اور مستقبل کی فکر نہ کرے، تو وہ اپنی ضروریات کے وقت مشکلات کا شکار ہو سکتا ہے۔ مال کا غیر منصوبہ بند استعمال نہ صرف انسان کو مالی پریشانی میں مبتلا کرتا ہے بلکہ اس کے روحانی اثرات بھی مرتب ہو سکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مال کی محبت انسان کے دل کو سخت کر دیتی ہے۔" اس لیے مالی معاملات میں منصوبہ بندی کے ساتھ ساتھ اعتدال اور روحانی پہلو کو بھی مد نظر رکھنا ضروری ہے۔

مالی منصوبہ بندی کا ایک اہم جزو صدقہ، خیرات، اور محتاجوں کی مدد کرنا ہے، جیسا کہ قرآن میں حکم ہے: "اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔" (البقرہ:43)۔ یہ عمل نہ صرف مالی معاملات میں برکت لاتا ہے بلکہ آخرت میں بھی کامیابی کا ذریعہ بنتا ہے۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: "صدقہ دینے سے مال میں کمی نہیں ہوتی بلکہ اس میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ مصیبتوں کو دور کرتا ہے۔"

مالی معاملات میں حکمت اور منصوبہ بندی صرف مادی دنیا میں سکون و استحکام لانے کے لیے نہیں بلکہ یہ انسان کے روحانی سکون اور اللہ کے قریب ہونے کا ذریعہ بھی ہے۔ لہٰذا، ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے مالی معاملات میں دانشمندی اختیار کریں، موجودہ زندگی کی ضروریات کے

ساتھ ساتھ مستقبل کی تیاری اور آخرت کے لیے بھی مال کو استعمال کریں۔ یہی راستہ نہ صرف ہمیں دنیاوی مشکلات سے بچائے گا بلکہ آخرت میں کامیابی کی طرف بھی لے جائے گا۔

مسئلہ سے پہلے کاروائی

مسئلوں کا زندگی میں آنے کا انتظار نہ کریں پہلے سے اس پر کارروائی کریں، کیونکہ آپ بہت کچھ کرسکتے ہیں تاکہ مسئلہ آپ کی زندگی میں آنے سے پہلے ہی روک لیا جائے۔

یہ اصول انسانی زندگی کے ہر پہلو پر لاگو ہوتا ہے: پیش بندی اور احتیاط کی ضرورت کو سمجھنا ضروری ہے۔ اکثر انسان تب تک کسی مسئلے کی اہمیت کو نہیں سمجھتا جب تک وہ اس کے سامنے آکر کھڑا نہ ہو جائے، لیکن اس وقت تک نقصان ہو چکا ہوتا ہے، اور حالات کو سنبھالنا زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے دانشمند افراد ہمیشہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کسی بھی مسئلے کے پیدا ہونے سے پہلے اس کا سدباب کیا جائے۔

زندگی میں اکثر مسائل پیشگی علامات دیتے ہیں، لیکن ہم اپنی مصروفیات یا لاپرواہی کی وجہ سے ان پر توجہ نہیں دیتے۔ مثال کے طور پر، اگر کوئی شخص اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتا، غیر متوازن غذا کھاتا ہے، اور ورزش سے اجتناب کرتا ہے، تو وہ خود کو بیماریوں کے خطرے میں ڈال رہا ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ اپنی صحت پر پہلے ہی دھیان دے، تو بہت سی بیماریوں سے بچ سکتا ہے۔ اسی طرح مالی معاملات میں اگر خرچ اور آمدنی کے توازن کو نظر انداز کیا جائے، تو قرض اور مالی بحران کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ تاہم، دانشمندانہ منصوبہ بندی کے ذریعے ان مسائل کو پیدا ہونے سے پہلے روکا جا سکتا ہے۔

اسی اصول کا اطلاق اخلاقی اور روحانی زندگی پر بھی ہوتا ہے۔ اگر کوئی انسان اپنی روزمرہ کی زندگی میں جھوٹ، حسد، یا دوسروں کے حقوق کو نظر انداز کرنے کی عادت پیدا کرلے، تو یہ رویے آہستہ آہستہ بڑے مسائل کا سبب بن سکتے ہیں، مثلاً رشتوں کا ٹوٹنا یا سماجی بے اعتمادی۔ لیکن اگر وہ اپنے اعمال اور نیت کا جائزہ لیتا رہے اور اپنی اصلاح کی کوشش کرے، تو ان مسائل سے بچا جاسکتا ہے۔

یہ اصول دراصل ہمیں ایک فعال رویہ اپنانے کی ترغیب دیتا ہے۔ یہ کہتا ہے کہ زندگی کے مسائل کا انتظار کرنے کی بجائے، ہمیں ان کے ممکنہ اسباب کو سمجھ کر پہلے سے ہی ایسے اقدامات کرنے چاہئیں جو انہیں روک سکیں۔ یہ رویہ نہ صرف ہمیں مشکلات سے بچاتا ہے بلکہ ہمیں پرسکون اور متوازن زندگی گزارنے میں بھی مدد دیتا ہے۔ زندگی میں پیش بینی اور حکمت عملی کی اہمیت کو سمجھنا اور اسے اپنانا ہی کامیابی کا راز ہے۔

مشکلات کے ذریعے کامیابی تک کا سفر

یہ جملہ زندگی کے حقیقی تجربات اور چیلنجز کو ایک سادہ مگر گہری حقیقت کے طور پر بیان کرتا ہے کہ اگر آپ زندگی میں صرف ان دنوں یا حالات میں آگے بڑھنے کا ارادہ رکھتے ہیں جب سب کچھ اچھا ہو، سب کچھ آسان ہو، اور دنیا آپ کے مطابق چل رہی ہو، تو آپ کبھی بھی اپنی منزل تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ زندگی کا حقیقی سفر ان تمام مشکلات، رکاوٹوں، اور چیلنجز سے گزر کر ہی مکمل ہوتا ہے جو اس کے راستے میں آتی ہیں۔ صرف خوشی اور سکون کے لمحے زندگی کا حصہ نہیں ہیں، بلکہ تکالیف اور مشکلات بھی ہمیں زندگی کی حقیقت اور اس کی مکمل خوبصورتی سکھاتی ہیں۔

ہر کامیاب شخص نے اپنے راستے میں مشکلات کا سامنا کیا ہے، اور یہی مشکلات انہیں مزید مضبوط بناتی ہیں۔ اگر انسان ہر وقت صرف آسانی کے پیچھے بھاگے اور مشکلات سے بچنا چاہے، تو وہ نہ صرف خود کو محدود کرے گا بلکہ اپنی زندگی کے مقصد سے بھی دور ہو جائے گا۔ مشکلات اور رکاوٹیں وہ مواقع ہیں جو انسان کو سیکھنے، بڑھنے، اور اپنے اندر کی طاقت کو پہچاننے کا موقع دیتی ہیں۔

زندگی میں اس بات کا یقین کرنا کہ کامیابی صرف خوشگوار لمحوں میں ملتی ہے، ایک محدود سوچ ہے۔ حقیقت میں، ہم تب ہی اپنی منزل تک پہنچ سکتے ہیں جب ہم مشکلات کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتے ہیں اور انہیں اپنی طاقت میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر

گزرنے والا دن، چاہے وہ خوشی کا ہو یا غم کا، ہمیں کسی نہ کسی سبق سے نوازتا ہے اور ہمیں اپنے مقصد کی طرف مزید قریب لے جاتا ہے۔

یہ جملہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہمیں اپنے راستے میں آنے والی ہر مشکل کو ایک موقع کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ ہمیں اپنے عزم کو مضبوط کرنا ہوگا اور سمجھنا ہوگا کہ کامیابی کا راستہ کبھی بھی سیدھا اور ہموار نہیں ہوتا۔ اس کے بجائے، یہ ایک ایسا سفر ہے جس میں ہر قدم میں سیکھنا، استقامت دکھانا، اور مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اگر ہم صرف ان لمحات کا انتظار کرتے ہیں جب سب کچھ صحیح ہو، تو ہم کبھی بھی اپنی منزل تک نہیں پہنچ پائیں گے۔

اگر ہم زندگی میں صرف ان لمحوں کو اہمیت دیں جب سب کچھ اچھا ہو، تو ہم اپنی ذاتی ترقی اور کامیابی کے سفر کو محدود کر دیتے ہیں۔ زندگی کی حقیقی خوبصورتی انہی لمحوں میں چھپی ہوتی ہے جب ہم مشکلات کا سامنا کرتے ہیں، ناکامیوں سے سیکھتے ہیں، اور پھر دوبارہ اٹھ کر اپنے مقصد کی طرف بڑھتے ہیں۔ یہ مشکلات نہ صرف ہماری استقامت کو آزماتی ہیں بلکہ ہماری شخصیت کو بھی نکھارتی ہیں اور ہمیں دنیا کے بارے میں ایک گہری بصیرت فراہم کرتی ہیں۔ اگر ہم ان مشکلات سے بچنے کی کوشش کریں تو ہم دراصل اپنی سچائی سے کترانے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں اور یہ ہمیں ایک سطحی زندگی کی طرف لے جاتا ہے۔

ہر کامیابی، چاہے وہ چھوٹی ہو یا بڑی، ایک جدوجہد کی کہانی ہے۔ ان تمام کوششوں میں جو ہمیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہی ہمیں مضبوط اور بہتر انسان بناتی ہیں۔ زندگی کا مقصد صرف خوشی کے لمحوں کا جمع کرنا نہیں ہے، بلکہ یہ ایک سفر ہے جس میں ہمیں ان تجربات کا سامنا کرنا ہوتا ہے جو ہمیں زندگی کی اصل حقیقت سے روبرو کراتے ہیں۔ اگر ہم ہر وقت

آسانیوں کی تلاش میں رہیں گے تو ہم کبھی ان چیلنجز کا مقابلہ نہیں کر پائیں گے جو ہماری حقیقی ترقی کا حصہ ہیں۔

اس بات کا شعور رکھتے ہوئے ہمیں اپنی زندگی کے راستے کو محض خوشی کے لمحوں سے نہیں ناپنا چاہیے۔ ہمیں اپنی کامیابی کی پیمائش ان لمحوں سے کرنی چاہیے جب ہم نے اپنی مشکلات کا مقابلہ کیا، جب ہم نے مشکلات میں بھی حوصلہ نہیں ہارا، اور جب ہم نے اپنے مقصد کی طرف قدم بڑھایا چاہے حالات کتنے ہی مشکل کیوں نہ ہوں۔ یہ وہ لمحات ہیں جو ہماری حقیقت کی تشکیل کرتے ہیں اور ہماری اصل کامیابی کا پتہ دیتے ہیں۔ جب ہم ان لمحوں کا سامنا کرتے ہیں، تو ہم دراصل اپنی منزل کے قریب پہنچ رہے ہوتے ہیں۔

زندگی کا یہ سفر اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ ہم مشکلات کا حصہ بنیں، انہیں جھیلیں، اور ان سے سیکھ کر مزید بہتر انسان بنیں۔ یہ سب کچھ ہمیں ایک نئے زاویے سے دنیا کو دیکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے اور ہمیں اپنی حقیقت کی تلاش میں مدد دیتا ہے۔ جب ہم ان چیلنجز کو قبول کرتے ہیں اور ان سے لڑتے ہیں، تو دراصل ہم اپنی اصل طاقت کو پہچاننے لگتے ہیں اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب ہم اپنی منزل کو حقیقت میں حاصل کرتے ہیں۔

ناکامی کامیابی کا زینہ ہے

ناکامیاں زندگی کے تجربات کا وہ پہلو ہیں جو انسان کو سکھاتی ہیں کہ کس طرح آگے بڑھنا ہے اور اپنی منزل تک پہنچنا ہے۔ قرآن مجید ہمیں یہ درس دیتا ہے کہ ہر آزمائش، ناکامی، یا مشکل ایک امتحان ہے جس کا مقصد انسان کو مضبوط بنانا اور اس کی روحانی و عملی ترقی کو پروان چڑھانا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "یقیناً تمہیں خوف، بھوک، مال، جانوں اور پھلوں کے نقصان سے آزمایا جائے گا، اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دو۔" (البقرہ:155)۔ یہ آیت واضح کرتی ہے کہ ناکامیاں اور مشکلات انسان کو مایوسی میں مبتلا کرنے کے لیے نہیں بلکہ اسے صبر اور استقامت کا سبق دینے کے لیے آتی ہیں۔

اہلبیتؑ کی تعلیمات بھی ہمیں ناکامیوں کو زندگی کے تجربات کے طور پر دیکھنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ امام علیؑ فرماتے ہیں: "جو شخص اپنی ناکامیوں سے سبق نہیں لیتا، وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔" یہ قول اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ ناکامیاں صرف ایک موقع ہیں جن سے انسان کچھ نیا سیکھ سکتا ہے اور اپنی زندگی کو بہتر بنا سکتا ہے۔ ناکامی کوئی انجام نہیں بلکہ ایک نیا آغاز ہے، اور ہر ناکامی میں ایک سبق پوشیدہ ہوتا ہے جو انسان کی کامیابی کے راستے کو روشن کرتا ہے۔

زندگی ایک تجربہ گاہ کی مانند ہے، اور ہم سب اس میں "سائنسدان" کی طرح ہیں۔ ناکامیاں ہمیں یہ سکھاتی ہیں کہ کون سا راستہ بہتر ہے اور کون سا نہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: "مومن ایک سوراخ سے دوبارہ نہیں ڈسا جاتا۔" یہ حدیث اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ہمیں اپنی غلطیوں سے سیکھنا چاہیے اور انہیں دوبارہ دہرانے سے بچنا چاہیے۔ ہر ناکامی میں ایک موقع ہے کہ ہم اپنی سوچ، عمل، اور رویے کو بہتر کریں اور اپنی زندگی کو نئی سمت میں لے جائیں۔

ناکامیوں کو مواقع میں بدلنے کا مطلب ہے کہ ہم اپنی غلطیوں کو ایک مثبت نقطۂ نظر سے دیکھیں اور ان سے سبق حاصل کریں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل اور شعور دیا ہے تاکہ وہ اپنی ناکامیوں کا تجزیہ کر سکے اور ان سے سیکھ کر آگے بڑھ سکے۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: "جو شخص اپنے اعمال کا محاسبہ کرتا ہے، وہ ہمیشہ کامیاب رہتا ہے۔" یہ قول ہمیں دعوت دیتا ہے کہ ہم اپنی زندگی کے ہر تجربے کا گہرائی سے جائزہ لیں اور ان سے وہ سبق حاصل کریں جو ہمیں کامیابی کی طرف لے جا سکے۔

ناکامیوں کو مواقع کے طور پر دیکھنا ہمیں مایوسی سے بچاتا ہے اور ہمیں ایک مثبت زندگی گزارنے کی ترغیب دیتا ہے۔ زندگی کا ہر لمحہ ہمیں کچھ نہ کچھ سکھانے کے لیے آتا ہے، اور اگر ہم ہر ناکامی کو ایک سبق کے طور پر قبول کریں تو یہ ہمیں زیادہ مضبوط اور باشعور انسان بناتی ہے۔ قرآن و اہلبیتؑ کی تعلیمات ہمیں اس بات کی یاد دہانی کراتی ہیں کہ ناکامی دراصل ایک موقع ہے جس سے ہم اپنی زندگی کو بہتر بنا سکتے ہیں اور اللہ کی رحمت سے فائدہ اٹھا سکتے

ہیں۔ ہر غلطی، ہر ناکامی، ایک نئی دریافت اور ایک نیا سبق ہے جو ہمیں مزید قریب لے جاتا ہے اس منزل کے جس کا خواب ہم دیکھتے ہیں۔

نتیجہ کے حصول کیلئے صبر

"پروسس پر اعتماد کرنا" صرف یہ نہیں ہے کہ آپ یقین رکھیں کہ سب کچھ بہتر ہو جائے گا اور اس کے ہونے کا انتظار کریں، بلکہ اس میں یہ بھی شامل ہے کہ آپ خود اس عمل کا حصہ بنیں، اس میں سرگرم رہیں، اور اپنے مقصد کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے لیے اپنی محنت اور جدوجہد کو جاری رکھیں۔ کائنات کے نظام کی تخلیق کی مثال ہمیں اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ملتی ہے، جس نے کائنات کو چھ دنوں میں ترتیب اور حکمت کے ساتھ پیدا کیا۔ اللہ کی یہ حکمت ہمیں سکھاتی ہے کہ کوئی بھی بڑی تبدیلی یا مقصد فوری طور پر حاصل نہیں ہوتا، بلکہ ہر چیز کا ایک مناسب وقت، مرحلہ اور طریقہ کار ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ حقیقت میں تبدیل ہوتی ہے۔

اللہ کی تخلیق کا یہ عمل اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ہمارے زندگی کے مقاصد بھی ایک "پروسس" کے تحت ہی پورے ہوتے ہیں۔ اگر ہم بھی اللہ کی طرح اس عمل میں نظم و ضبط، صبر اور مستقل مزاجی دکھائیں، تو ہمیں اپنی منزل تک پہنچنے میں کامیابی ملے گی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم صرف انتظار کریں اور سوچیں کہ ہر چیز خود بخود ٹھیک ہو جائے گی، بلکہ ہمیں اپنے عمل اور فیصلوں کے ذریعے اس عمل کو تیز کرنا اور اسے حقیقت بنانا ہو گا۔

یقیناً، کائنات کی تخلیق کا عمل صرف اللہ کے ہاتھ میں تھا، مگر انسان کو اس زمین پر اس عمل کا حصہ بنایا گیا ہے۔ یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ اگر ہم محنت، ایمان، اور عمل کی سمت میں پیش قدمی

کریں، تو اللہ کی مدد اور حکمت ہمیں اپنے مقصد تک پہنچانے میں رہنمائی فراہم کرتی ہے۔
اگر ہم صرف انتظار کرتے رہیں اور سوچیں کہ ہمارے مقاصد محض کسی معجزے کی طرح پورے ہو جائیں گے، تو ہم اس عمل کا حصہ نہیں بنتے۔ بلکہ ہمیں اپنی صلاحیتوں اور وسائل کا صحیح استعمال کرتے ہوئے اپنے عمل کو جاری رکھنا ہے، تب جا کر ہم اللہ کی مدد کے ساتھ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔
یہ سچ ہے کہ اللہ پر ایمان رکھنا اور اس کے بعد عمل کرنا ضروری ہے، کیونکہ دونوں کا تعلق ایک دوسرے سے ہے۔ ایک طرف سے ہمارا ایمان، ہمارے حوصلے اور صبر کو بڑھاتا ہے، تو دوسری طرف ہمارا عمل اور جدوجہد ہمارے مقصد کو حقیقت بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔
اللہ کی تخلیق کے عمل میں ایک گہرائی اور حکمت پوشیدہ ہے جو ہمیں اپنی زندگی میں بھی اپنانی چاہیے۔ کائنات کے ہر گوشے میں اللہ کی منظم حکمت نظر آتی ہے، اور اس کی تخلیق کے ہر مرحلے کا ایک مقصد ہے۔ اسی طرح، ہماری زندگی میں بھی جو بھی مقصد یا خواب ہم رکھتے ہیں، ان کی تکمیل کے لیے ایک مخصوص طریقہ کار اور پروسس ہوتا ہے۔ اللہ کی جانب سے ہم پر جو ہدایات دی گئی ہیں، وہ ہمیں سکھاتی ہیں کہ ہر چیز کا ایک وقت اور ایک طریقہ ہوتا ہے۔ جیسے اللہ نے کائنات کو چھ دنوں میں مکمل کیا، ویسے ہی ہمارے مقاصد بھی ایک دن میں حاصل نہیں ہوتے بلکہ ہمیں ان کی تکمیل کے لیے صبر، محنت، اور مستقل مزاجی سے کام کرنا ہوتا ہے۔
اگر ہم محض انتظار کرتے رہیں کہ ہمارا مقصد خود بخود پورا ہو جائے گا، تو ہم اس عمل سے گزرنے کے اصل مقصد کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل اور عمل کی

صلاحیت دی ہے تاکہ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے کوشش کرے۔ ایمان اور عمل کا امتزاج ہمیں ایک سمت دیتا ہے جس میں ہم آگے بڑھ کر اپنی تقدیر کو خود لکھ سکتے ہیں۔ یہی بات ہمیں اس بات کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ اللہ کی طرف سے دی گئی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ہم اپنے مقصد کو حقیقت میں بدل سکتے ہیں۔

پروسس پر اعتماد کرنا صرف اس بات کا یقین رکھنا نہیں ہے کہ ہمارے مقاصد کسی معجزے سے پورے ہو جائیں گے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس عمل میں شامل ہو کر اپنی تمام تر کوششیں لگائیں اور اللہ کی رضا کے مطابق عمل کریں۔ ہمارا عمل، ہماری محنت اور ہمارا صبر ہی ہمارے مقصد تک پہنچنے کی کنجی ہیں۔ اللہ کی حکمت سے یہ سبق ملتا ہے کہ اگر ہم اس عمل میں ثابت قدم رہیں، تو اللہ اپنی مدد سے ہمیں کامیابی کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔

زندگی میں کبھی کبھار مشکلات اور چیلنجز سامنے آتے ہیں، لیکن ان مشکلات کا سامنا بھی ایک ضروری پروسس کا حصہ ہے۔ ہر چیلنج ہمیں کچھ نہ کچھ سکھاتا ہے، اور یہی سبق ہمیں مزید مضبوط بناتا ہے تاکہ ہم اپنے مقصد کی طرف آگے بڑھ سکیں۔ اللہ پر ایمان رکھتے ہوئے ہم ہر مشکل کو اپنے مقصد کے قریب جانے کا ایک موقع سمجھ سکتے ہیں، اور اس کے ساتھ اپنے عمل کو مضبوط کر سکتے ہیں۔ جب ہم اللہ کی رضا کی تلاش میں اپنا عمل جاری رکھتے ہیں، تو وہ ہمیں اپنی مدد سے کامیابی کی راہ دکھاتا ہے۔

نظم وضبط، کامیابی کا ایک اہم اصول

ضبط نفس اور نظم و ضبط انسان کی زندگی میں ایک اہم ستون کی حیثیت رکھتے ہیں، جو نہ صرف آج کی محنت کو ضروری بناتا ہے بلکہ کل کی کامیابی کی بنیاد بھی رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو انسان کو عارضی تکالیف اور مشکلات برداشت کرنے کی قوت فراہم کرتا ہے، تاکہ وہ اپنی لمبی مدت کی کامیابی اور سکون کی طرف بڑھ سکے۔ قرآن مجید اور اہل بیت (علیہم السلام) کی تعلیمات میں بھی نظم و ضبط کی بڑی اہمیت ہے، جہاں ہر کام میں توازن، استقامت، اور حوصلہ افزائی پر زور دیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالی نے کئی مقامات پر انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نظم وضبط کو اہمیت دی ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے، "اور اپنے نفسوں پر صبر کرو، تم جو کچھ عمل کرتے ہو اس کے لیے تمہیں انعام ملے گا" (الطور ۲۶:۲۴)۔ اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ صبر اور ضبط نفس کو اختیار کرنا انسان کی کامیابی کے لیے ضروری ہے، اور اسی ضبط نفس کی بدولت انسان آج کی مشکلات کا مقابلہ کر کے کل کی کامیاب زندگی کے لیے راستہ ہموار کرتا ہے۔

اہل بیت (علیہم السلام) کی تعلیمات میں بھی نظم و ضبط اور صبر کی بڑی اہمیت ہے۔ امام علی علیہ السلام نے فرمایا، "جو شخص خود پر قابو پاتا ہے وہ دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔" یہ بات بتاتی ہے کہ جو شخص اپنی خواہشات، جذبات اور فیصلوں پر کنٹرول رکھتا ہے، وہ اپنے اندر طاقت اور استقامت پیدا کرتا ہے جو زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کرنے میں

معاون ثابت ہوتی ہے۔ امام حسین علیہ السلام کی قربانی بھی نظم و ضبط اور خود پر قابو پانے کا بہترین نمونہ ہے، جس میں انہوں نے اپنی ذاتی خواہشات کو اللہ کے حکم کے مطابق قربان کر دیا۔ ان کی قربانی نے انسانیت کو یہ سکھایا کہ وقتی مشکلات اور تکالیف کو برداشت کرنا، بڑی کامیابی کی طرف رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

کامیاب لوگوں کے تجربات بھی اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ آج کی محنت اور سختی کل کی کامیابی کا دروازہ کھولتی ہے۔ دنیا کے کئی عظیم رہنماؤں اور کامیاب شخصیات نے اپنی زندگیوں میں بے شمار مشکلات کا سامنا کیا، لیکن ان سب کا راز ان کی محنت، نظم و ضبط اور مسلسل کوششوں میں تھا۔ ان شخصیات نے وقت کی قدر کی، اپنے اہداف کی طرف قدم بڑھایا اور مشکلات کو اپنی ترقی کا حصہ سمجھا۔ انہوں نے جانا کہ اگر وہ آج کی تکالیف سے بچنے کی کوشش کریں گے تو وہ کل کی بڑی کامیابی سے محروم رہیں گے۔

زندگی میں نظم و ضبط انسان کو ایک مثبت سمت میں لے جاتا ہے، جہاں وہ اپنے ذاتی اور پیشہ ورانہ اہداف کو حاصل کرنے کے لیے استقامت سے کام کرتا ہے۔ یہ آج کی محنت اور قربانی کا صلہ ہوتا ہے جو کل کی کامیابی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ قرآن اور اہل بیت کی تعلیمات ہمیں یہ سکھاتی ہیں کہ زندگی کی مشکلات کو دلیری سے جھیلنا، اپنی خواہشات اور جذبات پر قابو پانا، اور اللہ کی رضا کے لیے محنت کرنا انسان کو انعامات سے نوازتا ہے، جو نہ صرف دنیا میں بلکہ آخرت میں بھی کامیابی کا سبب بنتا ہے۔

اس لیے اگر ہم آج کی مشکلات اور محنت کو برداشت کریں گے، تو ہم کل ایک بہتر، کامیاب اور پُر سکون زندگی کا آغاز کر پائیں گے۔ جیسے کہ ایک کسان فصل کی کٹائی سے پہلے زمین میں بیج بو دیتا ہے اور سخت محنت کرتا ہے تاکہ وہ فصل حاصل کر سکے، اسی طرح ہمیں بھی

اپنی زندگی میں نظم وضبط کو اپنا کر آج کی محنت کرنی چاہیے تاکہ کل ہمیں اس کا میٹھا پھل مل سکے۔

اگر ہم نظم و ضبط کی اہمیت کو سمجھیں اور اسے اپنی روزمرہ زندگی میں اپنائیں، تو یہ ہمارے اندر ایک ایسی قوت پیدا کرتا ہے جو نہ صرف ہمیں آج کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے قابل بناتی ہے بلکہ ہمیں مستقبل کی کامیابی کی راہ بھی ہموار کرتی ہے۔ جب ہم اپنی خواہشات کو قابو میں رکھتے ہیں، اپنے فیصلوں میں حکمت اختیار کرتے ہیں اور ہر دن کو اپنی ترقی کی سمت میں استعمال کرتے ہیں، تو ہم اپنے اندر ایک مثبت تبدیلی لاتے ہیں جو ہمارے مستقبل کی بنیاد بن جاتی ہے۔ قرآن اور اہل بیت کی تعلیمات ہمیں اس بات کی ترغیب دیتی ہیں کہ ہم اپنی زندگی میں اللہ کی رضا کو مقدم رکھیں، کیونکہ یہی رضا ہمارے لیے حقیقی سکون اور کامیابی کا راستہ ہے۔

زندگی میں کامیابی کا حصول صرف بیرونی دنیا کی کامیابیوں پر منحصر نہیں ہوتا، بلکہ یہ ہماری داخلی تبدیلی پر بھی منحصر ہوتا ہے۔ نظم و ضبط وہ داخلی قوت ہے جو انسان کے اندر سے ابھرتی ہے اور اسے ہر لمحے میں اپنی فطری خواہشات اور جذبات پر قابو پانے کی طاقت فراہم کرتی ہے۔ اگر ہم اپنے اندر کی اس طاقت کو پہچان لیں اور اس سے فائدہ اٹھائیں، تو ہم نہ صرف اپنی زندگی کو بہتر بنا سکتے ہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی ایک مثبت نمونہ پیش کر سکتے ہیں۔

اہل بیت علیہم السلام کی زندگی ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ مشکلات اور تکالیف کا سامنا کرنا، انسان کی قوتِ ارادی کو مضبوط بناتا ہے اور اسے اپنی منزل کے قریب لے آتا ہے۔ امام علی علیہ السلام کی حکمت میں یہ پیغام مضمر ہے کہ انسان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی

خواہشات اور جذبات کو اپنی زندگی کی راہ میں رکاوٹ نہ بننے دے، بلکہ انہیں اس طرح سے کنٹرول کرے کہ وہ اس کی ترقی کی راہ ہموار کریں۔

اس بات کا شعور رکھتے ہوئے، ہمیں زندگی کے ہر مرحلے میں نظم و ضبط کی اہمیت کو سمجھنا چاہیے اور اپنی محنت کو اس طرح ترتیب دینا چاہیے کہ ہم آج کی مشکلات کو ایک موقع سمجھ کر ان کا مقابلہ کریں، کیونکہ یہی ہم کو کل کی کامیابی تک پہنچاتا ہے۔ اس کے علاوہ، ہم جب اپنی زندگی کے فیصلوں میں ان اصولوں کو اپناتے ہیں، تو ہم نہ صرف اپنے لیے بلکہ اپنے معاشرے کے لیے بھی ایک مثال قائم کرتے ہیں کہ کیسے مشکلات کے باوجود استقامت اور محنت کے ذریعے انسان کامیابی حاصل کرتا ہے۔ اس بات کا یقین رکھتے ہوئے کہ ہر مشکل کا مقابلہ کرنا ہی ہمارے لیے کامیابی کا راستہ ہے، ہم اپنی زندگی کو نہ صرف بہتر بنا سکتے ہیں بلکہ ایک اطمینان بخش اور کامیاب مستقبل بھی تعمیر کر سکتے ہیں۔

انسانی نفسیات میں امام کی فطری طلب

انسان کی فطرت اور اس کے حالات اسے ہمیشہ ایک خارجی سہارا تلاش کرنے پر آمادہ کرتے ہیں، ایک ایسی ہستی جو اس کی کمیوں کو پورا کرے اور اسے اعتماد اور یقین کی بنیاد فراہم کرے۔ یہ خارجی سہارا اس کی داخلی نفسیاتی ضرورت ہے جو اسے کسی برتر ہستی کی طرف مائل کرتی ہے۔ وہ ایسی ہستی چاہتا ہے جو اس کی تمام مشکلات کو حل کرے، اس کی روحانی اور مادی کمیوں کو پورا کرے، اور اس کی زندگی کو ایک مقصد اور سکون فراہم کرے۔ جب انسان کسی کو اپنا معبود یا امام تسلیم کرتا ہے، تو اس کے دل میں محبت، عقیدت، اور تعظیم کے تمام جذبات اس ہستی کے لیے مختص ہو جاتے ہیں۔ یہ جذبات اس کی فطرت میں موجود ہیں اور خدا نے ان کی تخلیق کی ہے تاکہ انسان خدا اور اس کے نمائندوں کی طرف مائل ہو۔

خدا نے انسان کی اس فطری ضرورت کا مداوا اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے کیا ہے۔ یہ نمائندے، جو ید اللہ، عین اللہ، اور وجہ اللہ کہلاتے ہیں، وہ ہستیاں ہیں جنہیں خدا نے انسانوں کی رہنمائی کے لیے منتخب کیا۔ ان ہستیوں کی تعلیمات اور کردار انسان کو خدا کے قریب لاتے ہیں اور اسے زندگی کے حقیقی مقصد سے روشناس کراتے ہیں۔ یہ نمائندے انسان کو اس کی روحانی اور اخلاقی بلندی تک پہنچانے کے لیے خدا کے پیغام کو واضح اور مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔

تاہم، ظاہر پرست انسان، جو اکثر ظاہری دنیا کے اثرات میں الجھ کر رہ جاتا ہے، خدا کے ان نمائندوں کو قبول نہیں کرتا کیونکہ خدا خود نظر نہیں آتا۔ ایسے لوگ عام طور پر ایسی نظر آنے والی ہستیوں کو اپنا رہنما یا پیشوا بنا لیتے ہیں جو دراصل اس مقام کے مستحق نہیں ہوتیں۔ یہ ہستیاں ذاتی پسند، سماجی روایات، یا دنیاوی معیاروں کے تحت سردار یا پیشوا بنائی جاتی ہیں۔ جب انسان کو کسی ایسی شخصیت کا سامنا نہ ہو جو اس کی توقعات پر پورا اترے، تو وہ ماضی کی مقدس شخصیات کے بت بنا کر ان کی پرستش شروع کر دیتا ہے۔ انبیاء اور خدا کے نمائندوں کو بھی اسی طرح مسترد کیا جاتا ہے کیونکہ وہ سماج کے طے شدہ معیاروں پر پورا نہیں اترتے۔ ان معیاروں میں عموماً دنیاوی دولت، سماجی مقام، یا دیگر ظاہری خصوصیات شامل ہوتی ہیں، جبکہ خدا کی طرف سے مقرر کردہ سرداری کی شرائط ان تمام معیاروں سے مختلف ہوتی ہیں۔ ان شرائط کو سمجھنا اور قبول کرنا منکرین کے لیے مشکل ہوتا ہے، اس لیے وہ انبیاء کی رہنمائی کو مسترد کر دیتے ہیں۔

ابلیس کا حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کرنا ایک گہری نفسیاتی حقیقت کی عکاسی کرتا ہے، جو غرور، حسد، اور برتری کے احساس سے جڑی ہوئی ہے۔ ابلیس نے اپنی تخلیق کو حضرت آدمؑ کی تخلیق سے بہتر قرار دیا اور اس بنیاد پر خدا کے حکم کو رد کر دیا۔ یہ رویہ نہ صرف خدا کی حکمت کو چیلنج کرتا ہے بلکہ اس میں ایک مخصوص نفسیاتی مزاحمت بھی ظاہر ہوتی ہے، جو بالاتر ہستی کی برتری اور سرداری کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے۔ یہی نفسیات منکرین انبیاء اور منکرین ولایت اہل بیتؑ میں بھی نظر آتی ہے، اور اس کا بنیادی جواز انسان کے اندر موجود غرور اور اپنے محدود فہم پر اصرار ہوتا ہے۔

منکرین انبیاء کی تاریخ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ انبیاء کو اکثر ان کے سماجی مقام، مادی حیثیت، یا ظاہری وجاہت کی بنیاد پر رد کیا گیا۔ وہ افراد جنہوں نے انبیاء کی رسالت کو مسترد کیا، عموماً ان کے اندر یہ احساس پایا جاتا تھا کہ انبیاء ان کے برابر یا کمتر ہیں اور ان کی سرداری کو قبول کرنا ان کے اپنے مقام اور مرتبے کے خلاف ہو گا۔ انبیاء کا پیغام توحید، عدل، اور مساوات پر مبنی ہوتا ہے، جو کہ غرور و تکبر سے لبریز شخصیات کے لیے ناقابل قبول ہوتا ہے۔ اسی طرح، منکرین ولایت اہل بیتؑ کے رویوں میں بھی یہی مزاحمت دیکھی جاتی ہے۔ اہل بیتؑ کی فضیلت، علم، اور کردار کی برتری واضح ہونے کے باوجود، ان کی ولایت کو تسلیم نہ کرنا ایک نفسیاتی جنگ کی علامت ہے جہاں ذاتی برتری، انا، اور دنیاوی مفادات غالب آ جاتے ہیں۔

یہ نفسیات دراصل ایک ہی مائنڈ سیٹ کی عکاسی کرتی ہے جو بالاتر ہستی کی سرداری کو اپنے غرور کی بنا پر مسترد کرتا ہے۔ جب کوئی فرد اپنی ذات، اپنی سوچ، اور اپنی حیثیت کو ہر چیز سے بالاتر سمجھنے لگے، تو وہ نہ صرف حق کو تسلیم کرنے سے قاصر رہتا ہے بلکہ اپنی نفسیاتی حالت کو حق کے خلاف ڈھال کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ ابلیس کا انکار بھی اسی مائنڈ سیٹ کا مظہر تھا، جہاں اس نے اپنی تخلیق کی بنیاد پر اپنی برتری کا دعویٰ کیا اور خدا کے حکم کو اپنی ذات کے خلاف سمجھا۔ یہی رویہ ان افراد میں بھی دیکھا جاتا ہے جو انبیاء اور اولیاء کو محض اس لیے مسترد کرتے ہیں کہ ان کی سرداری کو قبول کرنے سے ان کی اپنی انا مجروح ہوتی ہے۔

نفسیاتی تجزیہ یہ بتاتا ہے کہ ایسے رویے میں بنیادی عنصر "غرور" ہے، جو انسانی شخصیت کا ایک نہایت پیچیدہ پہلو ہے۔ غرور انسان کو حقیقت سے دور کر دیتا ہے اور اسے اپنی محدود

سوچ میں قید کر دیتا ہے۔ جب ایک فرد یہ ماننے سے انکار کرتا ہے کہ کوئی اس سے زیادہ برتر یا حق پر ہو سکتا ہے، تو وہ ایک دفاعی کیفیت میں آجاتا ہے جہاں ہر دلیل اور ہر حقیقت اس کے ذہن میں رد کر دی جاتی ہے۔ اس کے برعکس، عاجزی انسان کو حق کی جانب کھینچتی ہے اور اسے اپنی کمیوں کو تسلیم کرنے کا حوصلہ دیتی ہے۔

منکرین انبیاء اور اہل بیتؑ کے لیے، ان کے انکار کی ایک اور نفسیاتی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنی موجودہ حیثیت کو خطرے میں محسوس کرتے ہیں۔ انبیاء اور اہل بیتؑ کی تعلیمات عدل، برابری، اور اخلاقیات پر مبنی ہوتی ہیں، جو ان کے مفادات اور سماجی برتری کو چیلنج کرتی ہیں۔ ان تعلیمات کو قبول کرنا ان کے لیے اپنی طاقت، اثر، اور دنیاوی مقام کو ترک کرنے کے مترادف ہوتا ہے، اور یہ ایک ایسا فیصلہ ہوتا ہے جسے غرور کا شکار انسان قبول نہیں کر پاتا۔

لہٰذا، ابلیس سے لے کر منکرین انبیاء اور منکرین ولایت اہل بیتؑ تک، یہ نفسیاتی رویہ ایک ہی مائنڈ سیٹ کی پیداوار ہے۔ یہ مائنڈ سیٹ اس وقت وجود میں آتا ہے جب انسان اپنے آپ کو عقل و شعور اور حیثیت میں سب سے بالاتر سمجھنے لگتا ہے اور اپنی ذات کے غرور میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ حق اور حقیقت کو دیکھنے اور تسلیم کرنے کی صلاحیت کھو دیتا ہے۔ اس مائنڈ سیٹ کو شکست دینے کے لیے انسان کو عاجزی، انصاف پسندی، اور حقیقت کی جستجو کو اپنی زندگی کا محور بنانا ہو گا، ورنہ وہ بھی ابلیس کی طرح اپنی ذات کے خول میں قید ہو کر رہ جائے گا۔

اس مائنڈ سیٹ کا گہرائی سے تجزیہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم انسانی نفسیات، سماجی حرکیات، اور روحانی حقائق کو یکجا کر کے سمجھیں۔ یہ مائنڈ سیٹ دراصل انسان کی اس داخلی

کمزوری سے جنم لیتا ہے جو اپنی ذات کو مرکزیت دینے کے رجحان سے عبارت ہے۔ جب انسان اپنی شخصیت، اپنی عقل، یا اپنے نظریات کو مطلق سچائی سمجھنے لگتا ہے، تو اس کے اندر یہ رویہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی بالاتر حقیقت یا ہستی کی سرداری کو تسلیم نہ کرے۔ یہ انکار دراصل دو بنیادی عوامل پر مبنی ہوتا ہے: ایک، خود پسندی اور دوسرا، خوف۔

خود پسندی انسان کو یہ باور کراتی ہے کہ وہ اپنی حقیقت کا خود مالک ہے اور کسی بالاتر ہستی یا اصول کی طرف جھکنا اس کی ذاتی خود مختاری کے خلاف ہے۔ یہ رویہ ابلیس کی نفسیات میں بالکل واضح ہے، جہاں اس نے اپنی تخلیق کی بنیاد پر حضرت آدمؑ کی فضیلت کو مسترد کیا۔ اس کا ماننا تھا کہ وہ آگ سے پیدا ہوا ہے، جو مٹی سے افضل ہے، اور اس بنیاد پر اس نے خدا کے حکم کو رد کر دیا۔ یہی اصول منکرین انبیاء اور منکرین ولایت اہل بیتؑ پر بھی لاگو ہوتا ہے، جو اپنی سماجی حیثیت، علم، یا طاقت کے نشے میں کسی ایسی ہستی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں جو ان کے ظاہری معیار پر پورا نہ اترتی ہو۔

یہ مائنڈ سیٹ انسان کے اندر موجود خوف سے بھی جڑا ہوا ہے۔ یہ خوف اس بات کا ہے کہ بالاتر ہستی کی سرداری کو تسلیم کرنے کا مطلب اپنی موجودہ حیثیت، اختیارات، یا طاقت کو ترک کرنا ہو گا۔ انبیاء اور اہل بیتؑ کی تعلیمات، جو عدل، مساوات، اور حقوق پر مبنی ہوتی ہیں، اکثر ان لوگوں کے لیے خطرہ بن جاتی ہیں جو اپنی طاقت کو دوسروں کے استحصال کے ذریعے قائم رکھتے ہیں۔ ان کے لیے یہ تعلیمات اپنی بنیاد کھونے کے مترادف ہوتی ہیں، اور اس لیے وہ انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔

نفسیاتی طور پر یہ مائنڈ سیٹ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان کا "انا" ضرورت سے زیادہ مضبوط ہو جائے۔ "انا" کا مطلب ہے اپنی شناخت، حیثیت، اور اختیار کو اتنا اہم سمجھنا کہ وہ

دوسرے تمام حقائق پر غالب آجائے۔ جب انسان کے اندر عاجزی کی کمی ہوتی ہے، تو اس کا ذہن ہر اس چیز کے خلاف مزاحمت کرنے لگتا ہے جو اس کی "انا" کو چیلنج کرے۔ یہی وجہ ہے کہ منکرین انبیاء اور اہل بیتؑ کو ان کی سرداری اور فضیلت تسلیم کرنے میں مشکل ہوتی ہے، کیونکہ یہ ان کے اندر موجود "انا" کے خلاف جاتی ہے۔

سماجی طور پر یہ مائنڈ سیٹ اس وقت زیادہ پروان چڑھتا ہے جب کسی معاشرے میں طاقت، دولت، یا علم کو بالادستی کی علامت سمجھا جائے۔ ایسے معاشروں میں لوگ انبیاء اور اولیاء کی تعلیمات کو غیر اہم یا غیر عملی سمجھتے ہیں، کیونکہ وہ ان تعلیمات کو اپنے مفادات کے خلاف پاتے ہیں۔ انبیاء اور اہل بیتؑ کی شخصیتیں اپنی سادگی، دیانت، اور اصول پسندی کی وجہ سے ان سماجی روایات کو چیلنج کرتی ہیں، جو طاقت اور حیثیت کو بنیاد بناتی ہیں۔ نتیجتاً، منکرین ان کے خلاف ایک نفسیاتی اور سماجی دیوار کھڑی کرلیتے ہیں۔

روحانی اعتبار سے یہ مائنڈ سیٹ انسان کے خدا سے تعلق کے فقدان کی عکاسی کرتا ہے۔ جب انسان خدا کو اپنی زندگی کا مرکز نہیں بناتا اور اپنی خواہشات کو اپنا معبود بنالیتا ہے، تو وہ ہر اس حقیقت کو مسترد کر دیتا ہے جو اس کے اندرونی تضادات کو بے نقاب کرے۔ خدا کے نمائندے انسان کو اس کی حقیقت دکھانے اور اسے اس کے روحانی سفر کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اگر انسان کے اندر انکساری اور حق کی طلب نہ ہو، تو وہ اس دعوت کو مسترد کر دیتا ہے۔

یہ مائنڈ سیٹ ایک گہری نفسیاتی، سماجی، اور روحانی بیماری ہے جو انسان کو حقیقت کے قریب آنے سے روک دیتی ہے۔ اس کا علاج صرف اس وقت ممکن ہے جب انسان اپنے اندر عاجزی پیدا کرے، اپنی محدودیت کو تسلیم کرے، اور اپنے دل و دماغ کو حق کی تلاش کے

لیے کھول دے۔ انبیاء اور اہل بیتؑ کی تعلیمات کا مقصد یہی ہے کہ انسان کو اس بیماری سے نکالا جائے اور اسے خدا کی معرفت تک پہنچایا جائے۔ لیکن یہ سفر اسی وقت ممکن ہے جب انسان اپنی "انا" کو ترک کر کے سچائی کے سامنے جھکنے کے لیے تیار ہو۔

ہم نے جس مائنڈ سیٹ کی نشاندہی کی ہے، وہ حقیقت میں ایک ہی بنیادی نفسیاتی اور روحانی رویے کا اظہار ہے، جو انسان کی انانیت، غرور، اور خود ساختہ برتری کے احساس سے جڑا ہوا ہے۔ اس رویے کی جڑیں اس حقیقت میں پنہاں ہیں کہ انسان جب اپنے نفس کو مرکزیت دے لیتا ہے، تو وہ کسی بالاتر ہستی یا اصول کو قبول کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے۔ یہ مائنڈ سیٹ ہر زمانے اور ہر طبقے میں مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا رہا ہے، لیکن اس کا جوہر ایک ہی ہے۔

ابلیس کا حضرت آدمؑ کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار محض ایک عمل نہیں تھا، بلکہ اس کے پیچھے ایک گہری نفسیات کار فرما تھی۔ ابلیس نے اپنی تخلیقی برتری (آگ) کو بنیاد بنا کر آدمؑ (مٹی) کے انتخاب کو مسترد کیا۔ یہ انکار دراصل اللہ کے فیصلے اور حکمت کو مسترد کرنا تھا، جو اس کے نفس کے غرور کی انتہا کی نشانی تھی۔ یہی نفس پرستی اور خود کو برتر سمجھنے کا مائنڈ سیٹ انبیاء کے انکار کرنے والے مشرکین و کفار میں بھی نظر آتا ہے۔ وہ اپنی روایات، مفادات، اور سماجی برتری کے دائرے میں اس قدر جکڑے ہوئے تھے کہ وہ کسی ایسے پیغام کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے جو ان کے نظریات یا اقتدار کو چیلنج کرتا تھا۔

یہی رویہ مسلمانوں میں بھی منافقین کے طور پر ظاہر ہوا، جو بظاہر ایمان لانے کا دعویٰ کرتے تھے لیکن حقیقت میں رسولؐ اور ان کے جانشینوں کی قیادت کو اپنے مفادات کے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔ ان کی مخالفت نہ صرف رسولؐ کی ذات کے خلاف تھی بلکہ وہ اس الٰہی منصوبے

کے خلاف تھے جو انسانیت کو ایک اعلیٰ اخلاقی اور روحانی منزل تک لے جانے کے لیے ترتیب دیا گیا تھا۔

علماء اور ولی فقیہ کے حوالے سے غالی اور مقصرین کا رویہ بھی اسی مائنڈ سیٹ کا تسلسل ہے۔ غالی اپنے جذباتی یا فکری انحراف کی وجہ سے علماء اور ولی فقیہ کے کردار کو غیر اہم سمجھتے ہیں اور اپنی خود ساختہ تعبیرات کو برتر قرار دیتے ہیں، جبکہ مقصرین ان کی اتھارٹی کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں، اکثر اپنی انا، جہالت یا دنیاوی مفادات کی وجہ سے۔ ان دونوں گروہوں کا رویہ اس بات کا عکاس ہے کہ وہ خدا کی طرف سے مقرر کردہ قیادت کے اصول کو تسلیم کرنے کے بجائے اپنی مرضی کے اصول بناتے ہیں۔

ولی فقیہ کے نمائندے کے مقابلے پر سپر انقلابیوں کا رویہ بھی اسی مائنڈ سیٹ کا حصہ ہے۔یہ لوگ خود کو انقلاب کا حقیقی محافظ سمجھتے ہیں اور ولی فقیہ کی قیادت کو اس کے تقاضوں کے مطابق سمجھنے اور قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ وہ "اصلاح" یا "انقلاب کے تحفظ" کے لیے کام کر رہے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ رویہ ان کی ذاتی انا، نظریاتی شدت پسندی، یا ناقص فہم کا نتیجہ ہوتا ہے۔

یہ تمام مثالیں اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ یہ ایک ہی مائنڈ سیٹ ہے جو خود کو برتر سمجھنے، اپنی خواہشات کو الٰہی ہدایت پر ترجیح دینے، اور کسی بالاتر قیادت یا اصول کو قبول نہ کرنے سے جنم لیتا ہے۔ اس مائنڈ سیٹ کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی انا کو توڑے، اپنی حیثیت کو سمجھے، اور خدا کی طرف سے مقرر کردہ قیادت کو دل و جان سے قبول کرے۔ قرآن کریم اور احادیث اس بات پر زور دیتے ہیں کہ حقیقی کامیابی صرف اللہ کے سامنے جھکنے، اس کے نمائندوں کی اطاعت کرنے، اور اپنی خواہشات کو الٰہی ہدایت کے تابع

کرنے میں ہے۔ جب تک انسان اپنے نفس کے غلام رہیں گے، یہ مائنڈ سیٹ مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا رہے گا، اور اس کے اثرات انفرادی اور اجتماعی زندگی میں تباہ کن رہیں گے۔ انسان کی زندگی کا حقیقی مقصد محض دنیاوی سکون یا عارضی راحتوں کا حصول نہیں بلکہ روحانی تکمیل اور حقیقت تک پہنچنا ہے۔ انسان کو اپنی زندگی کو ایک اعلیٰ مقصد کے تحت گزارنا چاہیے اور یہ مقصد صرف خدا کی ہدایات اور رہنمائی سے متعین ہو سکتا ہے۔ خدا نے اپنی ہدایات کو انبیاء اور اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے انسانوں تک پہنچایا، جو کہ انسان کی فطری خلا کو پر کرنے اور اسے صحیح راستے پر گامزن کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔

خدائی نمائندے ہمیشہ سچائی اور صداقت پر مبنی پیغام دیتے ہیں۔ ان کی تعلیمات میں ہمیشہ عدل، محبت، انسانیت کی بھلائی، اور روحانی حقیقتوں کی وضاحت شامل ہوتی ہے۔ ان کی شخصیت دیانت، پاکیزگی، اور خدا کے ساتھ گہرے تعلق کا مظہر ہوتی ہے۔ وہ دنیاوی مفادات اور ذاتی فوائد سے آزاد ہوتے ہیں اور ان کے کردار اور عمل میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔ ان کی تعلیمات ہمیشہ قرآن اور خدا کی ہدایات سے ہم آہنگ ہوتی ہیں اور ان میں کسی قسم کا تضاد یا خامی نہیں ہوتی۔ ان کی شخصیت اور کردار انسانوں کے لیے عملی نمونہ ہوتا ہے اور وہ اپنے معجزات اور کرامات کے ذریعے اپنی صداقت کو ثابت کرتے ہیں۔

انسان کو اپنی عقل اور بصیرت کو استعمال کرتے ہوئے ان نمائندوں کی صداقت کو سمجھنا چاہیے۔ یہ ضروری ہے کہ وہ کسی بھی شخصیت کو بغیر سوچے سمجھے یا ذاتی پسند کے تحت اپنا رہنما نہ بنائے بلکہ خدا کی ہدایات کے مطابق ان کے کردار، تعلیمات، اور عمل کو پرکھے۔ صرف اسی صورت میں انسان حقیقی رہنمائی حاصل کر سکتا ہے اور اپنی روحانی ضروریات کو

پورا کرتے ہوئے خدا کے قریب آسکتا ہے۔ یہ خدائی نمائندے ہی انسان کی زندگی کو مقصد، سکون، اور ابدی کامیابی کی طرف لے جانے والے حقیقی رہنما ہیں۔

توحید اور شرک سے کیا مراد ہے؟

انسانی تاریخ میں خدا کے ساتھ تعلق اور اس کی بندگی کے اظہار کے مختلف طریقے سامنے آئے ہیں۔ ان میں ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ خدا نے بعض ہستیوں، مقامات، یا اشیاء کو اپنے قرب اور عظمت کے ساتھ منسلک کیا ہے۔ ان کے ذریعے خدا کی تعظیم اور بندگی کا اظہار کیا جاتا ہے، اور یہ تصور قرآن، حدیث، اور مستند تاریخ میں واضح طور پر موجود ہے۔

قرآن مجید میں خدا نے کئی مرتبہ اپنی نشانیوں (آیات) کا ذکر کیا ہے، جن کے ذریعے انسان کو اس کی ذات اور عظمت کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، خانہ کعبہ کو "بیت اللہ" کہا گیا ہے، جو خدا کے لیے مخصوص گھر ہے۔ اس کی تعظیم درحقیقت خدا کی تعظیم ہے، اور اس کا طواف، نماز، اور عبادت انسان کو خدا کے قریب لے جاتی ہے۔ سورۃ الحج میں فرمایا گیا: "اور ہم نے ہر امت کے لیے قربانی مقرر کی تاکہ وہ ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انہیں دیے ہیں" (22:34)۔ یہ قربانی بھی خدا کی یاد اور اس کے قرب کے حصول کا ذریعہ ہے۔

انبیاء، اولیاء، اور اماموں کو بھی خدا نے اپنی ہدایت اور رہنمائی کا ذریعہ بنایا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے کہ انہوں نے خدا کے حکم پر خانہ کعبہ کو پاک کیا تاکہ وہاں آنے والے لوگ عبادت کر سکیں (البقرہ:125)۔ انبیاء کو

خدا کی جانب سے مخصوص حیثیت دی گئی، اور ان کی اطاعت دراصل خدا کی اطاعت ہے۔ سورۃ النساء میں ارشاد ہوا: "جو رسول کی اطاعت کرتا ہے، وہ درحقیقت اللہ کی اطاعت کرتا ہے" (4:80)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے اپنی اطاعت کو اپنے نمائندوں کی اطاعت سے مربوط کیا ہے۔

تاریخی روایات میں بھی ہمیں ایسی مثالیں ملتی ہیں جہاں خدا کی تعظیم کے لیے بعض ہستیوں یا مقامات کو مخصوص کیا گیا۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں بنی اسرائیل کو تابوت سکینہ کی تعظیم کا حکم دیا گیا، جس میں خدا کی طرف سے سکون اور برکت موجود تھی (البقرہ:248)۔ اسی طرح، حضرت یعقوبؑ نے حضرت یوسفؑ کی قمیص کو آنکھوں پر رکھ کر بینائی پائی، جو خدا کی جانب سے ایک معجزہ اور نشانی تھی (یوسف:93)۔

احادیث میں بھی یہ تصور واضح ہے۔ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ اہل بیتؑ خدا کی جانب سے ہدایت کے چراغ ہیں اور ان کی محبت ایمان کا حصہ ہے۔ یہ محبت محض جذباتی تعلق نہیں بلکہ خدا کی قربت کا ذریعہ ہے۔ حضرت علیؑ کے بارے میں نبی کریمؐ کا ارشاد ہے: "جس کا میں مولا ہوں، علی اس کا مولا ہے"۔ یہ حدیث اس بات کی غماز ہے کہ علیؑ کی ولایت خدا کی ولایت کا تسلسل ہے۔

اسلامی تاریخ میں بھی یہ روایت موجود ہے کہ صحابہ کرام نبی کریمؐ کی ذات سے برکت حاصل کرتے تھے۔ وہ آپؐ کے وضو کے پانی کو متبرک سمجھتے، آپؐ کے بالوں کو محفوظ

رکھتے، اور آپؐ کے وجود کو خدا کی رحمت کا مظہر مانتے تھے۔ یہ سب کچھ اس عقیدے کی بنیاد پر تھا کہ نبیؐ خدا کی نشانی ہیں، اور ان کی تعظیم در حقیقت خدا کی تعظیم ہے۔

یہ تمام شواہد اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ خدا نے بعض ہستیوں، مقامات، اور اشیاء کو اپنے قرب اور عظمت کے اظہار کے لیے مخصوص کیا ہے۔ ان کی تعظیم اور ان کے ذریعے مانگنا دراصل خدا ہی کی تعظیم اور اس سے تعلق کا اظہار ہے۔ ان تمام اعمال کا مقصد خدا کی وحدانیت کو تسلیم کرنا اور اس کے حکم کے مطابق زندگی گزارنا ہے، نہ کہ کسی ہستی کو خدا کے مقام پر لے جانا۔ جو لوگ ان ہستیوں کی تعظیم کو شرک سمجھتے ہیں، وہ دراصل خدا کی جانب سے مقرر کردہ اصولوں اور نشانیوں کو صحیح معنوں میں سمجھنے سے قاصر ہیں۔

اسلام کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ خدا واحد و یکتا ہے، اور اس کی ذات، صفات، اور افعال میں کوئی شریک نہیں۔ "غیر اللہ" سے مراد وہ تمام ہستیاں، اشیاء، یا تصورات ہیں جنہیں خدا کی ذات کے مقابلے میں رکھا جائے یا ان کے بارے میں وہ اعتقادات رکھے جائیں جو صرف خدا کے لیے مخصوص ہیں۔ شرک سے مراد یہی ہے کہ خدا کے علاوہ کسی اور کو وہ مقام دیا جائے جو خدا کا حق ہے، خواہ یہ عقیدہ کسی ہستی کے بارے میں ہو، کسی تصور یا نظام کے بارے میں ہو، یا کسی عمل کے ذریعے ظاہر کیا جائے۔

شرک کی کئی صورتیں ہیں جنہیں قرآن اور حدیث میں واضح کیا گیا ہے۔ ایک بنیادی شکل "شرک فی الذات" ہے، یعنی خدا کے ساتھ کسی اور کو ذات میں شریک کرنا، جیسے یہ عقیدہ رکھنا کہ خدا کے علاوہ کوئی اور بھی مستقل طور پر خود مختار اور خالق ہے۔ مشرکین مکہ کے

متعلق قرآن کہتاہے: "اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟تو وہ کہیں گے کہ اللہ نے"(لقمان:25)۔اس کے باوجود وہ بتوں کو خدا کے شریک ٹھہراتے تھے۔

دوسری شکل "شرک فی الصفات" ہے، یعنی خدا کی صفات جیسے علم، قدرت، حاکمیت، یا رزق دینے کو کسی اور کے لیے مخصوص کرنا۔ یہ بھی شرک ہے کہ کسی مخلوق کو خدا کی صفات میں شریک کیاجائے یا یہ ماناجائے کہ خدا کے علاوہ کوئی اور ان صفات میں خود مختار ہے۔

تیسری شکل "شرک فی العبادت" ہے، یعنی عبادت کو کسی اور کے لیے خاص کرنا یا خدا کی عبادت کے ساتھ کسی اور کو شامل کرنا۔ قرآن نے واضح طور پر حکم دیا: "اور صرف اللہ ہی کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ"(نساء:36)۔ مشرکین عبادت کے اعمال، جیسے دعا، قربانی، یا طواف، کو اپنے بتوں یا دیگر مخلوقات کے لیے مختص کرتے تھے، جو شرک کی ایک واضح شکل ہے۔

"غیر اللہ" کی وضاحت کے لیے یہ سمجھناضروری ہے کہ اسلام کی تعلیمات میں "وسیلہ" اور "شریک" میں فرق ہے۔ خدا نے اپنی ہدایت کے لیے کچھ ہستیوں کو ذریعہ بنایا ہے، جیسے انبیاء، اولیاء، اور قرآن مجید۔ ان ہستیوں کا وسیلہ بنانا شرک نہیں، بلکہ یہ توحید کا ایک حصہ ہے، کیونکہ ان کے ذریعے انسان خدا کے قریب ہوتا ہے۔ وسیلہ تب شرک بنتا ہے جب یہ عقیدہ رکھاجائے کہ وہ ہستیاں خود مختار ہیں اور خدا کی اجازت اور قدرت کے بغیر کچھ کر سکتی ہیں۔

شرک کی ایک اور شکل "شرک فی الحاکمیت" ہے، یعنی خدا کی حاکمیت اور قانون سازی کو چھوڑ کر کسی اور نظام کو اختیار کرنا۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: "کیا وہ اللہ کے سوا کسی اور کو حاکم بناتے ہیں، حالانکہ اس نے تم پر تفصیل سے حکم نازل کیا ہے" (انعام:114)۔ جب انسان اپنی خواہشات، سماجی روایات، یا غیر الٰہی قوانین کو خدا کے قانون کے برابر یا اس سے بالاتر رکھتا ہے، تو یہ شرک کی ایک قسم بن جاتی ہے۔

لہٰذا، "غیر اللہ" وہ ہستیاں یا تصورات ہیں جنہیں خدا کے برابر یا اس کے مقابلے میں کھڑا کیا جائے۔ شرک اس وقت ہوتا ہے جب خدا کے مخصوص حقوق یا صفات کو کسی اور کے لیے مختص کر دیا جائے، یا کسی مخلوق کو خدا کے برابر سمجھا جائے۔ شرک ایک روحانی، فکری، اور عملی بیماری ہے، جس سے بچنے کے لیے قرآن بار بار توحید کی حقیقت اور خدا کی صفات پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

توحید اور غور و فکر کی عادت

خدا اور خدائی کے دلائل کو سمجھنے اور ان کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے ایک انسان کو فطری طور پر غور و فکر کی صلاحیت کو استعمال کرنا ضروری ہے۔ یہ کام صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو دلائل پر گہرائی سے سوچنے کی عادت رکھتا ہو اور اپنے اندر سچائی کو جاننے کی سچی لگن پیدا کر چکا ہو۔ وہ شخص جو اس سفر میں سنجیدہ ہو، اپنی عقل اور شعور کا بہترین استعمال کرے، اور محض ظاہری دنیاوی مصلحتوں یا ذاتی مفادات کی خاطر اپنی رائے کو محدود نہ کرے۔

سچائی تک پہنچنے کے لیے ایک کھلا ذہن اور حقائق کو سمجھنے کی خواہش درکار ہوتی ہے۔ ایسا شخص ظاہری چیزوں اور سطحی حقائق میں الجھ کر نہیں رہتا بلکہ ان کے پیچھے چھپی ہوئی گہری حقیقتوں تک رسائی حاصل کرنے کا عزم رکھتا ہے۔ وہ اس بات کو جانتا ہے کہ ظاہری مظاہر محض ایک پردہ ہیں، اور ان کے پیچھے ایک باطنی حقیقت موجود ہے جو کائنات کے نظم و ضبط کو چلا رہی ہے۔ اس کا دل اس حقیقت کو تلاش کرنے کے لیے بے قرار رہتا ہے اور وہ اپنی عقل، شعور اور دل کے تمام وسائل کو بروئے کار لاتا ہے تاکہ ان مخفی حقائق کو سمجھ سکے۔

خدا کو جاننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان اپنی انا، تعصبات اور جذباتی وابستگیوں سے بالاتر ہو کر سچائی کی طرف رجوع کرے۔ جب انسان ظاہری دنیا کے دھوکے اور فریب سے نکل کر حقیقت کے میدان میں قدم رکھتا ہے تو وہ خدا کے وجود اور اس کی صفات کے دلائل

کو بہتر طور پر سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہ سفر انسان کی اندرونی پاکیزگی، سنجیدگی، اور غور و فکر کی عادت سے شروع ہوتا ہے اور اسے حقیقت کے اس درجے تک لے جاتا ہے جہاں وہ کائنات کے حقیقی خالق کی معرفت حاصل کر لیتا ہے۔

سائنسی طریقہ اور فلسفی طریقہ غور و فکر کے اہم وسائل ہیں جن کے ذریعے انسان کائنات کی حقیقت کو سمجھنے اور خدا کی معرفت تک پہنچنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ سائنسی طریقہ تحقیق اور مشاہدہ کی بنیاد پر کام کرتا ہے۔ یہ تجربات، مشاہدات، اور تحقیق پر زور دیتا ہے اور اس میں ثابت شدہ حقائق کی بنیاد پر نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ سائنس انسان کو کائنات کی مادی حقیقتوں، ان کے نظم و ضبط، اور قوانین کو سمجھنے کی صلاحیت فراہم کرتی ہے، جو خدا کی قدرت کا مظہر ہیں۔ سائنس کے ذریعے انسان اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ کائنات کا نظام کس طرح کام کرتا ہے اور اس کے پیچھے ایک معقول اور حکیمانہ حکمت موجود ہے۔

فلسفی طریقہ غور و فکر کی ایک اور اہم صورت ہے جس میں انسان اپنے ذہن اور عقل کو استعمال کرتے ہوئے حقیقت کی تلاش میں نکلا ہے۔ فلسفہ انسان کو خود اپنے وجود، اس کی حقیقت، اور اس کے مقصد پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ فلسفیانہ تجزیہ انسان کو نہ صرف مادی دنیا کے بارے میں بلکہ روحانی، اخلاقی، اور عقلی سچائیوں کے بارے میں بھی سوچنے کی ترغیب دیتا ہے۔ فلسفہ میں عقل، استدلال، اور منطق کے ذریعے انسان دنیا اور اس کے معانی کے بارے میں گہرائی سے سوچتا ہے اور کائنات کے نظام کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

ان دو طریقوں کے علاوہ کچھ دیگر طریقے بھی غور و فکر کی صلاحیت کو بیدار کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم طریقہ "روحانی یا مابعد الطبیعی طریقہ" ہے۔ اس میں انسان اپنی روحانی کیفیت اور باطن کے ذریعے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں عبادات، دعائیں، اور مواعظ کی مدد سے انسان خدا سے براہ راست تعلق قائم کرتا ہے اور اس کے دل کی گہرائیوں سے سچائی کی تلاش میں ہوتا ہے۔ روحانی طریقہ انسان کے اندرونی شعور کو بیدار کرتا ہے اور اسے کائنات کی روحانی حقیقتوں تک رسائی حاصل کرنے کی صلاحیت فراہم کرتا ہے۔

ایک اور اہم طریقہ "نظریاتی یا فکری تحقیق" ہے، جس میں انسان مختلف عقائد، مذہبی تعلیمات، اور فلسفوں کو پڑھ کر، مختلف مکاتب فکر کی تعلیمات پر غور و فکر کرتا ہے تاکہ وہ سچائی تک پہنچ سکے۔ اس طریقہ میں مختلف مکاتب فکر کے تصورات کا موازنہ کرنا اور ان میں موجود حقیقتوں اور جھوٹ کا تجزیہ کرنا شامل ہوتا ہے۔

غور و فکر کا ہر طریقہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان کو اپنے ذہن اور دل کو کھول کر سچائی کو تلاش کرنا چاہیے۔ یہ مختلف طریقے انسان کو عقل، شعور، اور بصیرت سے اپنی زندگی کی حقیقت کو سمجھنے میں مدد فراہم کرتے ہیں، تاکہ وہ خدا کی حقیقت اور اس کی موجودگی کو صحیح انداز میں سمجھ سکے۔ ان تمام طریقوں میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ انسان کی نیت خالص ہو اور اس کا مقصد صرف سچائی کی تلاش ہو، نہ کہ ذاتی مفادات یا دنیاوی خواہشات۔

عبادات و معاملات

اسلام ایک متوازن زندگی گزارنے کی تعلیم دیتا ہے جہاں عبادات اور معاملات دونوں اہمیت رکھتے ہیں اور دونوں کو یکساں انداز میں ادا کرنا ضروری ہے۔ قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ ہمیں یہ سمجھاتے ہیں کہ دین صرف نماز، روزہ اور دیگر ظاہری عبادات تک محدود نہیں بلکہ انسان کی عملی زندگی اور اس کے معاملات بھی دین کا حصہ ہیں۔ دین کا مکمل تصور یہ ہے کہ انسان کی عبادات اسے اللہ سے قریب کریں، اور اس قربت کا اثر اس کے اخلاق اور معاملات پر بھی ظاہر ہو۔

بہت سے لوگ عبادات میں بہت زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں اور ان کے ادا کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑتے۔ وہ نماز کے پابند، روزے کے اہتمام کرنے والے اور دیگر نیک اعمال میں بہت آگے ہوتے ہیں۔ لیکن جب معاملات کی بات آتی ہے تو وہ ایمانداری، دیانتداری اور دوسروں کے حقوق کی ادائیگی میں غفلت برتتے ہیں۔ مثلاً تجارت میں دھوکہ دینا، وعدے کی خلاف ورزی کرنا، یا دوسروں کے حقوق مارنا ایسے افراد کی شخصیت میں عام باتیں نظر آتی ہیں۔ اس رویے سے ان کی عبادات کا اثر زائل ہو جاتا ہے کیونکہ قرآن پاک میں اللہ نے واضح فرمایا ہے کہ نماز کا مقصد انسان کو برائی اور بے حیائی سے روکنا ہے۔ دوسری جانب کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے معاملات میں بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ وہ

غریبوں کی مدد کرتے ہیں، تعلیم کے فروغ کے لیے کام کرتے ہیں، اور سماجی خدمات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ لیکن جب عبادات کی بات آتی ہے تو وہ ان میں غفلت برتتے ہیں۔ نماز، روزہ یا ذکر و اذکار ان کی زندگی میں ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ دین کو صرف معاملات کی حد تک محدود سمجھتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ عبادات انسان کو روحانی طور پر مضبوط کرنے کا ذریعہ ہیں۔ عبادات کے بغیر انسان کے اعمال میں وہ گہرائی اور اخلاص نہیں آسکتا جو اللہ کو مطلوب ہے۔

اسلام کا اصل پیغام یہ ہے کہ عبادات اور معاملات دونوں میں توازن قائم کیا جائے۔ عبادات سے انسان کی روحانی اصلاح ہوتی ہے اور وہ اللہ کے قریب ہوتا ہے، جبکہ معاملات میں اچھائی سے انسان کی سماجی زندگی بہتر ہوتی ہے اور معاشرے میں عدل اور امن قائم ہوتا ہے۔ عبادات اور معاملات کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ نماز اور روزہ جہاں روحانی تربیت کا ذریعہ ہیں، وہیں معاملات میں ایمانداری اور دیانتداری انسان کے کردار کو مکمل کرتے ہیں۔

دنیا کو آخرت کی کھیتی کہا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان جو کچھ یہاں بوئے گا، وہی آخرت میں کاٹے گا۔ اگر عبادات کے ساتھ معاملات درست نہیں تو عبادات کا اجر مکمل نہیں ہو گا، اور اگر معاملات اچھے ہیں لیکن عبادات کی کمی ہے تو یہ بھی کامیابی کی ضمانت نہیں۔ اللہ نے دین کو مکمل ضابطہ حیات بنا کر پیش کیا ہے اور انسان کو ہر پہلو میں اچھا بننے کی تاکید کی ہے۔

معاشرے میں موجود انتہاپسندی اور عدم توازن کو ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر فرد اپنے دین کو مکمل طور پر سمجھے۔ عبادات میں آیت اللہ بہجت جیسا اخلاص اور معاملات میں سوشلسٹ جیسا انصاف اگر ایک شخصیت میں جمع ہو جائے تو یہی اسلام کا مطلوبہ انسان ہے۔ یہی وہ شخصیت ہے جو دنیا اور آخرت دونوں میں کامیاب ہو گی۔

مغربی معاشروں کے معاملات کی مثالیں دینا ہمارے معاشرے میں ایک عام رجحان بن چکا ہے، خاص طور پر ان کی تنظیم، انصاف، اور انسانی حقوق کی پاسداری کو سراہا جاتا ہے۔ ان کے حکومتی نظام کی شفافیت، عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کام، اور سماجی انصاف کی تعریف کی جاتی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان معاشروں میں عبادات اور روحانی پہلو عمومی طور پر موجود نہیں یا بہت کمزور ہیں۔ اس طرح، مغرب کی کامیابیاں صرف دنیاوی معاملات تک محدود ہیں، جبکہ آخرت کا تصور ان کی زندگیوں میں یا تو غیر اہم ہے یا سرے سے موجود ہی نہیں۔

یہ بات درست ہے کہ مغرب میں عام طور پر حکومتی نظام اپنے شہریوں کے ساتھ انصاف پر مبنی ہیں۔ وہاں قانون کی بالادستی، تعلیم، صحت، اور دیگر بنیادی حقوق کے حوالے سے مضبوط نظام موجود ہیں، جو قابل تعریف ہیں۔ لیکن یہی مغربی طاقتیں جب دوسری اور تیسری دنیا کی اقوام سے تعلقات کی بات کرتی ہیں تو ان کے معاملات یکسر مختلف نظر آتے ہیں۔ مثلاً معاشی استحصال، قدرتی وسائل کی لوٹ مار، سیاسی مداخلت، اور سامراجی پالیسیاں ان کی حقیقی نیت کو ظاہر کرتی ہیں۔ یہ وہ دوہرا معیار ہے جس پر سوال اٹھانا ضروری ہے۔

اللہ نے انسان کے لیے ایک متوازن راستہ مقرر کیا ہے جہاں دنیاوی اور اخروی کامیابی کو ساتھ لے کر چلنا لازم ہے۔ مغربی معاشروں میں دنیاوی معاملات میں کامیابی تو نظر آتی ہے، لیکن عبادات اور روحانی تربیت کا فقدان ان کے اخلاقی معیار میں ایک بڑی خامی ہے۔ اسلام ہمیں معاملات کی درستگی کے ساتھ ساتھ عبادات کی اہمیت پر بھی زور دیتا ہے تاکہ انسانی زندگی مکمل اور متوازن ہو۔

اسی طرح مغرب کا اپنے شہریوں کے ساتھ انصاف اور دیگر اقوام کے ساتھ ظلم اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ان کی نیت مکمل انصاف پر مبنی نہیں ہے۔ یہ صرف سیاسی اور معاشی مفادات کے لیے کیا جانے والا عمل ہے۔ اسلام میں انصاف کی تعلیم کسی قوم، رنگ، نسل یا جغرافیہ سے مشروط نہیں بلکہ ہر انسان کے ساتھ یکساں ہے۔ قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے:
" اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہو اور اللہ کے لیے گواہی دو، خواہ وہ تمہارے اپنے خلاف ہو یا والدین اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف۔" (سورہ النساء: 135)
یہ آیت واضح کرتی ہے کہ اسلام کا نظام عدل کسی بھی قسم کے دوہرے معیار کو قبول نہیں کرتا۔ اگر مغرب کے معاملات کے کچھ پہلو قابل تقلید ہیں، تو انہیں اپنانے میں کوئی حرج نہیں، لیکن ان کے دوہرے معیار اور روحانیت کے فقدان کو نظر انداز کرنا درست نہیں۔ ایک مکمل انسان اور ایک مکمل معاشرہ وہی ہوگا جو دنیاوی معاملات میں مغربی منظم انداز کو اپنائے، مگر اسے عبادات اور روحانیت کے اسلامی معیار سے ہم آہنگ کرے۔ یہ توازن ہی انسانیت کی فلاح اور آخرت کی کامیابی کا ضامن ہے۔

معاملات کی درستگی کے لیے عبادات فیول اور انرجی کا کردار ادا کرتی ہیں کیونکہ عبادات انسان کو روحانی توانائی، بصیرت، اور مضبوط اخلاقی بنیاد فراہم کرتی ہیں، جو روزمرہ کے معاملات میں درست فیصلے کرنے اور ذمہ داری نبھانے میں مدد دیتی ہیں۔ عبادات، جیسے نماز، روزہ، دعا، اور ذکر، انسان کے دل و دماغ کو اللہ کی یاد سے منور کرتی ہیں اور اسے زندگی کے ہر پہلو میں اللہ کے احکامات کے مطابق عمل کرنے کی ترغیب دیتی ہیں۔

نماز کو دیکھیں، جو دن میں پانچ مرتبہ انسان کو دنیاوی مشاغل سے نکال کر اللہ کے حضور حاضر ہونے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ یہ ایک ایسا وقت ہوتا ہے جب انسان اپنے رب سے تعلق کو مضبوط کرتا ہے، اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہے، اور ہدایت کی دعا کرتا ہے۔ یہی روحانی تعلق اسے معاملات میں عدل و انصاف، دیانت داری، اور شفافیت کے ساتھ عمل کرنے کی تحریک دیتا ہے۔

روزہ انسان کو اپنی خواہشات پر قابو پانے کی تربیت دیتا ہے۔ یہ صبر، خود احتسابی، اور قربانی کا جذبہ پیدا کرتا ہے، جو معاملات میں دوسروں کے حق کو پہچاننے اور اپنی ذمہ داریوں کو صحیح طریقے سے ادا کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ اسی طرح دعا اور ذکر اللہ کے ساتھ تعلق کو مضبوط کرتے ہیں، انسان کو سکون عطا کرتے ہیں، اور اسے روزمرہ کی مشکلات کا سامنا کرنے کی طاقت فراہم کرتے ہیں۔

جب ایک انسان عبادات کو خلوص اور گہرائی کے ساتھ ادا کرتا ہے، تو وہ اندرونی طور پر مضبوط اور متوازن ہو جاتا ہے۔ یہ روحانی قوت اسے دنیاوی معاملات میں اخلاقی اصولوں پر

قائم رہنے اور دوسروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کے قابل بناتی ہے۔ عبادات نہ صرف انسان کو اللہ کے قریب کرتی ہیں بلکہ اسے اپنے معاشرتی اور اخلاقی فرائض کی ادائیگی کے لیے ضروری توانائی فراہم کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عبادات کو معاملات کی درستگی کے لیے فیول اور انرجی کہا جاسکتا ہے۔

مشرقی معاشروں، خاص طور پر مسلم ممالک میں، اپنی روایات اور ثقافت کو بہت سراہا جاتا ہے اور اس پر فخر کیا جاتا ہے۔ یہاں اسلامی تاریخ، تہذیب، اور اقدار کی عظمت کے قصے بیان کیے جاتے ہیں، مگر عملی طور پر ان اقدار کو اپنانے میں بڑی کمی نظر آتی ہے۔ مشرقی معاشرے اپنی ثقافت اور روایات کے حوالے سے بہت حساس ہوتے ہیں، لیکن اکثر یہ روایات اسلامی تعلیمات کے بجائے مقامی رسوم و رواج پر زیادہ مبنی ہوتی ہیں۔ یہ رویہ معاشرتی ناانصافی، اخلاقی زوال، اور ظلم کے خلاف خاموشی کا باعث بنتا ہے۔ اسلام عدل و انصاف کو ہر سطح پر نافذ کرنے کی تعلیم دیتا ہے، چاہے وہ فرد کی ذاتی زندگی ہو، سماجی معاملات ہوں، یا حکومتی سطح پر فیصلے۔ لیکن مشرقی معاشروں میں اکثر عدل و انصاف کے بجائے ذاتی مفادات، خاندانی دباؤ، یا سیاسی وابستگیوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ معاشرتی سطح پر دیکھا جائے تو ظلم کے خلاف آواز اٹھانا یا مظلوم کی حمایت کرنا ایک کمزور پہلو ہے۔ لوگ ناانصافی دیکھ کر خاموش رہتے ہیں، چاہے وہ کسی طاقتور کے ظلم کا معاملہ ہو یا کسی غریب کے حق تلفی کا۔

مشرقی روایات میں خاندان، برادری، اور علاقائی وفاداریاں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ چیزیں اپنی جگہ اہم ہیں، لیکن جب یہ اسلامی اصولوں سے ٹکرا جائیں تو اسلامی تعلیمات کو فوقیت دی جانی چاہیے۔ بدقسمتی سے، عملاً ایسا نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر، جب کوئی طاقتور یا صاحب حیثیت شخص کسی پر ظلم کرتا ہے، تو لوگ اکثر مصلحتاً خاموش رہتے ہیں یا ظالم کا ساتھ دیتے ہیں۔ یہ رویہ اسلامی تعلیمات کے بالکل برعکس ہے، جہاں مظلوم کی مدد اور ظالم کو روکنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے :

"اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو، یہی تقویٰ کے قریب تر ہے۔" (سورہ المائدہ:8)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ عدل ہر حال میں کیا جائے، خواہ اس میں اپنا نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن مشرقی معاشروں میں یہ اصول عملی طور پر کمزور ہے۔ یہاں انصاف کے بجائے طاقتور کی حمایت یا ذاتی مفادات کی تکمیل کو ترجیح دی جاتی ہے۔

اسی طرح اخلاقیات کے میدان میں بھی مشرقی معاشرے اپنی اصل اسلامی تعلیمات سے دور نظر آتے ہیں۔ بظاہر تہذیب و روایات کے علمبردار، مگر جھوٹ، دھوکہ دہی، رشوت، اور وعدہ خلافی جیسے مسائل عام ہیں۔ ان اخلاقی کمزوریوں کو اکثر ثقافت یا مجبوری کے پردے میں چھپایا جاتا ہے۔

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں، ایک مسلمان کے لیے نہ صرف عبادات اہم ہیں بلکہ اخلاق اور سماجی ذمہ داری بھی اسی قدر اہم ہیں۔ مظلوم کی حمایت کرنا، ظلم کے خلاف آواز اٹھانا، اور ہر حال میں عدل و انصاف کا ساتھ دینا ایک حقیقی مسلمان کی پہچان ہے۔ مشرقی معاشروں کو اپنی روایات پر فخر کرنے کے ساتھ ان کا جائزہ بھی لینا چاہیے اور اسلامی اصولوں کے خلاف جانے والی رسوم ورواج کو ترک کرنا چاہیے۔

اگر مشرقی معاشرے اپنی روایات کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھال لیں اور عملاً عدل و انصاف کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیں، تو نہ صرف ان کی اپنی حالت بہتر ہوگی بلکہ وہ دنیا کے لیے ایک حقیقی اسلامی ماڈل پیش کر سکیں گے۔ اس تبدیلی کے لیے ضروری ہے کہ ہر فرد اپنی ذات سے اصلاح کا آغاز کرے اور معاشرے میں انصاف اور اخلاقیات کے فروغ کے لیے جدوجہد کرے۔

مشرق و مغرب کے موجودہ رویوں میں موجود مثبت پہلوؤں کو مزید نکھارنے اور منفیات کا حل پیش کرنے کے لیے اسلام کی جامع تعلیمات سے رہنمائی لیناضروری ہے۔ اسلام ایسا نظام حیات پیش کرتا ہے جو توازن، عدل، اور ترقی کے اصولوں پر مبنی ہے۔ ان اصولوں کو اپناکر دونوں خطوں کی منفیات کو ختم کیا جاسکتا ہے اور مثبت پہلوؤں کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ مشرقی معاشروں میں عدل و انصاف کا فقدان ایک بڑی خامی ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ اسلامی عدالتی نظام کو نافذ کیا جائے، جہاں قانون کی بالادستی ہو اور ہر فرد کو مساوی حقوق حاصل ہوں۔ اسلام میں عدل کو ہر حال میں قائم رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، چاہے اس میں ذاتی

نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تعلیمی نظام، خاندانی ڈھانچہ، اور حکومتی نظام میں انصاف کو اولین ترجیح دی جائے۔ مشرقی معاشرے اکثر اسلامی تعلیمات کو نظر انداز کر کے صرف علاقائی رسوم و رواج پر عمل کرتے ہیں۔ ان رسوم و رواج کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے علماء، دانشوروں، اور تعلیمی اداروں کو اپنا کردار ادا کرنا ہو گا۔ مثال کے طور پر شادی بیاہ کے غیر ضروری اخراجات اور دیگر غیر اسلامی رسومات کو ترک کر کے سادگی اپنانے کی ضرورت ہے۔

جھوٹ، دھوکہ دہی، اور بددیانتی جیسے مسائل کا حل لوگوں کی اخلاقی تربیت پر زور دینے میں ہے۔ اخلاق حسنہ کو اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی کا حصہ بنایا جائے، کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے اخلاق کو ایمان کا لازمی جز قرار دیا ہے۔ مشرقی معاشروں میں ظلم کے خلاف خاموشی ختم کرنے کے لیے اجتماعی شعور بیدار کرنا ضروری ہے۔ ہر فرد کو یہ سمجھنا چاہیے کہ ظلم کے خلاف آواز اٹھانا نہ صرف سماجی ضرورت ہے بلکہ دینی فریضہ بھی ہے۔ مغربی معاشروں میں روحانیت کا فقدان ایک بڑی خامی ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کی معرفت اور عبادات کی اہمیت سے آگاہ کیا جائے۔ سائنسی ترقی اور روحانی تعلیمات کو متوازن کرنے کے لیے اسلامی فکر کو فروغ دینا ضروری ہے۔ مغربی طاقتوں کا دوہرا معیار ختم کرنے کے لیے عالمی سطح پر اسلامی اصولوں پر مبنی انصاف کا پیغام عام کیا جانا چاہیے۔ یہ دوہرا معیار، جو کمزور قوموں کے استحصال اور قدرتی وسائل کی لوٹ مار کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ مغربی معاشروں میں خاندانی نظام کی کمزوری اور

اخلاقی بحران کا حل اسلامی خاندانی اصولوں کو اپنانے میں ہے، جو آزادی کے ساتھ ذمہ داری کا شعور بھی دیتے ہیں۔

مغربی معاشرتی نظام میں تنظیم اور اصول پسندی ایک مثبت پہلو ہے جس سے مشرقی معاشرے سیکھ سکتے ہیں۔ لیکن اس تنظیم کو اسلامی روح کے ساتھ ہم آہنگ کرنا ضروری ہے تاکہ یہ دنیاوی ترقی تک محدود نہ رہے بلکہ آخرت کی کامیابی کا ذریعہ بھی بنے۔ مشرقی معاشروں میں خاندانی نظام ایک مضبوط پہلو ہے جسے مزید بہتر بنانے کے لیے محبت، قربانی، اور خدمت کے جذبات کو فروغ دینا چاہیے۔ اسی طرح مغربی معاشروں میں سماجی فلاح و بہبود کے نظام کو اللہ کی رضا کی نیت کے ساتھ مزید بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ مشرقی معاشروں کو بھی سماجی خدمات کو عبادات کا حصہ سمجھ کر انجام دینا چاہیے۔

اگر مشرق اور مغرب اپنے اپنے مثبت پہلوؤں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق نکھاریں اور اپنی منفیات کو ختم کریں تو ایک ایسا توازن قائم ہو سکتا ہے جو دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی کا ضامن ہو۔ مشرق کو مغرب سے تنظیم، انصاف، اور جدت سیکھنی چاہیے، جبکہ مغرب کو مشرق سے روحانیت، خاندانی اقدار، اور اخلاقیات کا سبق لینا چاہیے۔ یہی توازن انسانی معاشرے کو بہترین بنا سکتا ہے۔

ناصبی کبھی مظلوم کا مدافع نہیں بن سکتا

حیدر کرار امام علی علیہ السلام اور سید الشہدا امام حسین علیہ السلام کی شخصیتوں کے ساتھ بغض رکھنے کا مطلب دراصل حق اور صداقت کے خلاف جنگ میں شریک ہونے کے مترادف ہے۔ امام علی علیہ السلام کی شخصیت میں جو اس مردی، عدل، ہمت، اور ایمان کی مکمل تکمیل موجود تھی، اور امام حسین علیہ السلام کی قربانی نے اصولوں کے لیے جیت اور برتری کا ایک ایسامعیار قائم کیا جو آج بھی دنیا کے کونے کونے میں حق کی طرف مائل کرنے کا سبب بنتا ہے۔ جب تک کسی فرد یا طاقت کا دل اور دماغ ان عظیم ہستیوں کے ساتھ محبت اور وابستگی سے پاک ہو گا، وہ نہ تو صہیونی استعماری قوتوں کے خلاف کامیاب ہو سکتا ہے اور نہ ہی مظلوموں کو ان کا حق دلوا سکتا ہے۔

امام علی علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کی زندگیوں میں چھپی ہوئی روحانیت، عدل کی پائیداری، ظلم کے خلاف مزاحمت، اور انسانیت کے لیے بے پایاں قربانیوں کا پیغام ہر دور میں مظلوموں کو حوصلہ دیتا آیا ہے۔ اگر کسی میں ان کے اصولوں، کردار، اور افکار کے خلاف کوئی بغض یا نفرت ہے، تو وہ نہ صرف ان کے پیغامات سے محروم رہتا ہے، بلکہ اپنے اندر بھی ایک ایسا تعصب اور خود غرضی پیدا کر لیتا ہے جو اسے درست سمت میں قدم اٹھانے کی اجازت نہیں دیتا۔

جب انسان اپنے دل و دماغ میں امام علی علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کی تعلیمات کے خلاف کوئی منفی رجحان رکھتا ہے، تو وہ دراصل حق اور باطل کے بیچ کے فرق کو سمجھنے میں ناکام رہتا ہے۔ ان ہستیوں نے اپنے وقت میں اس دنیا کے تمام باطل اقتداروں کو چیلنج کیا، اور ان کے ساتھ بغض رکھنے والا شخص، چاہے وہ کتنی بھی بڑی طاقت کیوں نہ ہو، حقیقت میں کبھی بھی ان میں پائی جانے والی جرات، استقامت، اور حقیقت پسندی کو اپنے اندر جذب نہیں کر سکتا۔ وہ کبھی بھی اس راہ پر نہیں چل سکتا جو امام حسین علیہ السلام کی قربانی کی صورت میں ہمیں دکھائی گئی، یعنی جو راہ کسی اصول یا مقصد کی خاطر اپنی جان دینے کی ہو۔ صہیونی استعماری طاقتوں کو شکست دینے اور ظلم کے خلاف حقیقی جدوجہد کرنے کے لیے اس بات کا شعور ضروری ہے کہ آپ جس راستے پر چل رہے ہیں، وہ حق کے راستے پر ہے یا نہیں۔ امام حسین علیہ السلام کی قربانی ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ اگر ہم کسی باطل طاقت کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں، تو ہمیں نہ صرف اپنی ظاہری طاقتوں کو بڑھانا ہو گا، بلکہ اپنے دل میں حقیقی اصولوں اور ایمان کا عزم بھی مضبوط کرنا ہو گا۔ اگر ہم امام علی علیہ السلام کے عدل اور امام حسین علیہ السلام کی قربانی کی مثالوں سے نفرت رکھتے ہیں یا ان کے اصولوں کو رد کرتے ہیں، تو ہم اس حقیقت سے انکار کر رہے ہیں جو ہمیشہ حق کی حمایت میں ہوتی ہے۔ یقیناً، جب تک کسی فرد یا گروہ کا دل امام علی علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کے نظریات سے آزاد نہیں ہو گا، وہ کبھی بھی کسی مظلوم کے حق کی حفاظت نہیں کر سکتا اور نہ ہی دنیا میں حقیقی امن قائم کر سکتا ہے۔ ان کی قربانیاں اور ان کے اصول ہمیں سکھاتے ہیں

کہ باطل کو شکست دینے کے لیے صرف طاقت یا عارضی حکمت عملی کافی نہیں ہوتی، بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے عقائد اور نظریات میں پختہ ہوں اور انہیں اپنی زندگیوں میں نافذ کریں۔ اس کے بغیر، ہمارا اجہاد صرف جسمانی سطح تک محدود رہ جائے گا، لیکن حقیقت میں ہم اس پائیدار اور حقیقی تبدیلی کو حاصل نہیں کر پائیں گے جو امام حسین علیہ السلام کی قربانی اور امام علی علیہ السلام کے عدل کی بنیاد پر ممکن ہے۔ اس لئے یہ بات سمجھنی چاہیے کہ جو شخص ان عظیم ہستیوں کے ساتھ بغض رکھتا ہے، وہ نہ صرف اپنی روحانیت کو زخم پہنچاتا ہے، بلکہ وہ اس کائنات میں موجود سچائی کے خلاف بھی چل رہا ہوتا ہے۔ ایسی قوتیں کبھی بھی صہیونی استعماری طاقتوں کو شکست نہیں دے سکتیں، کیونکہ ان کے اندر وہ اصل قوت نہیں ہوتی جو امام علی علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کی تعلیمات میں پنہاں ہے۔

زبان اور انسانی معاشرہ

زبان کا تہذیب کے ارتقاء میں کردار:

زبان تہذیب کے ارتقاء میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ یہ صرف خیالات کے اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک قوم کی شناخت، اس کے علم، ثقافت، اور تاریخ کی حفاظت کا ذریعہ بھی ہے۔ زبان کے بغیر تہذیب کا تصور ممکن نہیں، کیونکہ یہ انسانی معاشرت کی تشکیل اور ترقی کے لیے ناگزیر ہے۔ زبان کے ذریعے انسان اپنی علمی وراثت کو نسل در نسل منتقل کرتا ہے، اور یہی ذریعہ ہے جس کے ذریعے تاریخ، سائنس، فلسفہ، اور ادب جیسے شعبے پروان چڑھتے ہیں، مذہب وروحانیت بھی اسی ذریعے سے طاقت حاصل کرتی ہیں۔ زبان نے انسان کو اپنے تجربات اور مشاہدات کو محفوظ کرنے کا موقع دیا، جس کے نتیجے میں تہذیبوں نے ترقی کی۔

زبان کسی بھی قوم کی ثقافت کا اہم حصہ ہے۔ شاعری، کہانیاں، گیت، اور لوک روایات زبان کے ذریعے ہی محفوظ رہتی ہیں۔ زبان کے زوال کے ساتھ ثقافت اور تہذیب کے کئی پہلو مٹ سکتے ہیں، کیونکہ یہ الفاظ کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ ایک قوم کے جذبات، خیالات، اور طرزِ زندگی کی عکاسی بھی کرتی ہے۔ زبان افراد کو جوڑنے کا ذریعہ ہے، اور ایک مشترکہ زبان لوگوں کو ایک قوم کی شکل دیتی ہے۔ یہ انہیں اجتماعی مسائل کے حل کے لیے متحد

کرتی ہے، اور کسی بھی تہذیب کے عروج میں افراد کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا کام کرتی ہے۔

زبان نے مختلف تہذیبوں کے درمیان خیالات کے تبادلے کو ممکن بنایا۔ مختلف زبانیں بولنے والی اقوام جب ایک دوسرے کے قریب آئیں تو علم، تجربات، اور ثقافت کا اشتراک ہوا، جس سے نئی تہذیبیں وجود میں آئیں۔ آج کے دور میں زبان نے تہذیبی ارتقاء کے لیے مزید مواقع فراہم کیے ہیں۔ ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ کی بدولت زبانوں کی ترقی اور ان کے درمیان پل بنانے کے امکانات بڑھ گئے ہیں، اور زبانیں دنیا بھر کے انسانوں کو جوڑنے میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔

زبان تہذیب کے جسم میں روح کی مانند ہے۔ اس کے بغیر نہ تو علم کا فروغ ممکن ہے اور نہ ہی ثقافت کی بقا۔ زبان کا تحفظ اور ترقی کسی بھی قوم کے تہذیبی ارتقاء کے لیے ناگزیر ہیں۔

قرآن مجید میں زبان کی اہمیت کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے، کیونکہ یہ انسانی تخلیق کی ان خصوصیات میں سے ایک ہے جو اسے دیگر مخلوقات سے ممتاز کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے زبان کو ایک عظیم نعمت کے طور پر پیش کیا ہے جو نہ صرف انسان کو اظہارِ خیال کا ذریعہ فراہم کرتی ہے بلکہ علم، شعور، اور ہدایت کی راہ دکھانے میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔

سورہ الرحمٰن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

الرَّحْمٰنُ، عَلَّمَ الْقُرْآنَ، خَلَقَ الْإِنسَانَ، عَلَّمَهُ الْبَيَانَ

(الرحمٰن:1-4)

ترجمہ:"رحمٰن، جس نے قرآن سکھایا، انسان کو پیدا کیا، اور اسے بیان کرنا سکھایا۔"

یہ آیات واضح کرتی ہیں کہ زبان اور بیان کی صلاحیت اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم عطا ہے، جو انسان کو علم کے حصول اور اسے دوسروں تک پہنچانے کی طاقت دیتی ہے۔

قرآن مجید میں مختلف زبانوں اور لہجوں کی تخلیق کو بھی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں شمار کیا گیا ہے۔ سورہ الروم میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ

(الروم:22)

ترجمہ:"اور اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف۔"

یہ آیت زبانوں کی تنوع اور ان کی اہمیت کو بیان کرتی ہے اور یہ ظاہر کرتی ہے کہ زبانوں کا اختلاف اللہ کی حکمت کا ایک حصہ ہے، جو انسانوں کے درمیان تعلقات، تعلیم، اور ثقافت کے فروغ میں مددگار ہے۔

زبان کے ذریعے قرآن مجید کو سمجھنا اور اس کی تعلیمات کو آگے پہنچانا ایک اہم فریضہ ہے۔ قرآن خود ایک لسانی معجزہ ہے جو عربی زبان میں نازل ہوا، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی فصاحت و بلاغت کو اپنے کلام کی عظمت کا ثبوت بنایا۔ سورہ یوسف میں فرمایا:

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ

(یوسف:2)

ترجمہ: "ہم نے اسے ایک عربی قرآن بنایا تاکہ تم سمجھو۔"

یہ آیت زبان کے انتخاب کی اہمیت کو ظاہر کرتی ہے اور یہ کہ قرآن ہر زمانے اور قوم کے لیے ہدایت کا ذریعہ ہے۔

قرآن مجید انسان کو اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ وہ زبان کو علم، حکمت، اور ہدایت کے لیے استعمال کرے۔ زبان کی نعمت کا شکر ادا کرنا اور اسے بھلائی کے کاموں میں استعمال کرنا ایک اہم اخلاقی اور دینی ذمہ داری ہے۔ قرآن کی نظر میں زبان صرف اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ انسان کی فکری اور روحانی ترقی کا ایک اہم وسیلہ بھی ہے۔

تعلیمی ارتقاء میں زبان کا کردار:

زبان تعلیمی ارتقاء میں ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ یہ علم کے حصول، اظہار، اور ترسیل کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ تعلیم کے عمل میں زبان استاد اور شاگرد کے درمیان رابطے کا ذریعہ بنتی ہے، جس کے ذریعے نہ صرف معلومات منتقل ہوتی ہیں بلکہ افہام و تفہیم بھی پیدا ہوتی ہے۔ زبان انسان کو اپنے خیالات، تجربات، اور مشاہدات کو دوسروں تک پہنچانے کا موقع دیتی ہے، اور اسی کے ذریعے علمی مباحث، سوالات، اور جوابات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

تعلیم کے میدان میں زبان کی اہمیت اس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ یہ طلبہ کی ذہنی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں مددگار ہوتی ہے۔ طلبہ اپنی مادری زبان یا ایک ایسی زبان میں زیادہ بہتر سیکھتے ہیں جو ان کے لیے قابلِ فہم ہو، کیونکہ اس سے ان کی تخلیقی اور تجزیاتی صلاحیتوں کو جِلا ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر میں مادری زبان کو ابتدائی تعلیم کے لیے اہم سمجھا جاتا ہے۔ زبان کے ذریعے بچے نہ صرف الفاظ کا ذخیرہ بڑھاتے ہیں بلکہ وہ اپنی ثقافتی روایات، اقدار، اور شناخت سے بھی جڑتے ہیں، جو ان کی تعلیمی اور سماجی ترقی میں معاون ہوتی ہے۔

زبان تعلیم کے میدان میں تحقیق اور نئے علوم کی تخلیق کا ذریعہ بھی ہے۔ علمی کتب، تحقیقی مقالے، اور نصابی مواد زبان کی مدد سے تیار کیے جاتے ہیں، اور یہی زبان ان علوم کو دنیا بھر میں پھیلانے میں مددگار ہوتی ہے۔ جدید دور میں ٹیکنالوجی اور بین الاقوامی رابطوں نے زبان کی اہمیت کو مزید بڑھا دیا ہے، کیونکہ آج تعلیمی میدان میں مختلف زبانوں میں مہارت حاصل کرنا ترقی کے نئے دروازے کھولتا ہے۔

زبان نہ صرف علم کے حصول کا ذریعہ ہے بلکہ یہ تعلیم کو زندگی کے عملی میدانوں میں نافذ کرنے کا وسیلہ بھی ہے۔ یہ فرد کی شخصیت کو نکھارتی ہے، اس کی سوچ کو وسعت دیتی ہے، اور اسے ایک ذمہ دار اور باشعور شہری بننے میں مدد دیتی ہے۔ تعلیم اور زبان ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں، اور زبان کا تحفظ اور اس کا درست استعمال تعلیمی ارتقاء کے لیے لازمی ہے۔

استعماری طاقتیں اور زبان:

زبان سامراجی طاقتوں کے لیے ایک مؤثر ہتھیار رہی ہے، کیونکہ اس کے ذریعے وہ نہ صرف اپنے غلبے کو قائم رکھتی ہیں بلکہ نوآبادیاتی معاشروں کے سماجی، ثقافتی، اور تعلیمی نظام پر بھی گہرے اثرات ڈالتی ہیں۔ نوآبادیاتی دور میں سامراجی طاقتوں نے مقامی زبانوں کو پس پشت ڈال کر اپنی زبانوں کو نافذ کیا، جس سے ان زبانوں نے علم، حکومت، اور تجارت میں مرکزی حیثیت حاصل کر لی۔ اس عمل نے مقامی ثقافتوں کو کمزور کرنے اور مقامی لوگوں کی شناخت کو مٹانے میں اہم کردار ادا کیا۔

سامراجی طاقتیں آج بھی زبان کو ایک ذریعہ بنا کر نوآبادیاتی ورثے کو برقرار رکھتی ہیں۔ سابقہ نوآبادیاتی علاقوں میں سامراجی زبانیں جیسے انگریزی اور فرانسیسی، اب بھی تعلیمی، اقتصادی، اور سیاسی ترقی کے لیے لازمی سمجھی جاتی ہیں۔ ان زبانوں کو ترجیح دینے سے مقامی زبانیں اور ان سے جڑی ثقافتی وراثت حاشیے پر چلی گئی ہیں، اور مقامی لوگ اپنی شناخت کے بجائے سامراجی ثقافت کو اپنانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

زبان کے اس غلبے نے علمی پیداوار اور اظہار پر بھی گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ سامراجی زبانوں میں علمی کام کو معیار مانا جاتا ہے، جبکہ مقامی زبانوں میں کی گئی تحقیق اور علم کو کم اہمیت دی جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں مقامی آبادیوں کو اپنے ہی سماجی مسائل کو اپنی زبان میں سمجھنے اور حل کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

سامراجی طاقتوں نے زبان کے ذریعے اقتصادی غلبے کو بھی برقرار رکھا ہے۔ بین الاقوامی تجارت اور ٹیکنالوجی میں انگریزی اور دیگر سامراجی زبانوں کی ضرورت نے مقامی زبان بولنے والوں کو عالمی معیشت سے الگ تھلگ کر دیا ہے۔ اس عمل نے زبان کو نہ صرف مواصلات کا ذریعہ بلکہ اقتصادی طاقت اور سماجی حیثیت کا پیمانہ بھی بنا دیا ہے۔

زبان کی اس سیاست نے عالمی سطح پر طاقت کے عدم توازن کو بڑھایا ہے، جہاں سامراجی زبانیں ترقی کی علامت بن گئی ہیں اور مقامی زبانیں زوال کا شکار ہو رہی ہیں۔ مقامی زبانوں کے تحفظ اور ان کی ترویج کے بغیر سامراجی طاقتوں کے اثرات کو کم کرنے کے ممکن نہیں۔ زبان کو آزادی اور خودمختاری کا ذریعہ بنایا جانا چاہیے تاکہ مقامی قومیں اپنی ثقافت، شناخت، اور علم پر فخر محسوس کر سکیں اور ان کے ذریعے ترقی کے راستے خود ہموار کر سکیں۔

مرکزی زبان اور دیگر علاقائی زبانیں:

مرکزی زبان اور دیگر علاقائی زبانوں کے درمیان ایک اہم تعلق پایا جاتا ہے جو کسی قوم کی ثقافت، شناخت، اور اتحاد کو تشکیل دینے میں کردار ادا کرتا ہے۔ مرکزی زبان عام طور پر ایک ملک میں رابطے اور افہام و تفہیم کا ذریعہ ہوتی ہے، جو مختلف لسانی اور ثقافتی پس منظر رکھنے والے افراد کو جوڑتی ہے۔ یہ قومی سطح پر تعلیم، حکومتی معاملات، اور اقتصادی سرگرمیوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے اور بین الاقوامی سطح پر ملک کی نمائندگی کا ذریعہ بھی بنتی ہے۔

دوسری جانب، علاقائی زبانیں کسی علاقے کی ثقافت، روایات، اور مقامی علم کا خزانہ ہوتی ہیں۔ یہ زبانیں مقامی افراد کی شناخت اور جذبات کی عکاسی کرتی ہیں اور ان کی روزمرہ زندگی کا حصہ ہوتی ہیں۔ علاقائی زبانیں نہ صرف مقامی تاریخ اور ادب کو محفوظ رکھنے میں مددگار ہیں بلکہ ایک مخصوص علاقے کی تہذیبی وراثت کو بھی زندہ رکھتی ہیں۔

مرکزی زبان اور علاقائی زبانوں کے درمیان ایک متوازن رشتہ ہونا ضروری ہے تاکہ کسی بھی زبان یا ثقافت کو حاشیے پر نہ دھکیلا جائے۔ اگر مرکزی زبان کو زیادہ فوقیت دی جائے اور علاقائی زبانوں کو نظر انداز کیا جائے تو یہ لسانی اور ثقافتی تعصب کا سبب بن سکتا ہے، جو قوم کے اتحاد کو کمزور کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس، اگر علاقائی زبانوں کو ان کے مناسب دائرے میں فروغ دیا جائے اور ان کا احترام کیا جائے تو یہ مقامی ثقافتوں کو مضبوط بنانے کے ساتھ ساتھ مرکزی زبان کو بھی تقویت پہنچا سکتی ہیں۔

مرکزی زبان اور علاقائی زبانوں کو ایک دوسرے کا حریف سمجھنے کے بجائے ایک دوسرے کا تکمیل کرنے والا سمجھنا چاہیے۔ تعلیم، میڈیا، اور حکومتی پالیسیوں میں ایسے اقدامات کیے جانے چاہئیں جو مرکزی زبان کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانوں کی بقا اور ترقی کو یقینی بنائیں۔ یہ رویہ نہ صرف قوم کے اتحاد کو مضبوط کرے گا بلکہ اس کی ثقافتی اور لسانی وراثت کو بھی محفوظ رکھے گا۔

قومی زبان قرار دیئے جانے کی خصوصیات:

کسی زبان کو قومی زبان قرار دیے جانے کے لیے اس میں کئی خصوصیات اور شرائط ہونی چاہئیں جو اسے ایک قوم یا ملک کی شناخت کا حصہ بناتی ہیں۔ سب سے پہلے، قومی زبان وہ زبان ہوتی ہے جو ایک وسیع عوامی سطح پر بولی جاتی ہو اور جس کا استعمال معاشرتی، ثقافتی، تعلیمی، اور حکومتی معاملات میں عام ہو۔ یہ زبان ایک قوم کے اتحاد کا علامت بن جاتی ہے اور اس کا استعمال مختلف علاقے، گروہ، اور فرقوں کے افراد کو ایک دوسرے سے جوڑتا ہے۔

دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ قومی زبان ایک مخصوص قوم کی تاریخ، ثقافت، اور روایات کی عکاسی کرتی ہے۔ اس زبان کے ذریعے قوم اپنے جذبات، عقائد، اور تشخص کو ظاہر کرتی ہے، اور یہ ایک قوم کی اجتماعی یادداشت اور تہذیب کا حصہ بن جاتی ہے۔ اگر زبان کسی خاص علاقے یا قوم کے مذہبی اور ثقافتی پس منظر سے جڑی ہوئی ہو، تو اس کا قومی زبان بننا اس قوم کی شناخت اور تاریخ کو مزید مستحکم کرتا ہے۔

مزید برآں، قومی زبان میں وہ صلاحیت بھی ہونی چاہیے کہ وہ علم، حکمت، اور تہذیبی ورثہ کو محفوظ اور منتقل کرنے کا ذریعہ بنے۔ اس زبان میں اتنی فصاحت اور وسعت ہونی چاہیے کہ وہ مختلف شعبوں میں مؤثر طریقے سے اظہارِ خیال کر سکے، چاہے وہ تعلیم، ادب، سائنسی تحقیق، یا حکومتی اداروں کی کارکردگی ہو۔ اگر زبان میں یہ خصوصیات موجود ہوں، تو وہ نہ

صرف عوامی زندگی میں اہم کردار ادا کرتی ہے بلکہ قومی ترقی اور معاشی استحکام میں بھی معاون ثابت ہوتی ہے۔

ایک قومی زبان میں یہ صلاحیت بھی ہونی چاہیے کہ وہ مختلف لسانی گروپوں کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پرلانے کا کام کرے۔ اس کا مقصد زبانوں کے اختلافات کے باوجود ایک قوم کے اندر اتحاد اور ہم آہنگی پیدا کرنا ہوتا ہے۔ ایک قومی زبان کو اس طرح سے اپنانا ضروری ہے کہ یہ عوامی سطح پر ہر فرد تک پہنچ سکے اور اسے سمجھنا اور بولنا آسان ہو۔

مختصر یہ کہ قومی زبان کی خصوصیات میں اس کا عوامی سطح پر قبولیت، ثقافتی نمائندگی، علمی اور حکومتی اہمیت، اور مختلف گروپوں کے درمیان اتحاد کے فروغ کی صلاحیت شامل ہوتی ہے۔ یہ زبان نہ صرف بات چیت کا وسیلہ بناتی ہے بلکہ ایک قوم کے تشخص اور ترقی کا اہم جزو بھی ہوتی ہے۔

عقل، عمل اور وحی

مغرب کی جدیدیت سے مراد وہ فکری، سماجی، اور ثقافتی تحریک ہے جو نشاۃ ثانیہ اور روشن خیالی کے ادوار سے شروع ہوئی اور اس کا مقصد مذہب اور روایت کو انسانی زندگی کے مرکز سے ہٹاکر عقل، تجربے، اور سائنسی تحقیق کو بنیاد بنانا تھا۔ اس تحریک کا بنیادی دعویٰ یہ تھا کہ انسانی ترقی اور خوشحالی کے لیے مذہب کی ضرورت نہیں، بلکہ انسانی عقل اور سائنسی پیشرفت کافی ہے۔ اس کے نتیجے میں مغربی معاشروں میں ایسے نظریات پروان چڑھے جنہوں نے مذہب کو ذاتی اور غیر معاشرتی دائرے میں محدود کر دیا، اور اخلاقیات کو بھی ذاتی ترجیحات تک محدود کر دیا گیا۔

اس جدیدیت کا ایک پہلو یہ تھا کہ ہر قسم کی روایات اور اقدار کو پرکھا جائے اور ان پر سوال اٹھایا جائے۔ اس عمل نے بہت سے سماجی اور اخلاقی معیارات کو کمزور کر دیا۔ مغربی جدیدیت کے تحت آزادی کو ایک بنیادی اصول قرار دیا گیا، لیکن یہ آزادی اکثر بے راہ روی، انفرادیت پسندی، اور اخلاقی حدود سے آزاد ہونے کے مترادف ہو گئی۔ جنسی آزادی کے نام پر فحش مواد کی ترغیب اور LGBT تحریک کو سماجی قبولیت دلانے کی کوششیں اسی سوچ کا نتیجہ ہیں۔ ان رجحانات نے مغربی معاشروں میں اخلاقی انحطاط کو فروغ دیا اور خاندان جیسے بنیادی ادارے کو کمزور کیا۔

جدیدیت کے اس تصور نے مذہب کو ایک رکاوٹ کے طور پر پیش کیا، یہ دعویٰ کرتے ہوئے کہ مذہبی اصول انسان کی فکری اور معاشرتی ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ نتیجتاً، عوام کو مذہب سے دور کرنے کے لیے آزادی اور ترقی کے نام پر ایسے نظریات کو فروغ دیا گیا جو بظاہر پرکشش لیکن حقیقت میں دھوکہ تھے۔

یہ رویہ دراصل ایک گہری فکری بحران کی عکاسی کرتا ہے، کیونکہ مذہب کو محض ایک پرانی روایت کے طور پر رد کرنا انسانی فطرت اور روحانی ضروریات کو نظرانداز کرنے کے مترادف ہے۔ مذہب، بالخصوص اسلام، نہ صرف اخلاقی اصولوں کی بنیاد فراہم کرتا ہے بلکہ ایک ایسا نظام زندگی پیش کرتا ہے جو انسانی فلاح و بہبود اور معاشرتی ترقی دونوں کو ہم آہنگ کرتا ہے۔ مغربی جدیدیت کی یہ خامی ہے کہ اس نے انسان کو صرف مادی ترقی کا پجاری بنا دیا اور روحانی و اخلاقی پہلو کو تقریباً نظرانداز کر دیا۔

مغرب کی جدیدیت ایک ایسی تحریک ہے جس کا مقصد انسانی زندگی سے مذہب اور روایت کے اثرات کو ختم کرکے عقل، تجربے، اور سائنسی تحقیق کو محور بنانا تھا۔ اس کے پیچھے یہ دعویٰ تھا کہ انسانی ترقی اور خوشحالی کے لیے مذہب کی ضرورت نہیں، بلکہ صرف عقل اور سائنسی پیشرفت کافی ہیں۔ لیکن اگر اس تصور کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ اس کے کئی بنیادی مفروضے خود تشیع کی تعلیمات کے ساتھ ہم آہنگ ہیں، لیکن ان میں ایک اہم فرق ہے۔ تشیع عقل، تجربے، اور سائنسی تحقیق کو تسلیم کرتا ہے، مگر ان کی

محدودیت کو بھی واضح کرتا ہے، اور یہ بات بیان کرتا ہے کہ ہر چیز عقل اور تجربے کے دائرے میں نہیں آسکتی۔

تشیع کی تعلیمات کا مرکز عقل ہے، جیسا کہ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: "عقل ہی دین کا ستون ہے، اور اسی کے ذریعے انسان اپنے رب کو پہچانتا ہے۔" تشیع نہ صرف عقل کے استعمال کی دعوت دیتا ہے بلکہ سائنس اور تجربے کو بھی دین کے فہم اور عمل کا حصہ بناتا ہے۔ تاہم، یہ مکتب یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ انسانی عقل محدود ہے اور تمام حقائق کو مکمل طور پر سمجھنے سے قاصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تشیع وحی کو عقل کے لیے رہنما سمجھتا ہے، کیونکہ وحی انسانی فہم کی حدود سے آگے کی رہنمائی فراہم کرتی ہے۔

یہ حقیقت سائنس کے میدان میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر، گوڈیل کے تھیورم نے یہ ثابت کیا کہ کسی بھی منطقی نظام میں ایسے حقائق موجود ہوتے ہیں جو اس نظام کے اندر رہتے ہوئے ثابت نہیں کیے جاسکتے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سائنس اور منطق اپنی حدود رکھتی ہیں اور ہر چیز کو ان کے دائرے میں لانا ممکن نہیں۔ مزید برآں، جدید سائنسدانوں اور فلسفیوں نے بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ مابعد الطبیعات انسانی زندگی کا ایک لازمی پہلو ہے۔ مثال کے طور پر، سائنس اس بات کی وضاحت نہیں کر سکتی کہ کائنات کی ابتدا کیوں ہوئی یا انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ یہ سوالات صرف مذہب اور وحی کے ذریعے سمجھ میں آسکتے ہیں۔

تشیع کی منفرد خصوصیت یہ ہے کہ یہ عقل، سائنس، اور وحی کے درمیان ایک متوازن تعلق قائم کرتا ہے۔ تشیع سائنس کی اہمیت کو قبول کرتا ہے اور تحقیق کو فروغ دیتا ہے، لیکن یہ بھی واضح کرتا ہے کہ سائنس صرف مادی حقائق تک محدود ہے۔ جہاں سائنس خاموش ہو جاتی ہے، وہاں وحی انسان کو رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تشیع ہر دور میں جدیدیت کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی صلاحیت رکھتا ہے، کیونکہ یہ نہ صرف عقل کو اہمیت دیتا ہے بلکہ اس کے حدود کو بھی پہچانتا ہے۔

لہذا، مغربی جدیدیت کے برعکس، جو مذہب کو غیر ضروری سمجھتی ہے، تشیع ایک ایسا متوازن نظام پیش کرتا ہے جو عقل، تجربے، سائنس، اور وحی کو ہم آہنگ کرتا ہے۔ یہ مکتب انسان کو یہ شعور دیتا ہے کہ تمام سچائیاں عقل و تجربے کے ذریعے حاصل نہیں کی جا سکتیں، بلکہ وحی اور مابعد الطبیعات بھی انسانی فہم کے لیے ناگزیر ہیں۔ اس طرح تشیع ایک جامع اور پائیدار نظام حیات پیش کرتا ہے جو نہ صرف مادی ترقی کو فروغ دیتا ہے بلکہ روحانی اور اخلاقی ترقی کو بھی ممکن بناتا ہے۔

دشمنی و دوستی، اصولوں کی بنیاد پر

آج کے دور میں امریکہ، مغربی دنیا، اور صہیونیت سے ہماری دشمنی کوئی ذاتی عناد یا اختلاف پر مبنی نہیں ہے بلکہ یہ ایک اصولی اور نظریاتی دشمنی ہے جو اسلام کے حقیقی پیغام اور مقصد سے جڑی ہوئی ہے۔ یہ اقوام اپنی دنیا پرستی، گناہوں کے فروغ، الحاد، اور شرک کے پھیلاؤ کا سبب بنی ہوئی ہیں۔ ان کے اعمال اور نظریات کسی حادثاتی یا انفرادی رویے کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک منظم اور باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت انجام دیے جا رہے ہیں، جس کا مقصد انسانی معاشرت کو اخلاقی اور روحانی تباہی کی طرف دھکیلنا ہے۔ یہی ان کی وہ روش ہے جو انہیں ہمارا دشمن بناتی ہے۔

ان اقوام کا طرزِ حیات قرآن کے احکامات اور معصومینؑ کی سیرت سے براہِ راست متصادم ہے۔ قرآن ہمیں تقویٰ، عدل، اور خدا کی بندگی کا درس دیتا ہے جبکہ یہ اقوام انسانوں کو دنیا پرستی، نفس پرستی، اور گناہ کی جانب مائل کرتی ہیں۔ معصومینؑ نے ہمیں اللہ کی حاکمیت، بندگی، اور انسانی فلاح کے راستے پر چلنے کی تعلیم دی، جبکہ یہ طاقتیں انسانوں کو اللہ سے دور کرنے کے لیے الحاد اور شرک کو فروغ دے رہی ہیں۔ یہ تنازع محض ایک سیاسی یا جغرافیائی مسئلہ نہیں بلکہ اخلاقی اور نظریاتی جنگ ہے جو انسانی بقا اور خدا کے دین کی بالادستی کے لیے لڑی جا رہی ہے۔

اسی لیے ہم پر لازم ہے کہ نہ صرف ان اقوام کے ظاہری مظالم کو پہچانیں بلکہ ان کے اندرونی مقاصد اور منصوبوں کو بھی سمجھیں۔ ان کا اصل مقصد انسان کو اس کے حقیقی مقصدِ حیات یعنی اللہ کی بندگی سے دور کرنا اور دنیاوی مفادات کو زندگی کا محور بنانا ہے۔ جو کوئی بھی اس طرزِ فکر کو اپناتا ہے، خواہ وہ فرد ہو، گروہ ہو، یا کوئی تنظیم، وہ درحقیقت انہی دشمنوں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ بھی گناہ، دنیا پرستی، اور الحاد کے فروغ میں معاون ثابت ہو رہا ہے۔

اسی اصول کی بنیاد پر ہمارا دوست وہی ہو سکتا ہے جو ان دشمن طاقتوں کے نظریات اور کردار کا مخالف ہو۔ ہمارا دوست وہ ہو گا جو عدل و انصاف، اخلاقی قدروں، اور خدا کی بندگی کو اپنائے اور ان مخالف صفات کا حامل ہو جنہیں یہ طاغوتی طاقتیں فروغ دیتی ہیں۔ یہ دوستی اور دشمنی قرآن کے اصولوں کے مطابق ہے، جہاں اللہ نے فرمایا کہ تمہارے دوست وہی ہو سکتے ہیں جو اللہ، اس کے رسولؐ، اور مؤمنین کے قریب ہوں اور دشمن وہی ہیں جو ان کے مخالف ہیں۔

ہمیں اس بات کو سمجھنا ہو گا کہ یہ دشمنی ایک شعوری عمل ہے، جو اس وقت تک جاری رہے گا جب تک دنیا پرستی اور خدا کی بندگی کے درمیان یہ نظریاتی جنگ موجود ہے۔ اس جدوجہد میں ہمارا کردار انبیاء اور معصومینؑ کے راستے کو اپنانا اور ان ظالم طاقتوں کے خلاف کھڑا ہونا ہے تاکہ دنیا میں عدل و انصاف کا قیام ممکن ہو اور انسانیت کو اس کے حقیقی مقصد سے آشنا کیا جا سکے۔

اگر کوئی بھی ملک یا قوم، چاہے وہ چین ہو، روس ہو، ایران ہو یا سعودی عرب، ان صفات کا حامل ہو جو دنیا پرستی، گناہوں کے فروغ، الحاد اور شرک کے پھیلاؤ سے جڑی ہوئی ہیں یا ان ایجنڈوں کو تقویت دینے میں معاون ہو، تو وہ بھی ہمارے اصولی اور نظریاتی دشمن ہونے چاہیے۔ یہ اصول کسی مخصوص قوم یا علاقے تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک عمومی اور قرآن و سنت کی روشنی میں طے شدہ معیار ہے۔ دشمنی کا یہ تصور محض جغرافیائی حدود یا سیاسی مفادات تک محدود نہیں بلکہ اس کا تعلق ان نظریات اور اعمال سے ہے جو انسانی فطرت اور اسلام کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہیں۔

چین، روس، ایران یا سعودی عرب جیسے ممالک اگر ظاہری طور پر اسلامی یا غیر اسلامی نظریات کے حامل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ان کے عمل دنیا پرستی، اخلاقی زوال، ظلم یا گناہ کے فروغ کا باعث بنتے ہیں، تو وہ بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ مثال کے طور پر، اگر کوئی ملک اپنے مفادات کے لیے دیگر اقوام پر ظلم کرتا ہے، دوسروں کے وسائل کو لوٹتا ہے، یا ایسے نظریات کو فروغ دیتا ہے جو انسان کو اللہ کی بندگی سے دور کرتے ہیں، تو ان کا شمار بھی انہی طاقتوں میں ہو گا جو قرآن کے معیار کے مطابق ظالم اور سرکش ہیں۔

اسی طرح اگر کوئی اسلامی ملک، جیسا کہ ایران یا سعودی عرب، خود کو دین کی نمائندگی کرنے والا ظاہر کرے لیکن اپنے عمل میں قرآن و سنت سے انحراف کرے، دنیاوی مفادات کو دین پر ترجیح دے، یا اپنے سیاسی مقاصد کے تحت ظلم اور ناانصافی کا راستہ اپنائے،

تو وہ بھی ہمارے دشمن کے زمرے میں آئے گا۔ اس لیے کسی بھی قوم کی دشمنی یا دوستی کو مذہبی یا سیاسی دعووں کے بجائے ان کے حقیقی اعمال اور کردار کی بنیاد پر جانچنا ضروری ہے۔

یہ اصول ہمیں قرآن اور معصومینؑ کی تعلیمات سے ملتا ہے، جہاں ظالموں اور مفسدوں کے ساتھ دشمنی کو ایمان کا تقاضا قرار دیا گیا ہے۔ اللہ کا فرمان ہے کہ "اور جو لوگ کفر کے سرغنہ ہیں، ان سے جنگ کرو کیونکہ وہی فساد کی جڑ ہیں۔" لہذا کسی بھی قوم یا گروہ کی ظاہری حیثیت کو نہیں بلکہ اس کے کردار اور عمل کو معیار بنانا چاہیے۔ اگر ان کے اعمال ظلم، گناہ، یا انسانیت کو اللہ سے دور کرنے کا باعث بنتے ہیں، تو ان کے ساتھ مخالفت کرنا ہمارے دینی فرائض میں شامل ہے۔

یہی اصول دوستی کے لیے بھی ہے۔ ہمارا دوست وہی ہو سکتا ہے جو عدل و انصاف، تقویٰ، اور اللہ کی بندگی کے اصولوں پر عمل پیرا ہو۔ لہذا، دشمنی یا دوستی کو کسی قوم یا ملک کے مذہب، سیاسی نظام، یا جغرافیائی حیثیت کے بجائے ان کے حقیقی رویے اور کردار کی بنیاد پر پرکھنا چاہیے۔ یہ وہ فطری اور اسلامی معیار ہے جس پر ہمیں اپنے فیصلے قائم کرنے چاہییں۔

ہماری جنگ اور ہماری دوستی دونوں کا معیار اصول ہیں، نہ کہ شخصیات یا شخصی وابستگیاں۔ ہم شخصیت پرستی کے قائل نہیں ہیں کیونکہ یہ ایک ایسے رویے کو جنم دیتی ہے جو انصاف اور حق کے بنیادی اصولوں کے خلاف جاتا ہے۔ ہمارا ایمان اصولوں اور ان اعلیٰ صفات پر مبنی ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے برگزیدہ انبیاء و ائمہ (ع) میں پائی جانی چاہییں۔ اگر ہم اللہ کو خدا

مانتے ہیں، تو اس کی ذات اور اس کے اوصاف کی بنیاد پر اس کو تسلیم کرتے ہیں جو خالق کائنات کی شان کے مطابق ہیں۔ اسی طرح، اگر ہم انبیاء و ائمہ کو مانتے ہیں، تو انہیں ان اصولوں اور صفات کی روشنی میں دیکھتے ہیں جو ایک نبی یا امام کی شخصیت میں ہونی چاہییں۔

ہماری دوستی اور دشمنی کا معیار یہی اصول ہیں، جنہیں عقل اور دانش کی کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے۔ ہم ان لوگوں کو دوست سمجھتے ہیں جو تقویٰ، پرہیز گاری، توحید، عدل، رسالت اور امامت جیسے اصولوں کو اپناتے ہیں اور اپنی زندگی میں ان کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کے کردار میں دنیا پرستی، حرص، یا کسی بھی قسم کی ناپاکی کا شائبہ نہ ہو۔ ہمارا تعلق ان لوگوں سے ہے جو دنیاوی مفادات سے بالاتر ہو کر حق کی سربلندی کے لیے جدوجہد کرتے ہیں، چاہے اس راستے میں انہیں کیسی ہی مشکلات کا سامنا کیوں نہ ہو۔

حق پرستی کا دعویٰ کرنے والے ہر شخص کو ہم حق پرست نہیں مانتے، بلکہ اس کے کردار، اس کی نجی زندگی، اور آزمائش و نعمتوں کی فراوانی کے لمحات میں اس کے عمل سے اسے پہچانتے ہیں۔ مشکل حالات اور آسودگی میں انسان کا اصل چہرہ سامنے آتا ہے، اور وہی لمحات بتاتے ہیں کہ آیا کوئی شخص واقعی حق کا پیروکار ہے یا صرف ظاہری دعوے کر رہا ہے۔ اگر اس کے اعمال اور رویے حق کے اصولوں کے مطابق ہیں، تو وہ حق پرست ہے، ورنہ وہ باطل پرستوں کے زمرے میں آتا ہے۔

حق اور باطل کے درمیان یہ فرق انتہائی اہم ہے کیونکہ یہ وہ معیار ہے جو ہمیں قرآن اور معصومینؑ کی تعلیمات سے ملتا ہے۔ ہمیں سکھایا گیا ہے کہ کسی بھی شخص کی شخصیت کے بجائے اس کے اصولوں اور اعمال کو دیکھیں۔ اگر اس کی زندگی عدل، تقویٰ، اور توحید کے اصولوں کے مطابق ہے، تو وہ ہماری دوستی کا حقدار ہے۔ لیکن اگر اس کے کردار میں دنیا پرستی، ظلم، یا گناہ کی ترویج نظر آتی ہے، تو وہ ہمارے لیے دشمن کے زمرے میں آتا ہے۔

یہی اصول ہماری اجتماعی اور انفرادی زندگی کے لیے رہنما ہیں۔ دوستی یا دشمنی کے فیصلے ذاتی مفادات یا جذبات کے تحت نہیں بلکہ ان اصولوں کی بنیاد پر ہونے چاہییں جو دین اسلام نے ہمارے لیے طے کیے ہیں۔ ان اصولوں کی پاسداری ہی ہمیں حق پرستی کے اصل راستے پر گامزن کر سکتی ہے اور ہمیں اللہ کے قریب لے جا سکتی ہے۔

امام زمانہؑ کے دشمنوں پر لعنت

آج کے دور میں یہ سوال بے حد اہمیت کا حامل ہے کہ امام زمانہؑ کے حقیقی دشمن کون ہیں۔ ہمیں یہ سمجھنا ہو گا کہ ہم نے اسلام کو صرف 1400 سال پہلے کے تاریخی واقعات اور عقائد میں قید کرر کھا ہے، جبکہ اسلام ایک زندہ دین ہے جو ہر دور میں انسانیت کی رہنمائی کے لیے آیا ہے۔ ہم امام حسینؑ کے دشمنوں پر لعنت بھیجنے میں بہت مستعد ہیں، یزید اور شمر کو ہر مجلس میں یاد کرتے ہیں اور ان پر نفرین کرتے ہیں، لیکن موجودہ دور کے ظالموں کے خلاف ہمارا رویہ مختلف کیوں ہے؟ امریکہ اور اسرائیل جیسے استعمار کے سرغنوں پر لعنت بھیجنے سے ہم کیوں گریز کرتے ہیں؟

اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم یزید و شمر کو عقیدتی دشمن سمجھتے ہیں جبکہ امریکہ اور صہیونیت کو محض سیاسی دشمن کے طور پر دیکھتے ہیں۔ یہ فرق ہمیں غفلت میں ڈال دیتا ہے، حالانکہ قرآن اور سنت ہمیں ہر قسم کے ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ آج اگر امام زمانہؑ ظہور فرمائیں تو ان کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی صہیونی طاقتیں ہوں گی جو دنیا بھر میں فساد اور ظلم کی جڑ بنی ہوئی ہیں۔ یہ وہی طاقتیں ہیں جو فلسطین میں مظلوموں پر ظلم ڈھارہی ہیں، مسلم ممالک کو کمزور کرنے کی سازشوں میں مصروف ہیں، اور دنیا بھر میں عدل و انصاف کے قیام میں رکاوٹ بن رہی ہیں۔

خدا قرآن میں واضح طور پر حکم دیتا ہے کہ کفر کے سر غنوں سے جنگ کرو اور ان کو شکست دو، کیونکہ وہی فساد کے اصل ذمہ دار ہیں۔ آج کے دور میں یہ کفر کے سر غنہ صہیونی طاقتیں ہیں، جنہوں نے نہ صرف امریکہ کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے بلکہ پوری دنیا کو اپنے استعماری پنجوں میں جکڑ رکھا ہے۔ ان کے اثر و رسوخ سے عالمی سیاست، معیشت، اور ثقافت زہر آلود ہو چکی ہے۔

ہمیں یہ سمجھنا ہو گا کہ اگر ہم واقعی امام حسینؑ کی قربانی کو یاد کرتے ہیں اور ان کے مشن کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں موجودہ دور کے یزید یعنی صہیونی استعمار کے خلاف عملی اقدام اٹھانا ہو گا۔ یہ وقت صرف مجلسوں میں بیٹھ کر پرانے دشمنوں پر لعنت کرنے کا نہیں بلکہ موجودہ دشمن کے خلاف بیدار ہونے اور عملی جدوجہد کرنے کا ہے۔ اگر ہم آج کے حقیقی دشمن کو پہچاننے میں ناکام رہتے ہیں تو امام زمانہؑ کے ظہور کے لیے تیار ہونے کا دعویٰ محض ایک فریب ہو گا۔ خدا کی نصرت اور امام کی رضا انہی لوگوں کے ساتھ ہے جو ظلم کے خلاف ڈٹ جائیں اور عدل کے قیام کے لیے ہر ممکن کوشش کریں۔

اعمال پر عقائد کے اثرات

انسان کے عقائد اور اس کے منتخب کردہ آئیڈیلز یا جہان بینی کا اس کی زندگی پر گہرا اثر ہوتا ہے، کیونکہ یہ اس کے اعمال، رویوں، اور فیصلہ سازی کے بنیادی محرکات فراہم کرتے ہیں۔ انسان جسے مقدس یا قابلِ تقلید سمجھتا ہے، اس کی تعلیمات اور کردار کو اپنی زندگی میں اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک شخص کے آئیڈیلز اور عقائد اس کی شخصیت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، اور یہ عمل نہ صرف انفرادی سطح پر بلکہ معاشرتی سطح پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

اگر ایک انسان یزید جیسے کردار کو اپنا آئیڈیل بناتا ہے، تو اس کی زندگی میں یزید کی صفات، جیسے ظلم، جبر، اور ہوسِ اقتدار، نمایاں ہونے لگتی ہیں۔ وہ اپنے ذاتی مفادات کے لیے دوسروں کے حقوق کو پامال کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرے گا اور اپنی کامیابی کے لیے غیر اخلاقی یا غیر انسانی ذرائع استعمال کرے گا۔ یزید کے کردار کی تقلید کرنے والے افراد میں عموماً غرور، خود غرضی، اور اقتدار کی اندھی خواہش نمایاں ہوتی ہے، جو نہ صرف ان کی ذاتی زندگی بلکہ معاشرے پر بھی منفی اثر ڈالتی ہے۔

اس کے برعکس، اگر کوئی انسان حضرت امام حسینؑ کو اپنا آئیڈیل مانتا ہے، تو اس کی زندگی میں حق، صداقت، اور قربانی کے اصول جھلکتے ہیں۔ امام حسینؑ کی تعلیمات میں عدل، انسانی

وقار، اور خدا کی رضا کے لیے قربانی شامل ہے۔ جو شخص ان صفات کو اختیار کرتا ہے، وہ ظلم کے خلاف کھڑا ہوتا ہے اور اپنی ذاتی خواہشات پر اجتماعی فلاح کو ترجیح دیتا ہے۔ امام حسینؑ کا کردار ایسے انسانوں کی رہنمائی کرتا ہے جو معاشرتی انصاف کے قیام اور انسانیت کی خدمت کے لیے خود کو وقف کر دیتے ہیں۔

اسی طرح، اگر کوئی ابراہام لنکن جیسے کردار کو اپنا آئیڈیل مانتا ہے، تو اس کی زندگی میں آزادی، مساوات، اور انسانیت کے اصول جھلکتے ہیں۔ لنکن کی زندگی غلامی کے خلاف جدوجہد اور انصاف کے قیام کی ایک مثال ہے، اور ان سے عقیدت رکھنے والا شخص انہی اصولوں پر عمل کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ اپنے ارد گرد کے لوگوں کے ساتھ انصاف اور ہمدردی کا رویہ اپنائے گا اور سماجی مساوات کو فروغ دینے میں کردار ادا کرے گا۔

یہ بات واضح ہے کہ انسان کے آئیڈیلز اس کی زندگی کی سمت کا تعین کرتے ہیں اور اس کے اعمال میں ان کے اثرات نظر آتے ہیں۔ ایک معاشرہ جس کے افراد بلند اخلاقی اصولوں پر قائم شخصیتوں کو اپنا آئیڈیل بناتے ہیں، وہ ترقی، امن، اور انصاف کی جانب بڑھتا ہے، جبکہ وہ معاشرہ جس کے افراد غلط کرداروں کی تقلید کرتے ہیں، ظلم، بے انصافی، اور انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب لوگوں نے نیک اور عادل رہنماؤں کی پیروی کی، تو ان کے اعمال نے دنیا کو ایک بہتر جگہ بنایا، لیکن جب انہوں نے ظالم اور جابر حکمرانوں کو اپنا آئیڈیل بنایا، تو ظلم اور تباہی کا راج قائم ہوا۔ اس لیے انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے

آئیڈیلز کو احتیاط سے منتخب کرے، کیونکہ انہی کی بنیاد پر اس کی زندگی کے اعمال اور کردار کی تعمیر ہوتی ہے۔

اسلامی حکومت کے ممکنہ مخالفین

ایک اچھی، عادل و منصف اسلامی حکومت جو عوام کے حقوق کی پاسداری کرتی ہو اور وسائل کی عادلانہ تقسیم کو یقینی بناتی ہو، اس کے ممکنہ مخالفین مختلف طبقات سے ہوسکتے ہیں۔ ان میں وہ لوگ شامل ہوسکتے ہیں جو ذاتی مفادات کو اجتماعی بھلائی پر ترجیح دیتے ہیں، جیسے وہ افراد یا گروہ جو موجودہ غیر منصفانہ نظام سے فائدہ اٹھا رہے ہوں اور اس کی تبدیلی کو اپنے مفادات کے لیے نقصان دہ سمجھتے ہوں۔ ایسے سرمایہ دار یا جاگیر دار طبقے جو وسائل کی غیر مساوی تقسیم سے فائدہ اٹھاتے ہیں، ایک عادلانہ نظام کے نفاذ سے خود کو خطرے میں محسوس کرسکتے ہیں۔ بعض سیاسی عناصر جو طاقت یا اختیار کو اپنے ذاتی یا جماعتی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں، وہ بھی ایسی حکومت کے خلاف ہوسکتے ہیں کیونکہ ان کے غیر عادلانہ اقدامات کی روک تھام ان کے اقتدار کے لیے چیلنج بن سکتی ہے۔

مزید برآں، وہ نظریاتی مخالفین جو اسلامی اصولوں یا تعلیمات کو قبول نہیں کرتے یا ان پر اعتراضات اٹھاتے ہیں، وہ بھی اس نظام کے نفاذ میں رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کرسکتے ہیں۔ بیرونی عناصر، جیسے وہ ممالک یا تنظیمیں جو اسلامی حکومت کے قیام کو اپنے جغرافیائی یا سیاسی مفادات کے خلاف سمجھتے ہیں، بھی مخالفت کرسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ، بعض لوگ جو غلط فہمیوں یا لاعلمی کی وجہ سے اسلامی نظام کے بارے میں تحفظات رکھتے ہوں، وہ بھی

مخالفت کی صف میں شامل ہو سکتے ہیں، حالانکہ ان کے اعتراضات کا ازالہ تعلیم اور مکالمے کے ذریعے ممکن ہے۔

اسی طرح، معاشرے کے وہ افراد یا گروہ جو تبدیلی سے خوفزدہ ہوں یا نئے نظام کو اپنانے کے لیے تیار نہ ہوں، وہ بھی ایک اچھی اسلامی حکومت کی مخالفت کر سکتے ہیں۔ ان تمام ممکنہ مخالفین کا مقابلہ تدبر، حکمت، اور عادلانہ رویے کے ذریعے کیا جا سکتا ہے تاکہ اسلامی اصولوں کی برتری کو عملی طور پر ثابت کیا جا سکے۔

صہیونی استعمار کو اسلام سے کئی بنیادی خطرات لاحق ہیں، کیونکہ اسلام ایک جامع نظام حیات پیش کرتا ہے جو ہر قسم کی ظلم و جبر، ناانصافی، اور غاصبانہ تسلط کی مخالفت کرتا ہے۔ صہیونی استعمار اپنی بنیاد ایسے نظریات اور عملی اقدامات پر رکھتا ہے جو دوسروں کے حقوق غصب کرنے، زمین پر قبضہ جمانے، اور ظلم کے ذریعے اپنی بالادستی قائم رکھنے پر مبنی ہیں۔ اسلام ان تمام چیزوں کی سختی سے مذمت کرتا ہے اور ایک عادلانہ معاشرے کے قیام کا درس دیتا ہے جہاں ہر فرد کے حقوق محفوظ ہوں اور وسائل منصفانہ طور پر تقسیم ہوں۔

اسلام، دنیا بھر کے مسلمانوں کو امت واحدہ کا تصور دیتا ہے، جس کا مطلب ہے کہ تمام مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں اور کسی بھی جگہ پر ظلم یا استحصال کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ یہ اتحاد اور یکجہتی صہیونی استعمار کے لیے ایک بڑا خطرہ ہے، کیونکہ اس سے ان کی تقسیم اور حکمرانی کی پالیسی کو چیلنج ملتا ہے۔ مزید برآں، اسلام ظلم کے خلاف

جدوجہد، جہاد، اور مظلوموں کی حمایت کی تعلیم دیتا ہے، جو صہیونی مظالم کے خلاف مزاحمت کو مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے۔

اسلامی تعلیمات صرف صہیونی استعمار کی نظریاتی بنیادوں کو ہی چیلنج نہیں کرتیں بلکہ فلسطین جیسے مقبوضہ علاقوں کی آزادی اور وہاں کے عوام کے حقوق کی بحالی کا بھی مطالبہ کرتی ہیں۔ اسلامی بیداری کی تحریکیں، جو لوگوں کو ان کے حقوق اور ذمہ داریوں کے بارے میں شعور دیتی ہیں، صہیونی استعمار کے لیے ایک مسلسل خطرہ ہیں کیونکہ یہ ان کے تسلط کو کمزور کرتی ہیں۔

اس کے علاوہ، اسلام دنیا کے تمام انسانوں کو عدل، مساوات، اور بھائی چارے کی دعوت دیتا ہے، جو صہیونی نظریات کی بنیاد پر موجود نسلی تعصب اور برتری کے تصور کو براہ راست مسترد کرتا ہے۔ یہ تعلیمات ایک ایسے عالمی نظام کے قیام کی طرف رہنمائی کرتی ہیں جو ظلم، استحصال، اور غاصبانہ قبضے کی ہر شکل کے خلاف ہے، اور یہی بات صہیونی استعمار کے وجود کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔

صہیونی استعمار کو بزنس، معاشیات، اور فنانس میں اسلامی نظام سے کئی خطرات لاحق ہیں، کیونکہ اسلامی نظام ان بنیادوں کو چیلنج کرتا ہے جن پر صہیونی معیشت اور مالیاتی ڈھانچہ قائم ہے۔ سب سے پہلے، اسلامی اصول سود کو حرام قرار دیتے ہیں، جبکہ صہیونی استعمار کا موجودہ مالیاتی نظام سود پر مبنی ہے۔ سودی نظام کے ذریعے دولت کا ارتکاز چند ہاتھوں میں ہوتا ہے،

اور غریب ممالک کو قرضوں کے جال میں پھنسا کر ان کی معیشت کو کمزور کیا جاتا ہے۔ اسلامی نظام سود کے خاتمے کے ذریعے اس غیر منصفانہ ڈھانچے کو جڑ سے اکھاڑ سکتا ہے، جو صہیونی معیشت کے لیے ایک بڑا چیلنج ہے۔

اسلامی نظام دولت کی منصفانہ تقسیم پر زور دیتا ہے، جسے زکوۃ، صدقات، اور انفاق کے ذریعے عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس، صہیونی سرمایہ دارانہ نظام دولت کو ایک محدود طبقے میں مرکوز رکھتا ہے، جس سے سماجی اور اقتصادی عدم مساوات پیدا ہوتی ہے۔ اسلامی نظام معاشرے کے تمام افراد کے لیے اقتصادی انصاف کو یقینی بناتا ہے اور اس استحصالی ڈھانچے کو ختم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جو صہیونی مفادات کی بنیاد ہے۔

صہیونی استعمار اپنی معیشت کو استحصالی تجارتی پالیسیوں، غیر منصفانہ معاہدوں، اور قرضوں کے جال پر قائم رکھتا ہے، جو ترقی پذیر ممالک کو مالیاتی غلامی میں دھکیل دیتا ہے۔ اسلامی مالیاتی نظام ان تمام استحصالی پالیسیوں کو رد کرتا ہے اور ایسی تجارت کی حمایت کرتا ہے جو باہمی فائدے اور انصاف پر مبنی ہو۔ مزید بر آں، اسلامی اصول غیر اخلاقی تجارت، جیسے سودی سرمایہ کاری، شراب، جوئے، اور اسلحے کی غیر قانونی تجارت کو مسترد کرتے ہیں، جو صہیونی معیشت کے اہم ستون ہیں۔ ان غیر اخلاقی ذرائع کا خاتمہ ان کے مالیاتی مفادات کے لیے ایک بڑا خطرہ بن سکتا ہے۔

اسلامی نظام خود کفالت اور مقامی معیشت کو ترقی دینے پر زور دیتا ہے، جو ترقی پذیر ممالک کو صہیونی معاشی تسلط سے آزاد کر سکتا ہے۔ یہ نظام مقامی وسائل کے استعمال اور شفاف تجارتی عمل کو فروغ دیتا ہے، جس سے کرپشن اور مالیاتی منڈیوں میں دھوکہ دہی کا خاتمہ ہوتا ہے۔ صہیونی مالیاتی ڈھانچے کی بنیاد غیر شفافیت اور استحصالی ہتھکنڈوں پر ہے، جو اسلامی اصولوں کے نفاذ کے ساتھ کمزور پڑ سکتی ہے۔

مختصراً، اسلامی معاشی نظام صہیونی استعمار کے اس غیر منصفانہ اور استحصالی مالیاتی ڈھانچے کے لیے ایک حقیقی خطرہ ہے جس پر ان کی بالادستی قائم ہے۔ یہ نظام دنیا کے مظلوم اقوام کو انصاف، خود مختاری، اور ترقی کے مواقع فراہم کرتا ہے اور استعماری تسلط سے آزادی کا راستہ دکھاتا ہے۔

اسلام دشمن صہیونی استعمار

صہیونی استعمار کو اسلام سے کئی بنیادی خطرات لاحق ہیں، کیونکہ اسلام ایک جامع نظام حیات پیش کرتا ہے جو ہر قسم کی ظلم و جبر، ناانصافی، اور غاصبانہ تسلط کی مخالفت کرتا ہے۔ صہیونی استعمار اپنی بنیاد ایسے نظریات اور عملی اقدامات پر رکھتا ہے جو دوسروں کے حقوق غصب کرنے، زمین پر قبضہ جمانے، اور ظلم کے ذریعے اپنی بالادستی قائم رکھنے پر مبنی ہیں۔ اسلام ان تمام چیزوں کی سختی سے مذمت کرتا ہے اور ایک عادلانہ معاشرے کے قیام کا درس دیتا ہے جہاں ہر فرد کے حقوق محفوظ ہوں اور وسائل منصفانہ طور پر تقسیم ہوں۔

اسلام، دنیا بھر کے مسلمانوں کو امت واحدہ کا تصور دیتا ہے، جس کا مطلب ہے کہ تمام مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں اور کسی بھی جگہ پر ظلم یا استحصال کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ یہ اتحاد اور یکجہتی صہیونی استعمار کے لیے ایک بڑا خطرہ ہے، کیونکہ اس سے ان کی تقسیم اور حکمرانی کی پالیسی کو چیلنج ملتا ہے۔ مزید بر آں، اسلام ظلم کے خلاف جدوجہد، جہاد، اور مظلوموں کی حمایت کی تعلیم دیتا ہے، جو صہیونی مظالم کے خلاف مزاحمت کو مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے۔

اسلامی تعلیمات صرف صہیونی استعمار کی نظریاتی بنیادوں کو ہی چیلنج نہیں کرتیں بلکہ فلسطین جیسے مقبوضہ علاقوں کی آزادی اور وہاں کے عوام کے حقوق کی بحالی کا بھی مطالبہ کرتی ہیں۔

اسلامی بیداری کی تحریکیں، جو لوگوں کو ان کے حقوق اور ذمہ داریوں کے بارے میں شعور دیتی ہیں، صہیونی استعمار کے لیے ایک مسلسل خطرہ ہیں کیونکہ یہ ان کے تسلط کو کمزور کرتی ہیں۔

اس کے علاوہ، اسلام دنیا کے تمام انسانوں کو عدل، مساوات، اور بھائی چارے کی دعوت دیتا ہے، جو صہیونی نظریات کی بنیاد پر موجود نسلی تعصب اور برتری کے تصور کو براہ راست مسترد کرتا ہے۔ یہ تعلیمات ایک ایسے عالمی نظام کے قیام کی طرف رہنمائی کرتی ہیں جو ظلم، استحصال، اور غاصبانہ قبضے کی ہر شکل کے خلاف ہے، اور یہی بات صہیونی استعمار کے وجود کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔

صہیونی استعمار کو بزنس، معاشیات، اور فنانس میں اسلامی نظام سے کئی خطرات لاحق ہیں، کیونکہ اسلامی نظام ان بنیادوں کو چیلنج کرتا ہے جن پر صہیونی معیشت اور مالیاتی ڈھانچہ قائم ہے۔ سب سے پہلے، اسلامی اصول سود کو حرام قرار دیتے ہیں، جبکہ صہیونی استعمار کا موجودہ مالیاتی نظام سود پر مبنی ہے۔ سودی نظام کے ذریعے دولت کا ارتکاز چند ہاتھوں میں ہوتا ہے، اور غریب ممالک کو قرضوں کے جال میں پھنسا کر ان کی معیشت کو کمزور کیا جاتا ہے۔ اسلامی نظام سود کے خاتمے کے ذریعے اس غیر منصفانہ ڈھانچے کو جڑ سے اکھاڑ سکتا ہے، جو صہیونی معیشت کے لیے ایک بڑا چیلنج ہے۔

اسلامی نظام دولت کی منصفانہ تقسیم پر زور دیتا ہے، جیسے زکوۃ، صدقات، اور انفاق کے ذریعے عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس، صہیونی سرمایہ دارانہ نظام دولت کو ایک محدود طبقے میں مرکوز رکھتا ہے، جس سے سماجی اور اقتصادی عدم مساوات پیدا ہوتی ہے۔ اسلامی نظام معاشرے کے تمام افراد کے لیے اقتصادی انصاف کو یقینی بناتا ہے اور اس استحصالی ڈھانچے کو ختم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جو صہیونی مفادات کی بنیاد ہے۔

صہیونی استعمار اپنی معیشت کو استحصالی تجارتی پالیسیوں، غیر منصفانہ معاہدوں، اور قرضوں کے جال پر قائم رکھتا ہے، جو ترقی پذیر ممالک کو مالیاتی غلامی میں دھکیل دیتا ہے۔ اسلامی مالیاتی نظام ان تمام استحصالی پالیسیوں کو رد کرتا ہے اور ایسی تجارت کی حمایت کرتا ہے جو باہمی فائدے اور انصاف پر مبنی ہو۔ مزید برآں، اسلامی اصول غیر اخلاقی تجارت، جیسے سودی سرمایہ کاری، شراب، جوئے، اور اسلحے کی غیر قانونی تجارت کو مسترد کرتے ہیں، جو صہیونی معیشت کے اہم ستون ہیں۔ ان غیر اخلاقی ذرائع کا خاتمہ ان کے مالیاتی مفادات کے لیے ایک بڑا خطرہ بن سکتا ہے۔

اسلامی نظام خود کفالت اور مقامی معیشت کو ترقی دینے پر زور دیتا ہے، جو ترقی پذیر ممالک کو صہیونی معاشی تسلط سے آزاد کر سکتا ہے۔ یہ نظام مقامی وسائل کے استعمال اور شفاف تجارتی عمل کو فروغ دیتا ہے، جس سے کرپشن اور مالیاتی منڈیوں میں دھوکہ دہی کا خاتمہ ہوتا ہے۔ صہیونی مالیاتی ڈھانچے کی بنیاد غیر شفافیت اور استحصالی ہتھکنڈوں پر ہے، جو اسلامی اصولوں کے نفاذ کے ساتھ کمزور پڑ سکتی ہے۔

مختصراً، اسلامی معاشی نظام صہیونی استعمار کے اس غیر منصفانہ اور استحصالی مالیاتی ڈھانچے کے لیے ایک حقیقی خطرہ ہے جس پر ان کی بالادستی قائم ہے۔ یہ نظام دنیا کے مظلوم اقوام کو انصاف، خود مختاری، اور ترقی کے مواقع فراہم کرتا ہے اور استعماری تسلط سے آزادی کا راستہ دکھاتا ہے۔

مغربی جدیدیت اور تشیع

مغرب کی جدیدیت سے مراد وہ فکری، سماجی، اور ثقافتی تحریک ہے جو نشاۃ ثانیہ اور روشن خیالی کے ادوار سے شروع ہوئی اور اس کا مقصد مذہب اور روایت کو انسانی زندگی کے مرکز سے ہٹا کر عقل، تجربے، اور سائنسی تحقیق کو بنیاد بنانا تھا۔ اس تحریک کا بنیادی دعویٰ یہ تھا کہ انسانی ترقی اور خوشحالی کے لیے مذہب کی ضرورت نہیں، بلکہ انسانی عقل اور سائنسی پیشرفت کافی ہے۔ اس کے نتیجے میں مغربی معاشروں میں ایسے نظریات پروان چڑھے جنہوں نے مذہب کو ذاتی اور غیر معاشرتی دائرے میں محدود کر دیا، اور اخلاقیات کو بھی ذاتی ترجیحات تک محدود کر دیا گیا۔

اس جدیدیت کا ایک پہلو یہ تھا کہ ہر قسم کی روایات اور اقدار کو پرکھا جائے اور ان پر سوال اٹھایا جائے۔ اس عمل نے بہت سے سماجی اور اخلاقی معیارات کو کمزور کر دیا۔ مغربی جدیدیت کے تحت آزادی کو ایک بنیادی اصول قرار دیا گیا، لیکن یہ آزادی اکثر بے راہ روی، انفرادیت پسندی، اور اخلاقی حدود سے آزاد ہونے کے مترادف ہو گئی۔ جنسی آزادی کے نام پر فحش مواد کی ترغیب اور LGBT تحریک کو سماجی قبولیت دلانے کی کوششیں اسی سوچ کا نتیجہ ہیں۔ ان رجحانات نے مغربی معاشروں میں اخلاقی انحطاط کو فروغ دیا اور خاندان جیسے بنیادی ادارے کو کمزور کیا۔

جدیدیت کے اس تصور نے مذہب کو ایک رکاوٹ کے طور پر پیش کیا، یہ دعویٰ کرتے ہوئے کہ مذہبی اصول انسان کی فکری اور معاشرتی ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ نتیجتاً، عوام کو مذہب سے دور کرنے کے لیے آزادی اور ترقی کے نام پر ایسے نظریات کو فروغ دیا گیا جو بظاہر پرکشش لیکن حقیقت میں دھوکہ تھے۔

یہ رویہ دراصل ایک گہری فکری بحران کی عکاسی کرتا ہے، کیونکہ مذہب کو محض ایک پرانی روایت کے طور پر رد کرنا انسانی فطرت اور روحانی ضروریات کو نظرانداز کرنے کے مترادف ہے۔ مذہب، بالخصوص اسلام، نہ صرف اخلاقی اصولوں کی بنیاد فراہم کرتا ہے بلکہ ایک ایسا نظام زندگی پیش کرتا ہے جو انسانی فلاح و بہبود اور معاشرتی ترقی دونوں کو ہم آہنگ کرتا ہے۔ مغربی جدیدیت کی یہ خامی ہے کہ اس نے انسان کو صرف مادی ترقی کا پجاری بنادیا اور روحانی و اخلاقی پہلو کو تقریباً نظرانداز کر دیا۔

مغرب کی جدیدیت ایک ایسی تحریک ہے جس کا مقصد انسانی زندگی سے مذہب اور روایت کے اثرات کو ختم کرکے عقل، تجربے، اور سائنسی تحقیق کو محور بنانا تھا۔ اس کے پیچھے یہ دعویٰ تھا کہ انسانی ترقی اور خوشحالی کے لیے مذہب کی ضرورت نہیں، بلکہ صرف عقل اور سائنسی پیشرفت کافی ہیں۔ لیکن اگر اس تصور کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ اس کے کئی بنیادی مفروضے خود تشیع کی تعلیمات کے ساتھ ہم آہنگ ہیں، لیکن ان میں ایک اہم فرق ہے۔ تشیع عقل، تجربے، اور سائنسی تحقیق کو تسلیم کرتا ہے، مگر ان کی

محدودیت کو بھی واضح کرتا ہے، اور یہ بات بیان کرتا ہے کہ ہر چیز عقل اور تجربے کے دائرے میں نہیں آسکتی۔

تشیع کی تعلیمات کا مرکز عقل ہے، جیسا کہ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: "عقل ہی دین کا ستون ہے، اور اسی کے ذریعے انسان اپنے رب کو پہچانتا ہے۔" تشیع نہ صرف عقل کے استعمال کی دعوت دیتا ہے بلکہ سائنس اور تجربے کو بھی دین کے فہم اور عمل کا حصہ بناتا ہے۔ تاہم، یہ مکتب یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ انسانی عقل محدود ہے اور تمام حقائق کو مکمل طور پر سمجھنے سے قاصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تشیع وحی کو عقل کے لیے رہنما سمجھتا ہے، کیونکہ وحی انسانی فہم کی حدود سے آگے کی رہنمائی فراہم کرتی ہے۔

یہ حقیقت سائنس کے میدان میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر، گوڈیل کے تھیورم نے یہ ثابت کیا کہ کسی بھی منطقی نظام میں ایسے حقائق موجود ہوتے ہیں جو اس نظام کے اندر رہتے ہوئے ثابت نہیں کیے جاسکتے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سائنس اور منطق اپنی حدود رکھتی ہیں اور ہر چیز کو ان کے دائرے میں لانا ممکن نہیں۔ مزید برآں، جدید سائنسدانوں اور فلسفیوں نے بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ مابعد الطبیعات انسانی زندگی کا ایک لازمی پہلو ہے۔ مثال کے طور پر، سائنس اس بات کی وضاحت نہیں کر سکتی کہ کائنات کی ابتدا کیوں ہوئی یا انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ یہ سوالات صرف مذہب اور وحی کے ذریعے سمجھ میں آسکتے ہیں۔

تشیع کی منفرد خصوصیت یہ ہے کہ یہ عقل، سائنس، اور وحی کے درمیان ایک متوازن تعلق قائم کرتا ہے۔ تشیع سائنس کی اہمیت کو قبول کرتا ہے اور تحقیق کو فروغ دیتا ہے، لیکن یہ بھی واضح کرتا ہے کہ سائنس صرف مادی حقائق تک محدود ہے۔ جہاں سائنس خاموش ہو جاتی ہے، وہاں وحی انسان کو رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تشیع ہر دور میں جدیدیت کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی صلاحیت رکھتا ہے، کیونکہ یہ نہ صرف عقل کو اہمیت دیتا ہے بلکہ اس کے حدود کو بھی پہچانتا ہے۔

لہذا، مغربی جدیدیت کے برعکس، جو مذہب کو غیر ضروری سمجھتی ہے، تشیع ایک ایسا متوازن نظام پیش کرتا ہے جو عقل، تجربے، سائنس، اور وحی کو ہم آہنگ کرتا ہے۔ یہ مکتب انسان کو یہ شعور دیتا ہے کہ تمام سچائیاں عقل و تجربے کے ذریعے حاصل نہیں کی جا سکتیں، بلکہ وحی اور مابعد الطبیعات بھی انسانی فہم کے لیے ناگزیر ہیں۔ اس طرح تشیع ایک جامع اور پائیدار نظام حیات پیش کرتا ہے جو نہ صرف مادی ترقی کو فروغ دیتا ہے بلکہ روحانی اور اخلاقی ترقی کو بھی ممکن بناتا ہے۔

اتحاد بین المذاہب اور شیعہ نکتہ نظر

اتحاد بین المذاہب ایک ایسا موضوع ہے جس کی اہمیت عصر حاضر میں خاص طور پر اجاگر ہو رہی ہے، اور شیعہ انقلابی نقطہ نظر میں یہ ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ فکر امام علی (ع) کے عدل پر مبنی نظام اور امام حسین (ع) کی قربانی کے آفاقی پیغام پر استوار ہے، جو حق و انصاف کے قیام اور انسانی وقار کی بحالی کو ہر قسم کے اتحاد کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق، اتحاد کا مقصد مختلف مذاہب کے عقائد کو یکجا کرنا یا اختلافات کو مٹانا نہیں بلکہ مشترکہ انسانی اقدار کے تحت مظلوموں کی حمایت اور ظالموں کے خلاف جدوجہد کو مضبوط بنانا ہے۔

شیعہ انقلابی نقطہ نظر قرآن مجید کی تعلیمات سے رہنمائی لیتا ہے، جہاں اہلِ کتاب کو اس بات کی دعوت دی گئی ہے کہ وہ ایک مشترکہ کلمہ پر اکٹھے ہوں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" : تعالوا إلى كلمة سواء بيننا وبينكم أن لا نعبد إلا الله ولا نشرك به شيئاً "(آل عمران :64)۔ اس آیت مبارکہ میں اتحاد کی بنیاد توحید، انصاف اور باہمی احترام پر رکھی گئی ہے، اور تمام انسانوں کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ اللہ کی بندگی میں شریک ہو کر معاشرتی بہتری کے لیے کام کریں۔

اتحاد بین المذاہب کے دائرہ کار کو شیعہ انقلابی فکر اس حد تک محدود رکھتی ہے جہاں یہ دینِ اسلام کی حرمت اور اصولوں پر اثر انداز نہ ہو۔ امام خمینیؒ کے مطابق مذاہب کے درمیان

اتحاد کا مقصد طاغوتی نظاموں کے خلاف ایک مؤثر قوت بنانا ہے، جہاں ہر مذہب اپنی شناخت اور مقدسات کے ساتھ برقرار رہتے ہوئے مظلوموں کے لیے جدوجہد کرے اور ظالموں کے خلاف مشترکہ کوششیں کرے۔ یہ بات واضح ہے کہ انٹرفیتھ ڈائیلاگ اور اتحاد تبھی ممکن ہیں جب ان کا مقصد حق و صداقت کو اجاگر کرنا اور انسانی وقار کو فروغ دینا ہو۔

شیعہ نقطہ نظر کے مطابق، انٹرفیتھ ڈائیلاگ میں ہر مذہب کے عقائد، شعائر اور مقدسات کا احترام لازم ہے۔ امام علی (ع) کا فرمان "کونوا للظالم خصماً وللمظلوم عوناً" یعنی ظالم کے دشمن اور مظلوم کے مددگار بنو، اتحاد بین المذاہب کے لیے ایک بنیادی اصول فراہم کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مختلف مذاہب کے ماننے والے اپنے عقائد کے ساتھ رہتے ہوئے ظلم و استحصال کے خلاف متحد ہو سکتے ہیں۔

امام حسین (ع) کی قربانی کے پیغام کو بھی اس حوالے سے رہنما سمجھا جاتا ہے، کیونکہ کربلا کا واقعہ ظلم کے خلاف کھڑے ہونے اور مظلوموں کے حقوق کے لیے قربانی دینے کی ایک لازوال مثال ہے۔ اس پیغام کو مرکز بنا کر تمام مذاہب کے ماننے والوں کو ایک مشترکہ انسانی رشتے میں باندھا جا سکتا ہے، جہاں ہر فرد ایک دوسرے کا ساتھ دے کر انصاف اور امن کے قیام کے لیے کام کرے۔

اتحاد بین المذاہب اور انٹر فیتھ ڈائیلاگ ایک ایسا ذریعہ فراہم کرتے ہیں جس کے ذریعے مختلف مذاہب کے ماننے والے ایک دوسرے کے قریب آ سکتے ہیں اور مشترکہ چیلنجز کا سامنا کر سکتے ہیں۔ یہ پلیٹ فارم اس وقت مؤثر ہو سکتا ہے جب یہ صداقت، انصاف اور انسانی وقار جیسے اصولوں پر قائم ہو اور اس کا مقصد ظالموں کی مخالفت اور مظلوموں کی حمایت ہو۔ شیعہ انقلابی نقطہ نظر اس بات کی بھی تاکید کرتا ہے کہ اتحاد کے اس عمل میں ہر مذہب اپنی انفرادیت اور شناخت کے ساتھ برقرار رہے، لیکن ظلم کے خاتمے اور انسانی معاشرے کی بہتری کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ کھڑا ہو۔

لہٰذا، اتحاد بین المذاہب کا یہ تصور نہ صرف مذاہب کے ماننے والوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے بلکہ انسانیت کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے ایک مضبوط بنیاد بھی فراہم کرتا ہے، جہاں ہر فرد حق، انصاف اور امن کے فروغ کے لیے اپنا کردار ادا کر سکے۔

فقیہ کی حکومت

ولایت فقیہ کا لفظی معنی فقیہ کی حکومت ہے۔

اس سے پہلے کی اس بات کی تشریح کریں، ہمیں ایک اور حقیقت کا پتہ ہونا ضروری ہے۔

وہ یہ ہے کہ حکومت کسے کہتے ہیں؟

حکومت سے مراد، یعنی انسانوں اور معاشرے کا فیصلہ کرنے والا طبقہ۔

یعنی کسی بھی مخصوص ہدف تک پہنچنے کیلئے انسان نے کیا کرنا ہے، اور کیا نہیں کرنا یہ جو ادارہ طے کرتا ہے اور انسان کو مجبور کرتا ہے کہ ان امور کی بنیاد پر زندگی گزارے۔ اس ادارے کا نام حکومت ہے۔ اس طرح سے کہ کسی خاص ہدف کے تحت حکومت قوانین سازی کرتی ہے کہ کیا کرنا ہے کیا نہیں ہر حکومت کا خاصہ ہوتا ہے اور جب معاشرے کا کوئی طبقہ اسے نہ مانے تو دوسرے اکثریت کی فلاح کی خاطر اس اقلیت پر ان قوانین کو جبراً نافذ کرتی ہے۔

لہذا یہ تاریخ میں بھی اور جدید دور میں ہر حکومت کا طریقہ کار ہے۔

جو معاشرے کا فیصلہ کرتا ہے۔

مثلا آپ نے یہ کرنا ہے اور یہ نہیں کرنا یہ دونوں ہی حکومت کو طے کرنا ہے۔

لہذا معاشرے میں تمام انسان مستقیم طور پر یا غیر مستقیم طور پر حکومت کے تابع ہوتے ہیں۔

کونسا مال درآمد یا برآمد کرنا ہے۔ آپ نے گاڑی کتنی رفتار میں چلانا ہے؟ گاڑی کس سمت میں چلانا ہے۔ گاڑی کے شیشے کو کالا رکھنا ہے یا نہیں۔ ننگا ہو کر باہر آنا ہے یا نہیں؟
آپ کو پیسہ کمانے کا کون ذریعہ اپنانا ہے، گھر آپ کی ملکیت ہو تو کیا شرائط ہیں، کتنا پیسہ ٹیکس کے طور پر دینا ہے؟ آپ نے موبائل میں کس کس سائٹس یا ایپس کو دیکھنا ہے یا کونسے ایپس بند کرنا ہے؟
اسکول میں کیا پڑھنا اور کیا نہیں پڑھنا۔ کس سے جنسی رابطہ کرنا ہے اور کس سے نہیں؟ وغیرہ وغیرہ
غرض ایک معاشرے کے زندگی کے تمام یا اکثر امور حکومت ہی طے کرتی ہے۔ اور معاشرے کو منظم کرتی ہے۔
لہذا آپ کی زندگی کے اکثر فیصلے آپ کی حکومت کے زیر اثر ہوتے ہیں۔
پہلے فیصلہ کرتی ہے کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا، پھر ان پر نظارت بھی کرتی ہے۔ پولیس اور عدالت کا کام ہی یہی ہے کہ حکومت کے بنائے ہوئے قوانین پر چلاو گرنہ جیل یا زندان آپ کے منتظر ہیں۔
یہ حکومت ہے۔
اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس حق کی بنیاد پر ایک حکومت آپ کی اجتماعی، سیاسی، اقتصادی، بین الاقوامی یا دیگر فیصلے کرے؟
حق و حقوق کے تعین کی بنیاد اسلامی دنیا میں فقط خدا ہے۔
اسلامی منطق کے تحت انسان کی زندگی گزارنے کیلئے فیصلے کا حق فقط خدا کو حاصل ہے۔ یعنی خدا کی طرف سے جن افراد کو حکومت بنانے کا اختیار دیا گیا ہے ان کے علاوہ جس کی بھی

حکومت ہوگی وہ باطل ہوگی اور غیر خدا کی حکومت کہلائے گی۔ اس مورد میں ایک تائید خدا کی طرف سے اور دوسری تائید عوام الناس کی طرف سے ضروری ہے، عوام الناس کی تائید اس لئے ضروری ہے تاکہ معاشرے کے دانشمند افراد خود سے اپنے ارادے سے اس بات کو باور کرتے ہوئے کہ خدا کے علاوہ ہر نظام گمراہی اور زوال کی ابتداء ہوتا ہے خواہ دنیا میں زوال یا آخرت میں۔ نیز خدا کے قوانین میں انسان کی مرضی کے خلاف اس پر قوانین لاگو کرنا حرام مگر کچھ شرائط کے ساتھ انتخاب کرتے ہیں، لہذا جب تک عوام الناس خود سے خدائی نمائندے کو انتخاب نہیں کرتی ایسی حکومت مشروع تو ہوتی ہے مگر قابل عمل نہیں ہوتی کیونکہ جب تک عوام الناس میں اپنی فلاح کی خاطر خدا سے عشق کے نتیجے میں خدا کے قوانین سے محبت اور کمال سے محبت نہیں پیدا ہوتی وہ ایسی حکومت کو انتخاب نہیں کریں گے۔ لہذا عقائد کی طرح اس حکومت کا نظری مرحلہ یہی ہے کہ پہلے عوام میں اس حکومت کی مقبولیت پیدا کی جائے، اسی لئے آپ دیکھتے ہیں کہ ائمہ معصومینؑ نے خدا کی طرف سے منصوب ہونے کے باوجود بھی چونکہ نظری مرحلے سے عوام کلئیر نہیں ہوئی تھی جبری حکومت نافذ نہیں کی، امام علیؑ سے لیکر امام حسن عسکریؑ تک تمام کی یہی روش رہی، لہذا فقیہ عادل بھی اس شرط پر عمل کرنے کا پابند ہے۔

لہذا قرآن، حدیث در حقیقت انسانی زندگی کے قوانین کے منابع ہیں، جن کے ذریعے انسان نے زندگی گزارنی ہے۔

البتہ ایک تیسرا منبع انسانی عقل ہے۔

انسان نے کیا کھانا ہے، کیا نہیں کھانا؟ کیا پہننا ہے؟ کہاں بیٹھنا ہے؟ سونا جاگنا، اٹھنا بیٹھنا، اجتماعی زندگی میں تعلقات کا نظام۔ تعلقات کا تعین، مثبت تعلقات منفی تعلقات،

سیاسی نظام میں حکومتی ڈھانچہ، قوانین، وغیرہ سب اللہ کو حق حاصل ہے کہ فقط وہ طے کر سکتا ہے کہ ان امور میں انسان کیا کرے؟

پس قرآن سنت و عقل تین منابع ہیں جن سے انسان کی زندگی کیلئے فیصلہ ہو گا۔

خدا کا فیصلہ و خدا کی حاکمیت یعنی قرآن و حدیث کی بنیاد پر ملکی آئین بنانا اور ملکی قوانین بنانا۔

تمام اجتماعی، سیاسی، اقتصادی، عائلی و شہری قوانین قرآن و حدیث و عقل کی بنیاد پر بنائے، اس کو الہی فیصلہ و حاکمیت کہا جاتا ہے۔

پس حکومت سے مراد ان انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں فیصلہ کرنے والا ادارہ ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جب اسلامی آئیڈیالوجی کے مطابق انسان کیلئے فیصلہ کرنے و حکومت کا حق فقط خدا کے پاس ہے۔

اب اس کو نافذ کرنے کیلئے کیا کرے؟ کیا فقط تبلیغ کرے یا اس حکومتی ڈھانچے میں بھی کسی کو بھیجنے کو کوئی نظام ہے؟

یہاں پر حاکمیت الہی کیلئے فقیہ و دینی قوانین کی گہری شناخت رکھنے والے انسان کی ضرورت ہوتی ہے۔

وہ انسان جس نے انسانی زندگی کے تربیتی، انفرادی، اجتماعی، سیاسی، اقتصادی قوانین کو قرآن و سنت سے عمیق طور پر دریافت کیا ہو۔ اس انسان کی ضرورت پیش آتی ہے۔

کیونکہ قوانین خدا کو کسی ایسے انسان کے ذریعے اجراء نہیں کیا جاسکتا کہ جو قوانین خدا کی الف ب سے بھی آشنا نہ ہوں!

نہ ایسے شخص کے حوالے کیا جاسکتا جو قوانین خدا سے آشنا تو ہیں لیکن قوانین خدا کے بارے میں خیانت کرے، اور قوانین خدا کے بجائے اپنی ہوس و شہوت کی بنیاد پر حکومتی فیصلے کرے۔

لہذا اولی فقیہ عادل کا نظریہ سامنے آتا ہے۔

کیونکہ غیر عادل انسان یعنی شہوت ران، منافع خور، خود پرست، بدیانت اور خائن انسان کی حکومت ممنوع ہے۔

کیونکہ حکومت انسان کا حق نہیں۔ حکومت فقط خدا کا حق ہے۔ یعنی حکومت فقط قانون الہی کے تحت ہونا چاہئیے۔ غیر عادل انسان یعنی جس خوف خدا نہیں ہے، زاہد و متقی نہیں ہے، نفس پرست ہے۔ لہذا یہ فوراً قوانین خدا کے بجائے اپنی شخصی من مانی کرے گا۔

لہذا اس صورت میں یہ ممنوعہ حاکم بن جائے گا۔

فقیہ غیر عادل کی حکومت یعنی غیر الہی حکومت۔

لہذا فقیہ کیلئے عادل بھی ہونا ضروری ہے تا کہ الہی حکومت برقرار رہے۔

پس ولایت فقیہ (اس انسان کی حکومت جسے دین پر سب سے زیادہ عبور ہے اور عادل بھی ہے) ایک خدائی حکومت ہے۔

کیونکہ فقیہ کو ایک لحظہ بھی قانون خدا سے ہٹ کر ذاتی خواہش پر فیصلہ کرنے کا حق نہیں۔

اگر اجتماعی امور میں یا سیاسی امور میں، الہی قوانین کے بجائے ذاتی خواہش و نفس پر فیصلہ کرے تو اس کی حکومتی مشروعیت ختم ہو جاتی ہے۔

ڈکٹیٹر شپ وہاں آتا ہے جہاں ایک انسان دوسرے انسان پر اپنی مرضی چلائے اور اپنی نفسانی خواہشات کی بنا پر فیصلے کرے بجائے قرآن و حدیث کے۔ لیکن جہاں ایک انسان

ایک لحظہ بھی اپنی مرضی نہیں چلا سکتا۔ اسے ایک لحظہ بھی قران سنت و عقل سے ہٹ کر فیصلہ کرنے کی اجازت نہ ہو وہاں ڈکٹیٹر شپ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تشیع کے مطابق انسان کی حاکمیت مکمل ممنوع ہے۔ انسان انسان کیلئے قوانین نہیں بنا سکتے۔

انسان انسان پر حکومت نہیں کر سکتا۔

فقط خداوند متعال ہی قوانین بنا سکتے ہیں۔

لہذا غیبت معصوم علیہ اسلام کے وقت الہی حکومت کا تنہا راستہ ولایت فقیہ ہے۔ یعنی عادل فقیہ کی حکومت ہے۔

فقیہ کی حکومت اس جہت سے کہ وہ قانون الہی کی شناخت رکھتا ہے اور عادل ہے یعنی اس نے اپنی زندگی پر بھی قوانین الہی لاگو کیا ہوا ہو۔ اس پر شہوات و محرکات نفسانی حاکم نہ ہوں۔

پس ولایت فقیہ، الہی حکومت ہے نہ کہ کسی انسان کی حکومت۔

فقیہ خود سے، شخصی فیصلہ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ فقط قوانین الہی کی بنیاد ہی فیصلہ کریں گے۔

تشیع یہ ہے کہ بعد از پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم الہی حکومت پر امام منصوص من اللہ فائز ہے اور غیبت امام میں خصوصی یا عمومی نمائندہ امام کے پاس اقتدار ہوتا ہے جو در حقیقت حکومت امام کی ہی ہوتی ہے لیکن نمائندہ امام اگرچہ فقیہ ہوتا ہے البتہ اس میں غلطی کا امکان تو ہوتا ہے کیونکہ وہ غیر معصوم ہے اور یہ کہنا کہ فقیہ ایک لحظہ کے لیے غلطی نہیں کر سکتا یہ درست نہیں ہے۔

غیر معصوم سے غلطی کا امکان ہوتا ہے۔ کوئی بھی شیعہ مجتہد کے معصوم ہونے کا دعویٰ ہر گز نہیں کرتا۔ لیکن وہ مقام تقوی کے اعلیٰ مقام پہ فائز ہوتے ہیں جہاں عمداً گناہ سرزد نہیں ہوتا۔ بعض بزرگان فعل حرام تو دور کی بات فعل مکروہ بھی انجام نہیں دیتے۔

لہذا اس خدائی حکومت کا ہی کام ہوتا ہے کہ معاشرے انسانی کے انجن اسٹارٹ کرے اور خدائی اہداف کی طرف لے کر چلے جس میں دنیا کی سعادت کے ساتھ ساتھ اُخروی سعادت کا بھی حصول ممکن ہوسکے۔ اس دنیا کو آخرت کھیتی کے طور پر کاشت کرے اور اس مورد میں معاشرے اور حکومت کے تمام شعبے اور طبقات شامل ہیں کہ ان کی روحانی اور مادّی ترقی کیلئے یہ فقیہ عادل ایسے افراد کو تلاش کرے اور انہیں منصوب کرے جو خود خواہشات نفسانی سے دور زاہدِ دنیا ہوں، ہوس پرست نہ ہوں، بدیانت، خائن، اور دھوکہ باز نہ ہوں اور خدا کی خوشنودی کی خاطر معاشرے کے افراد کیلئے ہر لمحہ جانفشانی میں رہتے ہوں۔ حاکم کے یہ صفات صرف فقیہ سے مربوط نہیں بلکہ امام معصوم علیہ السلام بھی انہی صفات کا حامل ہوتا ہے البتہ اس کی ذمہ داریاں فقیہ عادل کے مقابلے میں زیادہ سخت ہیں اور وہ ایک غیر معصوم فقیہ کے مقابلے میں زیادہ مہربان، دلسوز، شجاع، رحیم، مفکر، مدبر وغیرہ ہوتا ہے۔

زمانہ غیبت معصومؑ میں ولایت فقیہ ہی ہے جو معصوم امامؑ کی حکومت کیلئے تیاری کرتی ہے اور معاشرہ انسانی کو معصوم امامؑ کی حکومت میں رہنے کی تربیت دیتی ہے۔

سیکھنے کا سب سے موثر ذریعہ، محسوسات یا معقولات؟!

(شہید باقر الصدر کی فکر کی توضیح و تشریح)

انسان کی تخلیق میں ایک خاص توازن پایا جاتا ہے، لیکن اس توازن میں حسی پہلو عقلانی پہلو پر غالب دکھائی دیتا ہے۔ انسان فطری طور پر ایسا مخلوق ہے جو بیرونی محرکات سے فوری اثر لیتا ہے اور اپنے جذبات و احساسات کے زیرِ اثر ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ اگرچہ انسان کی عقل اسے حقیقتوں تک رسائی دیتی ہے اور کسی نظریے یا فکر کو تسلیم کرنے میں مدد دیتی ہے، لیکن محض عقلانی تصدیق عمل کی ضمانت نہیں دیتی۔ عقل کسی نظریے کو درست تسلیم کر لینے کے باوجود انسان کو حرکت میں لانے کے لیے کافی نہیں ہوتی، جبکہ حواس خمسہ سے براہ راست درک ہونے والے محرکات انسان کو فوری طور پر متاثر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی چیز کی خوشبو، ذائقہ، یا شکل محسوس کی جائے تو اس پر ردعمل فوراً ظاہر ہوتا ہے۔ یہ انسان کی تکوینی ساخت ہے کہ وہ سب سے زیادہ ان چیزوں سے متاثر ہوتا ہے جنہیں وہ براہ راست محسوس کر سکتا ہے۔

اسی لیے انبیاء کرام کے معجزات اکثر حسی نوعیت کے ہوتے تھے، کیونکہ انسان کی اکثریت ان ہی چیزوں سے زیادہ متاثر ہوتی ہے جو اس کے حواس کے دائرے میں آتی ہیں۔ اگرچہ عقل حقیقتوں کی گہرائی تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتی ہے، لیکن یہ ایک تدریجی عمل ہے اور ہر

فرد کے لیے یکساں سطح پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ برعکس اس کے، حسی اثرات فوری اور زیادہ شدید ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب انسان کسی چیز کو دیکھتا، سنتا، سونگھتا، چھوتا یا چکھتا ہے تو وہ اس سے براہ راست اثر لیتا ہے اور اس پر ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ انسان کا جذباتی اور حسی نظام اس کے فکری و عقلی نظام سے زیادہ فعال اور تیز عمل کرتا ہے۔

اسی بنیاد پر وحی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، کیونکہ وحی انسان کے قلب پر اترتی ہے اور اس کی فطرت میں پیوست ہوتی ہے۔ عقل منطقی استدلال سے کام لیتی ہے اور حقیقتوں تک پہنچنے میں وقت لیتی ہے، جبکہ وحی براہ راست دل پر اثر انداز ہوتی ہے اور انسان کے احساسات و عواطف کو بیدار کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں وہ حقیقتیں جنہیں افلاطون، ارسطو، سقراط، بقراط اور دیگر مفکرین نے اپنی کتابوں میں سینکڑوں دلائل کے ذریعے ثابت کیا تھا، وہی حقیقتیں نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں اتار دی گئیں۔ ان علمی نکات کو خشک دلائل اور پیچیدہ براہین کے بند کتب خانوں سے نکال کر عام انسان کی زندگی کا حصہ بنا دیا گیا۔ وہ سچائیاں جو کتابوں کے صفحات میں محدود تھیں، رسول اکرم ﷺ کی دعوت اور وحی کے ذریعے لوگوں کے سینوں میں نقش ہو گئیں۔ اس طرح انسان کے لیے اعلیٰ اقدار اور اخلاقی اصول نہ صرف قابلِ فہم ہوگئے بلکہ انہیں اپنی زندگی میں اپنانا بھی آسان ہو گیا۔

یہی اصول دعوت و تبلیغ میں بھی بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر ہم صرف زبانی نصیحتیں کرنے والے، کتابیں لکھنے والے، یا محض تقاریر کرنے والے بن جائیں تو ہمارے الفاظ لوگوں کے دلوں پر گہرا اثر ڈالنے میں ناکام رہیں گے۔ محض زبانی کلمات کی رسائی کانوں تک ہی محدود رہتی ہے، جبکہ حقیقی اثر وہی بات ڈالتی ہے جو دل سے نکل کر دوسرے کے دل تک پہنچے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ محض معلومات کی ترسیل کافی نہیں، بلکہ ان الفاظ میں اثر اور روح ہونی چاہیے جو لوگوں کو ان کی اندرونی دنیا میں جھانکنے اور عمل پر آمادہ کرنے کا ذریعہ بنے۔ اگر ہمارے الفاظ میں خلوص، درد، اور صداقت ہوگی تو وہ لازمی طور پر دوسرے کے دل پر نقش ہوں گے اور اسے بدلنے کی قوت پیدا کریں گے۔ تبلیغ کا سب سے مؤثر طریقہ یہی ہے کہ انسان اپنی ذات، عمل، اور کردار کے ذریعے دوسروں کے دلوں کو موہ لے۔

یہی حقیقت ہمیں یہ سمجھاتی ہے کہ محض علم اور معلومات کا ہونا کافی نہیں، بلکہ اس علم کو جذب کرنے، اس پر عمل کرنے اور اسے دوسروں تک مؤثر طریقے سے پہنچانے کے لیے ایک خاص انداز اور عملی نمونہ درکار ہوتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جو باتیں محض الفاظ کی صورت میں کہی گئیں، وہ زیادہ دیرپا اثر نہیں چھوڑ سکیں، لیکن جو باتیں کردار، عمل اور حقیقت کا روپ دھار کر پیش کی گئیں، وہ ہمیشہ کے لیے انسانی معاشروں کا حصہ بن گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کی تعلیمات صرف علمی نکات پر مشتمل نہیں تھیں، بلکہ ان کی سیرت اور طرزِ زندگی ان کی دعوت کا سب سے بڑا ذریعہ تھی۔ وہ جو کچھ کہتے، خود اس پر پہلے عمل کرتے اور اپنے کردار سے اس کی سچائی کو ثابت کرتے۔ اسی لیے ان کی باتوں میں وہ اثر ہوتا تھا جو دلوں کو موم کر دیتا، ان کے الفاظ سننے والوں کی روح میں اتر جاتے اور ان کے نظریات و رویوں کو بدلنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

انسان کی نفسیات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی چیز صرف عقل کے دائرے میں رہتی ہے، تو وہ زیادہ تر نظریاتی اور تجریدی (abstract) حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن جب وہی چیز حواس کے ذریعے تجربے میں آتی ہے، تو وہ حقیقت میں بدل جاتی ہے۔ اسی لیے محض عقلی مباحث کسی قوم یا معاشرے کی اصلاح کے لیے کافی نہیں ہوتے، بلکہ

ایک زندہ نمونہ، ایک عملی مثال ضروری ہوتی ہے جو اس نظریے کی صداقت کو ثابت کرے۔ تاریخ میں جتنی بھی بڑی فکری اور سماجی تحریکیں کامیاب ہوئیں، ان کی کامیابی کا راز صرف ان کے نظریات کی مضبوطی میں نہیں تھا، بلکہ اس میں سب سے بڑا کردار ان رہنماؤں کے عملی کردار اور ان کے پیروکاروں کی زندگیوں میں آنے والی حقیقی تبدیلیوں کا تھا۔

یہی اصول ہر دور میں کارفرما رہا ہے اور آج بھی اگر کسی کو دعوت و تبلیغ کا کام کرنا ہے تو اسے صرف تحریر و تقریر پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اپنے عمل، اخلاق اور برتاؤ سے اس پیغام کو لوگوں کے دلوں تک پہنچانا ہو گا۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری باتیں اثر رکھیں، تو ہمیں پہلے خود ان اصولوں پر عمل کرنا ہو گا جن کی ہم تبلیغ کر رہے ہیں۔ جو باتیں ہمارے اپنے وجود کا حصہ نہیں، وہ دوسروں پر اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔ انسان کا دل سچائی کو محسوس کرتا ہے اور خلوص کے بغیر کہے گئے الفاظ، چاہے وہ کتنے ہی خوبصورت اور دلائل سے بھرپور ہوں، کسی گہرے اثر کا باعث نہیں بنتے۔

اسی اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے، ہمیں اپنے پیغام کو لوگوں کے احساسات اور جذبات سے جوڑنا ہو گا، کیونکہ لوگ محض منطقی دلائل سے نہیں، بلکہ جذباتی وابستگی اور تجربے سے سیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پیغام نے لوگوں کے قلوب کو مسخر کر لیا، کیونکہ وہ صرف عقل کو نہیں بلکہ انسان کے پورے وجود کو مخاطب کرتے تھے۔ ان کی محبت، شفقت، حسنِ سلوک اور عملی کردار نے لوگوں کو قائل کیا کہ وہ جو کہہ رہے ہیں وہی ان کی زندگی کا حقیقی اصول بھی ہے۔ یہی دعوت کا سب سے مؤثر طریقہ ہے کہ ہمارے الفاظ

محض زبان سے نہ نکلیں، بلکہ ہمارے وجود سے چھلکیں اور دوسرے کے دل میں گھر کر جائیں۔

اس فکر کے مطابق کہ انسان کی فطری نشوونما میں پہلے حسی تجربات غالب ہوتے ہیں اور پھر عقلانی شعور مستحکم ہوتا ہے۔ بچہ محسوسات کے ذریعے سیکھتا ہے اور بعد میں عقل و استدلال کی طرف مائل ہوتا ہے۔ یہ اصول صرف بچوں تک محدود نہیں بلکہ بڑے انسانوں کی تبلیغ میں بھی کارآمد ہوسکتا ہے، کیونکہ انسان کا شعور اور رویہ کسی ایک مرحلے پر رک نہیں جاتا بلکہ زندگی بھر ارتقائی مراحل سے گزرتا رہتا ہے۔ اگرچہ بالغ افراد کی عقلانی قوتیں زیادہ مضبوط ہوتی ہیں، لیکن عملی ترغیب میں حسی محرکات کی اپنی جگہ اہمیت رہتی ہے، کیونکہ جذبات اور تجربات بعض اوقات عقل پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔

یہ کہنا کہ عقلانی بنیادیں مضبوط ہو جانے کے بعد صرف استدلالی تبلیغ کارآمد ہوگی، ہمیشہ درست نہیں ہوتا۔ عملی زندگی میں لوگ اکثر نظریات کی بجائے محسوسات سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر، نماز کی فضیلت کے فلسفیانہ دلائل دینے کے بجائے اگر کوئی فرد نماز پڑھنے کی روحانی کیفیت کو محسوس کرے، یا کسی نمازی کے چہرے پر سکون و نورانیت دیکھے، تو یہ حسی تجربہ اسے عمل کی طرف زیادہ تیزی سے مائل کر سکتا ہے۔ اسی طرح، فلسفیانہ طور پر سخاوت اور ایثار کی خوبیوں پر طویل بحث کی بجائے اگر کسی کو حقیقت میں کسی کا ایثار نظر آجائے تو وہ زیادہ متاثر ہوگا۔

یہاں ایک اور اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر فلسفی نظریہ عملی طور پر نافذ بھی ہوسکتا ہے یا نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ بعض نظریات محض ذہنی مشق کے طور پر رہ جاتے ہیں اور عملی دنیا میں نافذ نہیں ہو پاتے، کیونکہ وہ انسانی فطرت یا معاشرتی حالات کے مطابق نہیں

ہوتے۔ مثال کے طور پر، مطلق جبر یا مطلق آزادی جیسے نظریات عملی دنیا میں متوازن طور پر قابلِ اطلاق نہیں ہوتے، کیونکہ انسان کی طبیعت میں آزادی اور ذمہ داری دونوں کا امتزاج ہے۔ اسی طرح، بعض فلسفیانہ نظریات انتہائی مثالی ہوتے ہیں اور ان کا حقیقی دنیا میں عملی تجربہ نہیں ملتا۔

اب یہ سوال کہ حسی امور کہاں تک مستند ہو سکتے ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ اگر محض محسوسات کی پیروی کی جائے تو انسان راہِ راست سے بھی بھٹک سکتا ہے۔ حسی کشش کا یہ مطلب نہیں کہ جو کچھ ہمیں اچھا لگے یا جو چیز ہمیں اپنی طرف کھینچے، وہ لازماً درست بھی ہو۔ مثال کے طور پر، اگر کوئی کہے کہ مجھے کسی برے فعل کی طرف کشش محسوس ہو رہی ہے، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ فعل حقیقت میں اچھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت اور عقلِ سلیم کو انسان کی رہنمائی کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے تاکہ جذباتی یا حسی کشش کے باوجود درست اور غلط کا فیصلہ صحیح بنیادوں پر کیا جا سکے۔

لہٰذا، عملی ترغیب کے لیے حسی و عقلانی دونوں پہلوؤں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ بعض مواقع پر حسی تجربہ انسان کو کسی چیز کی حقیقت سے آگاہ کر سکتا ہے، مگر اس کی حتمی توثیق کے لیے عقل اور وحی کی روشنی میں فیصلہ ضروری ہوتا ہے، تاکہ جذباتی اور سطحی رجحانات سے بچا جا سکے اور ایک متوازن اور صحیح راستہ اختیار کیا جا سکے۔

مادی یا روحانی غربت یا امارت

مادیت اور روحانیت کی حقیقت اور ان کے باہمی تعلق کو سمجھنا انسانی زندگی میں توازن اور فلاح کی کنجی ہے۔ مادیت، یعنی دنیاوی وسائل، مال و دولت، جسمانی سہولیات اور مادی ترقی، اگر حلال و حرام، جائز و ناجائز، طیب و خبیث کی حدود و قیود میں رہے تو یہی مادیت روحانیت کے رنگ میں رنگی جا سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مادی ترقی اور دنیاوی کامیابی اگر الٰہی احکام کے دائرے میں ہو، انسان اپنی دولت اور وسائل کو خیر و بھلائی کے لیے استعمال کرے، اور دنیا میں رہتے ہوئے بھی آخرت کو پیش نظر رکھے، تو یہی مادی زندگی انسان کی روحانی ترقی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اس کے برعکس، اگر روحانیت کی محض ظاہری شکل و صورت اختیار کر لی جائے لیکن اس میں حلال و حرام، جائز و ناجائز، اور طیب و خبیث کی تمیز نہ رکھی جائے، تو ایسی روحانیت حقیقت میں محض ایک دھوکہ بن جاتی ہے اور بالآخر مادیت میں بدل جاتی ہے۔ مثال کے طور پر، اگر کوئی شخص دنیا ترک کر کے زہد کا لباس پہن لے لیکن اس کے اعمال شریعت کے مطابق نہ ہوں، یا وہ اپنی روحانی ترقی کے نام پر ناجائز ذرائع اپنائے، یا ریاکاری اور دکھاوے کی روحانیت اختیار کرے، تو ایسی روحانیت در حقیقت مادیت ہی کی ایک دوسری شکل ہے۔

انسان جسم اور روح کا مرکب ہے، لیکن اس کے وجود میں سب سے زیادہ اہمیت روح کو حاصل ہے، کیونکہ یہی انسان کی حقیقت ہے اور یہی اس کے اعمال کا اصل محرک ہے۔

جسمانی فقر و امیری عارضی چیزیں ہیں، لیکن روح کی غربت یا امارت ہی اصل کامیابی یا ناکامی کی بنیاد ہے۔ اگر روح امیر ہو، یعنی ایمان، تقویٰ، اور الٰہی تعلیمات سے مزین ہو، تو مادی غربت انسان کے لیے زیادہ تنگی اور پریشانی کا باعث نہیں بنتی۔ ایسے شخص کے پاس اگر دنیاوی مال کم بھی ہو تو وہ مطمئن رہتا ہے، کیونکہ اس کی روح اللہ پر توکل اور قناعت کے نور سے مالامال ہوتی ہے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ "(سورۃ الرعد:28)

یقیناً اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جن کے دل ایمان سے منور ہوتے ہیں، وہ دنیا کی محرومیوں میں بھی سکون پاتے ہیں، اور جو اللہ سے دور ہوتے ہیں، وہ دنیاوی دولت کے باوجود اضطراب اور بے چینی میں مبتلا رہتے ہیں۔

روح کی امارت اور حقیقی غنا ایمان کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ ایمان ہی ہے جو انسان کو حقیقی اطمینان بخشتا ہے اور اسے دنیاوی مشکلات میں صبر و استقامت عطا کرتا ہے۔ اس لیے روحانی فلاح صرف اسی وقت ممکن ہے جب انسان اللہ کی تعلیمات اور اقدار سے وابستہ رہے، شریعت کی حدود کا خیال رکھے، اور اپنی مادی زندگی کو بھی دینی اصولوں کے مطابق گزارے۔ یہی وہ راستہ ہے جو انسان کو دنیا و آخرت میں کامیابی کی ضمانت دیتا ہے۔

اسلامی تعلیمات میں دنیا اور آخرت کے درمیان توازن کا درس دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللهُ إِلَيْكَ"

(القصص:77)

"اور جو کچھ اللہ نے تجھے دیا ہے، اس سے آخرت کے گھر کی تلاش کر، اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر، اور احسان کر جس طرح اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے۔"

یہ آیت اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ انسان کو دنیاوی زندگی میں بھی اپنا جائز حصہ لینا چاہیے، مگر اس کا اصل مقصد آخرت کی تیاری ہونا چاہیے۔ اگر مادیت کے ساتھ تقویٰ اور پرہیز گاری ہو، اور انسان اپنی دولت اور وسائل کو خیر اور نیکی میں خرچ کرے، تو یہی مادیت انسان کے لیے روحانی ترقی کا زینہ بن جاتی ہے۔

اگر روحانیت کی محض ایک ظاہری شکل اختیار کی جائے، مگر اس میں دین کے بنیادی اصول، جیسے کہ حلال و حرام اور طیب و خبیث کی تمیز کو نظر انداز کر دیا جائے، تو یہ حقیقی روحانیت نہیں رہتی بلکہ نفس پرستی اور دھوکہ بن جاتی ہے۔ ایسی روحانیت محض ایک نقاب بن جاتی ہے جس کے پیچھے مادہ پرستی چھپی ہوتی ہے۔

حقیقی کامیابی روحانی دولت میں ہے، کیونکہ یہی وہ حقیقت ہے جو انسان کے باطن کو روشنی عطا کرتی ہے۔ اگر انسان کی روح امیر ہو، یعنی اس میں ایمان، توکل، صبر، اور قناعت ہو، تو وہ دنیاوی تنگ دستی اور آزمائشوں میں بھی پر سکون رہتا ہے۔ امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"الغِنَى غِنَى النَّفْسِ"

"حقیقی دولت نفس کی غنا ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے قرب میں ہوتے ہیں، وہ ظاہری فقر میں بھی خوش و خرم رہتے ہیں، جبکہ مادی طور پر امیر لوگ، جن کے دل اللہ کی یاد سے خالی ہوتے ہیں، شدید بے چینی اور اضطراب کا شکار رہتے ہیں۔

پس، انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی میں مادیت اور روحانیت کے درمیان ایسا توازن قائم کرے کہ دنیا اس کے لیے آخرت کا زینہ بن جائے، اور اس کی روح حقیقی معنوں میں غنی ہو، تاکہ وہ دنیاوی مشکلات سے بے نیاز ہو کر الٰہی قرب کی لذت حاصل کر سکے۔

اللہ کے قریب لوگ جب مادی امارت حاصل کرتے ہیں تو وہ اسے محض دنیاوی کامیابی نہیں سمجھتے، بلکہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ نعمت اور آزمائش کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ان کے دل میں شکر گزاری پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنی دولت کو دوسروں کی بھلائی، خیرات اور نیک کاموں میں خرچ کرنے کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ عاجزی اور انکساری ان کی زندگی کا حصہ بن جاتی ہے، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ حقیقی امارت دل کی امارت ہے، نہ کہ صرف مال و دولت کی فراوانی۔ وہ اپنی ضروریات پوری کرتے ہیں، مگر اس کے ساتھ زہد کو اختیار کرتے ہیں، دنیا کی محبت میں گرفتار نہیں ہوتے اور ہمیشہ اپنی آخرت کی فکر رکھتے ہیں۔ ان کے لیے دولت محض ایک وسیلہ ہوتی ہے، نہ کہ مقصد، اور وہ اللہ کی رضا کو اپنی کامیابی کا معیار سمجھتے ہیں۔

اس کے برعکس، وہ لوگ جو اللہ سے دور ہوتے ہیں، جب انہیں دولت حاصل ہوتی ہے تو وہ اسے اپنی محنت اور قابلیت کا نتیجہ سمجھ کر فخر اور غرور میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان کا رویہ بدل

جاتا ہے، وہ خود کو دوسروں سے برتر محسوس کرنے لگتے ہیں اور اپنی دولت کو صرف اپنی ذات اور عیش و عشرت پر خرچ کرتے ہیں۔ ان کے دل میں بخل پیدا ہوتا ہے اور وہ دوسروں کے حقوق ادا کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ چونکہ ان کی نظر میں دنیاوی مال ہی اصل کامیابی ہوتی ہے، اس لیے وہ زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کے لیے حلال و حرام کی تمیز بھی ختم کر دیتے ہیں اور حرام ذرائع کو اختیار کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ دولت کی فراوانی انہیں اللہ کے ذکر اور عبادات سے غافل کر دیتی ہے، اور یوں ان کی روحانی حالت مزید زوال پذیر ہو جاتی ہے۔

یہ فرق ظاہر کرتا ہے کہ حقیقی کامیابی صرف دولت کے حصول میں نہیں، بلکہ اس کے صحیح استعمال میں ہے۔ جو لوگ اللہ کے قریب ہوتے ہیں، وہ مادی امارت کے باوجود عاجزی، شکر گزاری اور تقویٰ کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں، جبکہ اللہ سے دور لوگ اپنی دولت کو فخر، غرور اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ بنالیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب آزمائش آتی ہے تو اللہ کے قریب لوگ صبر اور توکل کے ساتھ حالات کا سامنا کرتے ہیں، جبکہ اللہ سے دور لوگ مایوسی اور بے چینی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اصل امارت مال و دولت کی نہیں، بلکہ روح کی ہوتی ہے، اور جو لوگ اللہ کی قربت حاصل کر لیتے ہیں، وہی حقیقی معنوں میں غنی اور کامیاب ہوتے ہیں۔

توحید باری تعالیٰ، تاریخ کے تناظر میں

"هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ" (وہی اول ہے اور وہی آخر) اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایسی جامع اور گہری صفات ہیں جو اس کی ازلیت اور ابدیت کو واضح کرتی ہیں۔ کائنات کی تاریخ کے تناظر میں ان صفات کی تشریح ایک وسیع تر فکری اور علمی پس منظر کی متقاضی ہے۔

اللہ کا "اول" ہونا اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ ہر چیز کی ابتدا سے پہلے موجود تھا، اور اس کے بغیر کسی چیز کا وجود ممکن نہیں۔ کائنات کی تخلیق سے پہلے، جب زمان و مکان کا کوئی تصور بھی نہ تھا، تب بھی اللہ موجود تھا۔ اس صفت کا مفہوم یہ ہے کہ تمام مخلوقات، چاہے وہ مادّی ہوں یا روحانی، سب کا آغاز اللہ کے حکم سے ہوا۔ قرآن مجید میں "کن فیکون" (ہو جا! پس وہ ہو گئی) کے ذریعے تخلیق کی جو حقیقت بیان کی گئی ہے، وہ اللہ کے "اول" ہونے کا ہی ایک مظہر ہے۔ سائنس کائنات کی تخلیق کے حوالے سے "بگ بینگ" جیسے نظریات پیش کرتی ہے، لیکن اسلام کا تصور یہ ہے کہ اس عظیم دھماکے سے پہلے بھی اللہ موجود تھا اور ہر شے کی ابتدا اسی کے ارادے سے ہوئی۔

اللہ کا "آخر" ہونا اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ جب سب کچھ فنا ہو جائے گا، تب بھی وہ باقی رہے گا۔ سورۃ الرحمن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے " :كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ" (جو کچھ زمین پر ہے فنا ہونے والا ہے، اور باقی رہے گا تیرے رب کا

چہرہ جو جلال اور انعام والا ہے)۔ کائنات کی موجودہ سائنسی تحقیقات یہ کہتی ہیں کہ ایک دن تمام ستارے بجھ جائیں گے، کہکشائیں تحلیل ہو جائیں گی، اور ممکنہ طور پر کائنات "ہیٹ ڈیتھ "کا شکار ہو جائے گی۔ لیکن اسلامی تعلیمات یہ بتاتی ہیں کہ جب ہر چیز فنا ہو جائے گی، تب بھی اللہ باقی رہے گا، کیونکہ وہی اصل حقیقت ہے اور اس کے سوا سب کچھ فانی ہے۔

یہ دونوں صفات درحقیقت وقت، مکان اور موجودات پر اللہ کی مکمل حاکمیت کو بیان کرتی ہیں۔ انسانی عقل محدود ہے اور وہ زمان و مکان کے دائرے سے باہر کسی چیز کا مکمل ادراک نہیں کر سکتی، لیکن اللہ تعالیٰ زمان و مکان سے ماوراء ہے۔ وہ ہر لمحے موجود تھا، ہے، اور رہے گا۔ یہی حقیقت اس کے "اول" اور "آخر "ہونے کا راز ہے۔

مزید برآں، یہ صفات ہمیں ایک روحانی پیغام بھی دیتی ہیں کہ ہمارا ہر عمل اسی کی طرف لوٹنے والا ہے۔ انسان کا سفر بھی اسی حقیقت کے تحت ہے، وہ اللہ کی تخلیق سے وجود میں آتا ہے اور اسی کے پاس واپس چلا جاتا ہے۔ لہٰذا، اگر کوئی شخص دنیا کی حقیقت کو سمجھنا چاہے تو اسے اس ابدی سچائی کو تسلیم کرنا ہو گا کہ ہر چیز اللہ سے ہے اور اسی کی طرف لوٹنے والی ہے۔

انسانی تاریخ کو اگر "هُوَ ٱلْ ۡ أَوَّلُ وَ ٱلْ ۡ آخِرُ" کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ ایک مسلسل سفر ہے جو اللہ کی ازلیت و ابدیت کے دائرے میں وقوع پذیر ہوتا رہا ہے۔ تاریخ کا آغاز درحقیقت اس لمحے سے ہوتا ہے جب اللہ نے تخلیق کا ارادہ فرمایا۔ قرآن مجید میں بیان کیا

گیا ہے کہ اللہ نے آدم (ع) کو خلق کیا، انہیں زمین پر اپنا خلیفہ بنایا، اور یوں انسانی تاریخ کا آغاز ہوا۔ یہ آغاز کسی اتفاقی حادثے کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ خدائی حکمت کے تحت ایک منظم تخلیقی منصوبے کا حصہ تھا، جہاں انسان کو ایک مقصد کے ساتھ دنیا میں بھیجا گیا۔

انسانی تہذیبوں کی ترقی وزوال کا سلسلہ بھی اسی اصول کے تابع ہے۔ قدیم اقوام، جیسے عاد، ثمود، فرعون کی سلطنتیں، اور بابل ونینویٰ کی تہذیبیں، سب اپنے وقت میں عروج پر رہیں، لیکن بالآخر فنا ہو گئیں۔ یہ سب اس حقیقت کا مظہر ہیں کہ اللہ ہی اول ہے، یعنی ہر قوم، ہر سلطنت اور ہر طاقت کا آغاز اسی کے حکم سے ہوتا ہے، اور وہی آخر ہے، یعنی جب کوئی قوم سرکشی اور ظلم میں حد سے بڑھ جاتی ہے، تو اللہ اسے ختم کر دیتا ہے۔ قرآن کی متعدد آیات میں سابقہ اقوام کے انجام کو بیان کیا گیا ہے تاکہ انسان عبرت حاصل کرے اور اس حقیقت کو تسلیم کرے کہ بقا صرف اللہ کو حاصل ہے۔

اسلامی تاریخ میں بھی یہی اصول کارفرما رہا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت نے دنیا کے تہذیبی وفکری منظرنامے کو بدل دیا۔ مکہ و مدینہ میں ایک نئی امت کی بنیاد رکھی گئی، خلافت راشدہ کا دور آیا، اسلامی علوم وتمدن کا عروج ہوا، لیکن جب مسلمان دین کے حقیقی اصولوں سے دور ہونے لگے، تو زوال کا شکار ہو گئے۔ یہ سب اس بات کی تائید کرتا ہے کہ اللہ ہی اصل بقا کا مرکز ہے، جو قوم یا فرد اس سے جُڑتا ہے، وہ باقی رہتا ہے، اور جو اس سے دور ہوتا ہے، وہ فنا کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔

جدید تاریخ میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بڑی بڑی طاقتیں، جیسے برطانیہ کی سلطنت، سوویت یونین، اور دیگر سامراجی قوتیں، ایک وقت میں ناقابل تسخیر سمجھی جاتی تھیں، لیکن بالآخر وہ بھی مٹ گئیں۔ آج بھی عالمی طاقتوں کے عروج و زوال کا یہی سلسلہ جاری ہے، اور تاریخ گواہ ہے کہ حقیقی بقا صرف اللہ کو حاصل ہے، اور جو بھی اس ابدی حقیقت کو فراموش کرتا ہے، وہ فنا کے عمل سے گزر جاتا ہے۔

انفرادی سطح پر بھی انسان کی زندگی اسی اصول کے تحت چلتی ہے۔ ہر فرد کی پیدائش اللہ کے حکم سے ہوتی ہے، وہ دنیا میں کچھ عرصہ گزار کر واپس اپنے رب کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ کوئی انسان چاہے کتنی ہی ترقی کر لے، علم و دولت میں کتنا ہی آگے بڑھ جائے، لیکن آخر کار اسے اللہ کی طرف پلٹنا ہے۔ یہ سفر درحقیقت اسی حقیقت کا عکس ہے کہ اللہ اول بھی ہے اور آخر بھی، اور انسانی تاریخ اس کی ایک مسلسل گواہی ہے۔

جدّت یا قدامت۔ اسلام کی نظر میں

قرآن کی یہ آیت "اے رسول، ان لوگوں کو بشارت دے دو جو ہر نئی بات سنتے ہیں اور پھر اس میں سے اچھی بات عمل کرتے ہیں، یہی لوگ عقل مند ہیں" (الزمر:18) ہمیں بتاتی ہے کہ انسان کو ہمیشہ نئے خیالات، طریقوں اور حکمت کو سننا چاہیے، اور پھر جو بات بھی اچھی ہو، اسے قبول کرکے اپنی زندگی میں نافذ کرنا چاہیے۔ یہ آیت دراصل ایک گہری حکمت پر مبنی ہے جو انسان کو ہر وقت سیکھنے، ترقی کرنے اور اپنے افکار کو وسیع کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ ہم اپنے دماغ کو کھلا رکھیں، تاکہ نئے خیالات اور سچائیوں کو گلے لگا سکیں۔ یہاں پر عقل کا استعمال بہت اہم ہے کیونکہ جو شخص عقل مند ہوتا ہے، وہ ہر نئے موقع کو ایک سبق سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔

اس کے برعکس، وہ لوگ جو صرف اپنے آبا اجداد کے طریقوں پر ہی چلنے کی بات کرتے ہیں، وہ حقیقت میں تبدیلی سے ڈرتے ہیں اور اپنی ترقی کو روک لیتے ہیں۔ قرآن میں ایسے لوگوں کے بارے میں بھی ذکر ہے جو اپنی پرانی روایات یا جاہلانہ طریقوں پر ہی اڑ جاتے ہیں اور اس کا یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ حقیقت سے منحرف رہتے ہیں۔ "جاہل لوگ کہتے ہیں کہ ہم بس اپنے آبا و اجداد کے طریقوں پر ہی چلیں گے" (لقمان: 21)۔ اس آیت میں ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ جب انسان نیا علم یا طریقہ سیکھنے سے انکار کرتا ہے تو وہ اپنی ترقی کی راہ کو خود

روک لیتا ہے۔ دین اسلام میں بھی یہ حکم ہے کہ انسان اپنی سوچ اور عمل میں ہر وقت بہتری لانے کی کوشش کرے تاکہ وہ دنیا و آخرت میں کامیاب ہو سکے۔

یہ دونوں آیات ہمیں اس بات کی طرف متوجہ کرتی ہیں کہ نہ صرف نئے تجربات اور خیالات کو اپنانا چاہیے، بلکہ ہمیں اس میں سے اچھے اور مفید پہلوؤں کو اپنانا چاہیے اور اپنے افکار کو وسعت دینی چاہیے۔ جو لوگ نئے راستوں کو اپنانے میں ڈرتے ہیں، وہ دراصل اپنی فطری عقل اور فہم کا استعمال نہیں کرتے۔ قرآن ہمیں بار بار اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ ہم کسی بھی علم یا حکمت سے فائدہ اٹھانے سے نہ ڈریں، بلکہ اس میں جو اچھائی ہے، اسے اپنے عمل میں ڈھالیں۔

اس تناظر میں، ہمیں اپنی زندگی میں نئے چیلنجز اور تجربات کا سامنا کرتے ہوئے ان سے سیکھنا چاہیے، تاکہ ہم اپنی ذات کی بہتر تشکیل کر سکیں اور دنیا و آخرت میں کامیاب ہو سکیں۔

جو لوگ نئی باتوں کو قبول کرنے میں ڈرتے ہیں، ان کے نفسیاتی تجزیے میں ہم دیکھ سکتے کہ اس خوف کی جڑیں عموماً عدم تحفظ، ماضی کی ناکامیوں، یا پھر خود اعتمادی کی کمی میں چھپی ہوتی ہیں۔ ایسے افراد کے ذہن میں یہ خیال بیٹھ جاتا ہے کہ اگر وہ کسی نئی بات یا تجربے کو اپنائیں گے تو ممکنہ طور پر وہ ناکام ہو سکتے ہیں یا وہ اس نئے ماحول میں خود کو ٹھیک سے ڈھال نہیں پائیں گے۔ یہ خوف اکثر ماضی کی مشکلات یا ناکامیوں سے پیدا ہوتا ہے، جب کسی نئے اقدام

نے برا نتیجہ دیا ہو یا انہیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ اس سے ان کی سوچ میں ایک طرح کی محدودیت پیدا ہو جاتی ہے جو نئے خیالات یا تبدیلیوں کو اپنانے میں رکاوٹ بنتی ہے۔

ایسے افراد کی نفسیاتی حالت میں خوف اور اضطراب کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ وہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اگر وہ اپنے موجودہ معمولات یا طریقوں کو چھوڑ کر کچھ نیا آزمائیں گے تو ان کی زندگی میں عدم استحکام آسکتا ہے یا وہ اپنے کسی اہم مقصد میں کامیاب نہیں ہو پائیں گے۔ یہ صورتحال ان کے ذہن میں ایک طرح کی مایوسی اور بے چینی پیدا کرتی ہے جس کی وجہ سے وہ نئے تجربات یا سوچ کی طرف قدم بڑھانے سے ہچکچاتے ہیں۔

اس کے علاج کے لیے سب سے پہلے ضروری ہے کہ انہیں یہ سمجھایا جائے کہ خوف اور اضطراب ایک فطری انسانی ردعمل ہے، لیکن اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ ایک موثر علاج میں خود اعتمادی کو بڑھانے اور ماضی کی ناکامیوں کو سبق کے طور پر دیکھنے کی تربیت شامل ہونی چاہیے۔ انہیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ہر نیا تجربہ یا خیال ان کی ترقی کا ایک موقع ہے اور اس سے سیکھنے کی اہمیت کو اپنانا ضروری ہے۔ ان افراد کے لیے تدریجی تبدیلی کی مشق کرنا بھی مفید ثابت ہو سکتی ہے، یعنی انہیں چھوٹے قدموں سے نیا کچھ آزمانا سکھایا جائے تاکہ ان کے اندر خود اعتمادی پیدا ہو سکے اور وہ اس تبدیلی کو کم خوف کے ساتھ اپنانا شروع کر سکیں۔

مزید برآں، ذہنی سکون اور اضطراب کو کم کرنے کے لیے مراقبہ، ذہنی سکون کی مشقیں اور مثبت سوچ کو فروغ دینے والی تکنیکیں بھی بہت فائدہ مند ہو سکتی ہیں۔ ان کے لیے یہ

ضروری ہے کہ وہ ماضی کی ناکامیوں کو ایک موقع کے طور پر دیکھیں، نہ کہ اپنی تقدیر یا شخصیت کی حیثیت سے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک معاون ماحول بھی اہم ہے، جہاں افراد کو اپنی کوششوں کی کامیابی کی توقع کی جائے اور انہیں اپنی غلطیوں سے سیکھنے کا موقع ملے۔ یہ تمام اقدامات ان کے خوف کو کم کرنے اور نئی باتوں کو قبول کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

اس حوالے سے ائمہ معصومین (علیہم السلام) کی احادیث میں بہت سی گہرائیاں موجود ہیں جو ہمیں سکھاتی ہیں کہ انسانی زندگی میں ترقی اور اصلاح کا عمل کبھی بھی رکا نہیں رہنا چاہیے۔ ائمہ معصومین (علیہم السلام) نے ہمیشہ اپنی امت کو نئے علم، درست راستے، اور اصلاحی اقدامات اپنانے کی ترغیب دی ہے۔ یہ احادیث ہمیں یہ سمجھاتی ہیں کہ نئے خیالات اور جدید طریقوں کو اختیار کرنا کسی بھی طور پر منفی نہیں ہے، بلکہ یہ انسان کے فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہے۔

امام علی علیہ السلام کی ایک مشہور حدیث ہے جس میں انہوں نے فرمایا، "علم انسان کی طاقت ہے، اور جو شخص اسے حاصل کرتا ہے، وہ دنیا اور آخرت میں کامیاب ہوتا ہے۔" اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ علم کا حصول، خواہ وہ قدیم ہو یا جدید، انسان کی روحانیت اور معاشرت میں بہتری لانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ امام علی (علیہ السلام) کا یہ فرمان اس بات کو واضح کرتا ہے کہ انسان کو ہر وقت نئے علم کو اپنانا چاہیے، کیونکہ یہی علم انسان کی فکری اور عملی ترقی کے دروازے کھولتا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے بھی فرمایا ہے، "ہر نیا علم اور ہر نئی بات جو آپ کے سامنے آئے، اس میں غور و فکر کریں اور بہترین راستے کو اختیار کریں۔" یہ حدیث ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ ہمیں اپنی فکری حدود کو وسیع کرنا چاہیے اور جو بات بھی سامنے آئے، اسے بہتر طور پر سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہاں تک کہ امام علی (علیہ السلام) نے اپنی زندگی کے تمام تجربات اور مشوروں میں ہمیشہ جدید حالات اور بدلتی ہوئی دنیا کے تقاضوں کو اپنانے کی اہمیت پر زور دیا۔

اسی طرح، امام حسین علیہ السلام کا یہ فرمان بھی اہم ہے: "جو انسان نیا کچھ سیکھنے سے گریز کرتا ہے، وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔" یہ بھی ہمیں بتاتا ہے کہ اگر ہم نئے خیالات اور عمل کو قبول نہیں کرتے، تو ہم اپنی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں۔ امام حسین (علیہ السلام) کی شہادت اور ان کا پیغام بھی ایک نئے تصور اور نیا راستہ دکھانے کا پیغام ہے، جس میں انہوں نے اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے نئی صورتحال کا مقابلہ کیا۔

درحقیقت، ائمہ معصومین (علیہم السلام) کی یہ تعلیمات ہمیں اس بات کی طرف مائل کرتی ہیں کہ انسان کو نئے خیالات اور جدید اصولوں کو قبول کرنے میں خوف یا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرنی چاہیے۔ اس کے بجائے، ہمیں ہر نئی بات کو ایک موقع کے طور پر دیکھنا چاہیے جو ہمیں ترقی، اصلاح اور معاشرتی بہتری کی طرف لے جائے۔ ان کی احادیث میں یہی پیغام ہے کہ علم، سیکھنا اور ترقی انسان کی فطرت کا حصہ ہیں اور ان سے فرار اختیار کرنا کسی بھی صورت میں فائدہ مند نہیں ہے۔

اسلام میں علم اور نیا نظریہ سیکھنے کی ترغیب دی گئی ہے، لیکن یہ بات بھی اہم ہے کہ انسان کو ہوشیاری سے کام لینا چاہیے تاکہ وہ غلط راستے پر نہ چلا جائے، خاص طور پر جب نئے نظریات یا علم کے پیچھے شیطان کی چال یا کسی مغربی اثرات کا کردار ہو۔

اسلامی تعلیمات میں ہمیں ہر نیا علم یا نیا نظریہ قبول کرنے کی اجازت ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ ہدایت بھی دی گئی ہے کہ ہمیں اسلام کے اصولوں اور قوانین کے خلاف نہیں جانا چاہیے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا، "کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ کی آیتوں پر ایمان لانے والے لوگوں کو جب انہیں نئے خیالات اور آراء پیش کی جاتی ہیں تو وہ ان میں سے اچھائی اور سچائی کو قبول کرتے ہیں اور باقی کو رد کرتے ہیں" (الزمر: 18)۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کو نئے خیالات میں سے صرف وہی باتیں اپنانی چاہئیں جو اسلام کے اصولوں سے ہم آہنگ ہوں اور جو شیطان کی وسوسوں سے بچ کر اللہ کی رضا کی طرف رہنمائی کریں۔

اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ کسی بھی علم کو سیکھتے وقت ہمیں اپنی شناخت، ایمان اور اخلاقی اصولوں کو محفوظ رکھنا چاہیے۔ نئی بات یا نیا علم سیکھنے میں خطرہ یہ ہو سکتا ہے کہ شیطان انسان کو اپنے راستے سے بھٹکانے کے لیے ان خیالات کو پیش کرے جو دین کے اصولوں سے متصادم ہوں یا جو انسان کو اخلاقی یا روحانی طور پر کمزور کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں جب نیا علم سیکھنا ہو، تو اسے پرانی اسلامک تعلیمات اور قرآن و حدیث کی روشنی میں پرکھنا ضروری ہے۔

جہاں تک مغربی طاقتوں یا نیو کالونیل اثرات کی بات ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ جدید دور میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے ساتھ مغربی تہذیب اور ثقافت بھی اپنے اثرات بڑھا رہی ہے۔ ان اثرات کے تحت، بہت سے افراد مغربی ثقافت کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، اور اپنی روایات، اقدار اور دین سے غافل ہو جاتے ہیں۔ اس میں خطرہ یہ ہے کہ انسان اپنی تہذیب اور دینی شناخت کو بھول جائے گا اور مغربی یا غیر اسلامی اقدار کو بلا سوچے سمجھے اپنانا شروع کر دے گا، جو کہ اسلام کے اصولوں سے متصادم ہو سکتا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا، "اور کبھی تمہیں یہ گمان نہ ہو کہ جو لوگ کفر کرتے ہیں وہ دنیا میں کامیاب ہیں، ان کے لیے آخرت میں عذاب ہے" (آل عمران: 196)۔

اسلامی قوانین اور اصولوں کی پابندی ایک ریڈ لائن کی مانند ہے، جو ہمیں بتاتی ہے کہ ہمیں علم اور ترقی کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے اسلام کی تعلیمات سے ہٹنا نہیں چاہیے۔ ہمیں یہ سمجھنا ہو گا کہ جدیدیت یا ترقی کا مقصد صرف دنیاوی فوائد حاصل کرنا نہیں، بلکہ انسان کی روحانیت اور اخلاقی سطح کو بلند کرنا ہے۔ لہذا، نیا علم سیکھتے وقت ہمیں اپنی دینی تعلیمات، اسلامی اخلاقیات، اور تہذیب کی بنیاد پر فیصلہ کرنا چاہیے کہ کون سا علم ہمارے دین اور عقیدہ کے مطابق ہے، اور کون سا صرف دنیاوی مفادات کے لیے ہو سکتا ہے جو انسان کو روحانی اور اخلاقی اعتبار سے نقصان پہنچائے۔

یہ ریڈ لائن تب ہی محفوظ رہتی ہے جب انسان اپنے ایمان، اپنے دین اور اپنے اخلاقی اصولوں کے ساتھ سچائی کو اپناتا ہے اور جھوٹ یا غیر اسلامی خیالات سے بچتا ہے۔ اس کا

مطلب یہ نہیں کہ انسان جدید علم سے دور رہے، بلکہ یہ ہے کہ اسے ہر بات کو علم کی حقیقت کے ساتھ پرکھ کر اپنی زندگی میں شامل کرے تاکہ وہ اسلام کے راستے سے بھٹک نہ جائے۔

جدید اور قدیم افکار دونوں اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں، لیکن ان کی اہمیت کو سمجھنے اور درست طریقے سے استعمال کرنے کے لیے ہمیں ایک توازن قائم کرنا ضروری ہے۔ قدیم افکار میں اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہمارے تاریخی ورثے اور ثقافت کا حصہ ہیں، اور ان میں وہ حکمت بھی چھپی ہوئی ہے جو ہماری زندگی کے بنیادی اصولوں کی تشکیل کرتی ہے۔ اسلامی تعلیمات، جیسے قرآن و سنت، نے جو اخلاقی اصول، عدلیہ، اور معاشرتی انصاف کی بنیاد رکھی ہے، وہ قدیم افکار کی عکاسی کرتی ہیں اور ان کو نظر انداز کرنا یا ان سے انحراف کرنا اسلامی روایات کے خلاف ہوگا۔

دوسری جانب، جدید افکار اور سائنسی ترقی نے ہمارے دنیاوی مسائل کو حل کرنے میں بے شمار امکانات فراہم کیے ہیں، خاص طور پر ٹیکنالوجی، میڈیکل سائنس، اور دیگر شعبوں میں۔ جدیدیت ہمیں نئے امکانات اور سوچ کی آزادی فراہم کرتی ہے، مگر ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ ترقی ہمارے اخلاقی اور دینی اصولوں کے مطابق ہو۔

جب ان دونوں کے درمیان مماثلت تلاش کرنے کی بات آتی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم وہ جدید نظریات اور تکنیکیں اپنائیں جو ہمارے دینی اصولوں سے متصادم نہ ہوں۔ مثلاً، سائنس اور ٹیکنالوجی کا استعمال انسانیت کی خدمت کے لیے کیا جائے، نہ کہ اس کے

نقصان کے لیے۔ جدید تعلیمی نظام میں وہ طریقے اپنائے جائیں جو اسلامی اخلاقیات کے مطابق ہوں، اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے ہوں۔ اس طرح ہم قدیم اور جدید کے درمیان توازن قائم رکھ سکتے ہیں۔

جہاں تک بری چیزوں کا تعلق ہے جو دونوں میں چھوڑ دینی چاہیے، تو اس میں سب سے اہم وہ خیالات اور نظریات ہیں جو انسانیت کی فلاح کے بجائے اس کے نقصان کا باعث بنیں۔ جیسے کہ وہ غیر اسلامی نظریات یا فلسفے جو فرد کی روحانیت یا اخلاقی اقدار کو نقصان پہنچائیں، یا وہ خیالات جو انسان کو اخلاقی سطح پر پست کر دیں۔ جدید یا قدیم کسی بھی مفکر کا نظریہ اگر انسانوں کو ظلم، جبر، یا حق سے انحراف کی طرف مائل کرے، تو اسے ترک کرنا ضروری ہے۔ قدیم رسموں اور ثقافتوں میں بھی وہ پہلو جو انسان کے حقوق کی پامالی یا ظلم کو فروغ دیتے ہیں، ان کو چھوڑ دینا چاہیے۔

اس کے علاوہ، وہ نظریات جو کسی ایک مخصوص ثقافت یا گروہ کو دوسروں سے افضل سمجھتے ہیں، ان کا کوئی علمی یا اخلاقی جواز نہیں ہے اور دونوں میں سے کسی بھی دور میں ان کی کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ یہی وہ بری چیزیں ہیں جنہیں قدیم و جدید دونوں افکار میں چھوڑ دینا چاہیے تاکہ ہم ایک متوازن، اخلاقی اور روحانی ترقی کی طرف قدم بڑھا سکیں۔

غرب زدگی-احساس کمتری اور اھلبیتؑ سے دوری کا نتیجہ ہے

تیسری دنیا کے اکثر پڑھے لکھے مسلمان جب جدید تعلیم حاصل کرتے ہیں تو وہ لاشعوری طور پر مغربی فکر کے قالب میں ڈھلنے لگتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کی علمی نشوونما ایسے نظام کے تحت ہوتی ہے جو استعماری ذہنیت سے ترتیب دیا گیا ہے، جہاں علم کو ایک خاص زاویے سے پیش کیا جاتا ہے اور ہر وہ چیز جو مغربی فکر کے خلاف ہو، اسے دقیانوسی، غیر منطقی، یا ترقی میں رکاوٹ سمجھا جاتا ہے۔ اس پس منظر میں پرورش پانے والے اذہان فکری طور پر مغرب کے اسیر ہو جاتے ہیں اور اپنے مذہبی و فکری ورثے کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں۔ مکتب اہل بیتؑ، جو علم، بصیرت، اور حقیقی آزادی کا پیغام دیتا ہے، ان کے لیے غیر متعلقہ محسوس ہونے لگتا ہے، کیونکہ ان کی فکری غذا میں وہ عناصر شامل ہی نہیں کیے گئے جو انہیں اپنی شناخت اور فکری خود مختاری کا شعور دے سکیں۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ مغرب کی ظاہری چمک دمک، اس کی سائنسی ترقی، معاشی برتری، اور میڈیا کی زبردست قوت نے ایک ایسا فریب پیدا کر رکھا ہے جو اکثر لوگوں کو حقیقت سے اندھا کر دیتا ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھ پاتے کہ جس مغرب کی تعریفیں کی جا رہی ہیں، اس کی بنیاد چوری، ڈکیتی، اور استحصال پر رکھی گئی ہے۔ یورپ کی ترقی کی تاریخ نوآبادیاتی لوٹ مار کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، پرتگال، اور دیگر استعماری طاقتوں نے

دنیا کے مختلف خطوں سے نہ صرف وسائل لوٹے بلکہ ان خطوں کے فکری، سماجی، اور تہذیبی ڈھانچوں کو بھی تباہ کر دیا۔ پاکستان سمیت بیشتر مسلم ممالک کی موجودہ بدحالی کا براہ راست تعلق اسی کالونیل ماضی سے جڑا ہوا ہے، مگر جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس حقیقت کو پس پشت ڈال کر مغربی ترقی کو ایک معجزہ سمجھ کر اس کی اندھی تقلید میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

استعمار کی سب سے بڑی چال یہ رہی ہے کہ اس نے دنیا میں ایسے علمی، سیاسی، اور معاشی نظام قائم کیے جو بظاہر خودمختاری کا تاثر دیتے ہیں، مگر حقیقت میں انہی طاقتوں کے مفادات کو محفوظ رکھتے ہیں۔ جدید کالونیل ازم کا سب سے بڑا ہتھیار مالیاتی نظام ہے، جو سودی معیشت پر قائم ہے۔ اس نظام کے ذریعے نہ صرف ریاستیں بلکہ افراد بھی غلام بنا دیے جاتے ہیں۔ بین الاقوامی مالیاتی ادارے، جیسے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک، اسی استحصالی ڈھانچے کا حصہ ہیں، جو ترقی پذیر ممالک کو ہمیشہ مقروض اور محتاج رکھتے ہیں۔ مگر المیہ یہ ہے کہ پڑھے لکھے مسلمان اسی عالمی نظام کو ایک "ناگزیر حقیقت" سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں اور اس کے خلاف سوچنے کے بجائے خود کو اس میں بہتر طور پر ڈھالنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

مکتب اہل بیتؑ کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ یہ نظام عدل کی بات کرتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو میں حقیقی آزادی کا تصور پیش کرتا ہے۔ یہ فکر ہمیں سکھاتی ہے کہ کوئی بھی قوم اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتی جب تک وہ فکری غلامی سے نجات حاصل نہ کرے۔ امام علیؑ کا یہ فرمان کہ "کسی کے غلام نہ بنو کیونکہ اللہ نے تمہیں آزاد پیدا کیا ہے" ایک ایسی بنیاد

فراہم کرتا ہے جس پر حقیقی خودمختاری کی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے۔ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ آج کے تعلیم یافتہ مسلمان اسی فکر کو غیر عملی، غیر ضروری، یا متروک سمجھ کر مغربی ماڈلز کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ وہ مغرب کی پیدا کردہ اصطلاحات جیسے "ڈیموکریسی"، "ہیومن رائٹس"، اور "فری مارکیٹ" کے جال میں پھنس کر یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ترقی کا واحد راستہ یہی ہے، حالانکہ یہ سب تصورات خود مغرب کے اپنے سیاسی اور معاشی مفادات کے تحت ترتیب دیے گئے ہیں۔

یہ مغرب زدگی دراصل ایک قسم کا احساس کمتری ہے، جو تاریخی، سماجی، اور تعلیمی محرومیوں کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔ جب کوئی قوم اپنی فکری بنیادوں سے کٹ جاتی ہے اور اپنے حقیقی نظام سے ناآشنا ہو جاتی ہے، تو وہ دوسروں کی چمک دمک سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ چمک دمک صرف سطحی ہوتی ہے، مگر چونکہ اس کے پیچھے ایک منظم پروپیگنڈا مشینری ہوتی ہے، اس لیے لوگوں کو حقیقت دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

اصل مسئلہ یہی ہے کہ ہمارے جدید تعلیم یافتہ افراد مکتب اہل بیتؑ کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ وہ نہیں دیکھتے کہ یہ مکتب ہمیں نہ صرف دنیا کی حقیقتوں سے روشناس کراتا ہے بلکہ ایک مکمل سیاسی، معاشی، اور سماجی نظام بھی دیتا ہے جو عدل، مساوات، اور انسانی وقار پر مبنی ہے۔ اگر امام علیؑ کے طرز حکمرانی، امام جعفر صادقؑ کے علمی اصول، اور امام حسینؑ کے انقلاب کو صحیح طور پر سمجھ لیا جائے، تو دنیا کا کوئی بھی استحصالی نظام ہمیں اپنا اسیر نہیں بنا سکتا۔ مگر جب فکری جڑیں کمزور ہوں اور شعور مغرب کے سانچے میں ڈھل چکا ہو، تو پھر

اپنے ہی دین اور اپنے ہی نظام پر اعتماد کرنے کے بجائے دوسروں کے ماڈلز کو اپنانے کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔

یہ صورت حال ایک بڑی فکری جنگ کا حصہ ہے۔ جدید استعماریت نے ہتھیاروں کی جنگ سے زیادہ فکری اور نفسیاتی غلامی پر توجہ دی ہے، کیونکہ یہی وہ اصل جنگ ہے جس میں جیتنے کے بعد کسی قوم کو بغیر کسی بیرونی قبضے کے بھی غلام بنایا جا سکتا ہے۔ اس غلامی سے نجات کا واحد راستہ مکتب اہل بیتؑ کی طرف رجوع ہے، جہاں حقیقی آزادی، عزت، اور خود مختاری کا مکمل تصور موجود ہے۔ جب تک مسلمان اس حقیقت کو نہیں سمجھیں گے، وہ اسی احساس کمتری میں مبتلا رہیں گے اور مغرب کے کھوکھلے نظام کے پیچھے بھاگتے رہیں گے، جو خود اپنی بنیادوں سے کھوکھلا ہو چکا ہے اور جس کی حقیقت جلد یا بدیر سب پر آشکار ہو جائے گی۔

ظہور امام زمانہؑ کو نزدیک کرنے کیلئے ہمیں کیا کرنا چاہیے ؟!

امام زمانہ (عج) کے ظہور کے لیے ہر شعبہ زندگی میں کام کرنے کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہم ایک ایسے معاشرے کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کریں جو ان کے ظہور کے لیے سازگار ہو۔ اس کے لیے ہمیں اپنی ذاتی، معاشرتی، معاشی، تعلیمی، اور روحانی زندگی میں ایسے اقدامات کرنے چاہئیں جو عدل، انصاف، اخلاق، اور خداپرستی کے اصولوں پر مبنی ہوں۔

ظہورِ امام زمانہ (عج) کی تیاری کے لیے ہر شعبہ زندگی میں کام کرنے کا بنیادی اصول یہی ہے کہ ہم اپنی نیت، عمل، اور طرزِ فکر کو اس نہضت سے ہم آہنگ کریں جو امام (عج) برپا کریں گے۔ اس کے لیے سب سے پہلے فرد کی اصلاح ضروری ہے، کیونکہ ایک صالح اور باکردار فرد ہی ایک صالح معاشرے کی تشکیل میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی علمی، روحانی، اور اخلاقی ترقی پر کام کرے تاکہ وہ اس لائق ہو کہ امام (عج) کے حقیقی پیروکاروں میں شامل ہو سکے۔

تعلیم کے شعبے میں ایسے نظریات اور اسباق کو عام کرنا چاہیے جو اسلامی تعلیمات اور عدل و انصاف پر مبنی ہوں۔ جدید علوم کا احاطہ کرتے ہوئے اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ

طلبہ کے ذہن میں حقیقی اسلامی فکر پروان چڑھے اور وہ مغربی افکار کے اندھے مقلد نہ بنیں، بلکہ اسلام کی علمی برتری کو سمجھ کر اسے اپنی زندگی میں نافذ کریں۔

معاشی میدان میں اسلامی معیشت کے اصولوں کو اپنانا ضروری ہے۔ سود، ذخیرہ اندوزی، استحصال اور ناانصافی سے اجتناب کرتے ہوئے ایسے معاشی نظام کو فروغ دینا چاہیے جو عدل، مساوات اور اخوت پر مبنی ہو۔ تجارت اور روزگار کے مواقع پیدا کرتے وقت دیانتداری اور حق و انصاف کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے، تاکہ ایک ایسے اقتصادی ڈھانچے کی بنیاد رکھی جاسکے جو امام (عج) کے عدل پر مبنی نظام سے مطابقت رکھتا ہو۔

میڈیا اور ذرائع ابلاغ میں سچائی، اخلاقیات، اور اسلام کی صحیح تصویر کشی کو فروغ دینا بے حد ضروری ہے۔ موجودہ میڈیا عام طور پر بے راہ روی، اخلاقی زوال، اور جھوٹے پروپیگنڈے کا شکار ہے، جسے درست سمت میں لانے کے لیے ایسے افراد کو آگے آنا ہو گا جو اسلامی اقدار کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ شعور اور بصیرت پیدا کریں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ سوشل میڈیا، ٹی وی، فلم اور صحافت کے ذریعے ایک ایسا بیانیہ تشکیل دیں جو امام (عج) کے ظہور کے لیے زمینہ سازی کرے اور باطل نظریات کے مقابلے میں ایک مضبوط فکری محاذ بنائے۔

سیاسی میدان میں ایسی قیادت اور طرزِ حکمرانی کو فروغ دینا چاہیے جو عدل و انصاف پر مبنی ہو۔ امتِ مسلمہ میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور فرقہ واریت، نفرت، اور تعصب کو ختم کر کے امت کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی راہ ہموار کی جائے۔ سیاست کو

ایک خدمت سمجھ کر اپنانا چاہیے نہ کہ طاقت کے حصول کا ذریعہ، کیونکہ حقیقی قیادت وہی ہے جو عدل و انصاف کے قیام کے لیے کوشاں ہو اور جس کا مقصد امت کی فلاح ہو۔

خاندانی نظام کی اصلاح بھی انتہائی اہم ہے۔ والدین کو چاہیے کہ وہ اپنی اولاد کی ایسی تربیت کریں کہ وہ دین کے سچے پیروکار اور امام (عج) کے حقیقی سپاہی بن سکیں۔ گھروں میں اسلامی اقدار کو مضبوط کیا جائے، بچوں کو دین اور اخلاقیات کی روشنی میں پروان چڑھایا جائے تاکہ وہ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کر سکیں جو ظہور کے لیے تیار ہو۔

سماجی میدان میں خدمتِ خلق کو فروغ دینا چاہیے۔ غریبوں، یتیموں، اور محتاجوں کی مدد کی جائے، عدل و مساوات کا نظام قائم کیا جائے، اور معاشرتی برائیوں کے خاتمے کے لیے جدوجہد کی جائے۔ لوگوں میں اتحاد اور بھائی چارے کو فروغ دے کر ایک مضبوط اور متحرک اسلامی معاشرے کی تشکیل کی جائے۔

ہر شخص جس بھی میدان میں کام کر رہا ہے، اسے چاہیے کہ وہ اپنی نیت کو خالص کرے، علم و عمل میں اسلامی اصولوں کی پیروی کرے، اور ہر وہ کام کرے جو امام (عج) کے مشن کے قریب لے جانے والا ہو۔ اس دنیا میں جہاں بھی اور جس بھی حیثیت میں ہو، اپنا کردار ادا کرے اور ایک ایسا ماحول بنانے میں اپنا حصہ ڈالے جو امام (عج) کے عادلانہ نظام کے قیام میں معاون ثابت ہو۔

ظہور امام زمانہ (عج) کے لیے زمینہ سازی صرف چند مخصوص شعبوں تک محدود نہیں بلکہ زندگی کے ہر پہلو میں اصلاح اور عدل و انصاف کے قیام کے ذریعے ممکن ہے۔ اس کے لیے طب اور صحت عامہ میں ایک ایسا نظام تشکیل دینا ضروری ہے جو محض مادی فوائد کے بجائے انسانی ہمدردی اور خدمت کے جذبے پر مبنی ہو۔ جدید سائنسی ترقی کو اسلامی اقدار کے مطابق استعمال کیا جائے، جہاں انسانی جان کی حرمت، علاج معالجے میں انصاف، اور غریب و نادار افراد تک سہولتوں کی مساوی فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔ طبی تحقیق میں حرام اور مشتبہ عناصر سے اجتناب کیا جائے اور اسلامی اصولوں کی روشنی میں اخلاقی طبی معیارات کو فروغ دیا جائے تاکہ ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا جا سکے جہاں صحت ہر فرد کا بنیادی حق ہو۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ترقی کرنا بھی ظہور کی تیاری میں شامل ہے۔ مسلمانوں کو سائنسی علوم میں مہارت حاصل کرنی چاہیے تاکہ امتِ مسلمہ خود کفیل ہو سکے اور دنیا کی فکری اور سائنسی قیادت میں اپنا کردار ادا کرے۔ ایسے ایجادات اور ٹیکنالوجی کو فروغ دینا چاہیے جو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے ہو نہ کہ تباہی اور استحصال کا ذریعہ۔ مصنوعی ذہانت، بائیو ٹیکنالوجی، خلائی سائنس، اور توانائی کے متبادل ذرائع جیسے میدانوں میں تحقیق کی جائے تاکہ امام (عج) کے عادلانہ نظام کے لیے ایک مضبوط علمی اور عملی بنیاد رکھی جا سکے۔

قانون اور عدالتی نظام میں اسلامی اصولوں پر مبنی انصاف کے قیام کی کوشش کی جائے۔ موجودہ عدالتی نظام میں بہت سی ناانصافیاں اور تاخیر موجود ہے، جسے ختم کر کے ایسا نظام بنایا

جائے جو فوری، غیر جانب دار، اور عدل پر مبنی ہو۔ وکلاء اور قاضیوں کو چاہیے کہ وہ اسلامی قوانین کو گہرائی سے سمجھیں اور ان کا اطلاق کریں تاکہ مظلوموں کو ان کا حق ملے اور ظالموں کو کیفر کردار تک پہنچایا جاسکے۔

عمرانیات اور سماجی خدمات میں امام (عج) کی حکومت کے طرز پر ایسے فلاحی ادارے قائم کیے جائیں جو ضرورت مندوں، یتیموں، بیواؤں، اور معذور افراد کی مدد کریں۔ فقراء کی کفالت، تعلیم، صحت، اور روزگار کے مواقع فراہم کیے جائیں تاکہ غربت اور بے انصافی کا خاتمہ ہو۔ ایسا مضبوط سماجی ڈھانچہ قائم کیا جائے جو تمام افراد کو مساوی حقوق اور مواقع فراہم کرے اور کسی بھی سطح پر طبقاتی تفریق کو ختم کیا جاسکے۔

زراعت اور خوراک کے شعبے میں حلال اور پاکیزہ خوراک کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔ مصنوعی غذائی اجزاء، حرام اور غیر صحت بخش اشیاء سے اجتناب کیا جائے۔ زراعت میں جدید سائنسی طریقوں کو اپنایا جائے تاکہ زمین کی زرخیزی میں اضافہ ہو اور امت خود کفیل ہو۔ امام (عج) کے دور میں زمین کی صحیح تقسیم ہو گی، لہٰذا ہمیں بھی ایسے اصولوں کو اپنانا چاہیے جہاں زراعت پر چند افراد کی اجارہ داری نہ ہو، بلکہ ہر فرد کو اس میں حصہ ملے۔

نفسیات اور ذہنی صحت کے شعبے میں کام کرنا بھی نہایت اہم ہے۔ آج کے دور میں انسان ذہنی دباؤ، مایوسی، اور انتشار کا شکار ہے۔ ایک ایسا ماحول بنایا جائے جہاں لوگوں کو ذہنی سکون اور قلبی اطمینان حاصل ہو۔ قرآن، دعا، اور اہل بیت (ع) کی تعلیمات کے ذریعے

انسانوں کو روحانی اور نفسیاتی سکون دیا جائے، اور ایسی ذہنی تربیت دی جائے جو انہیں حق و باطل کی پہچان اور صبر و استقامت کے ہنر سکھائے۔

حج اور زیارات کے شعبے میں اصلاح کی جائے تاکہ ان عبادات کو صحیح معنوں میں اسلامی تربیت کا ذریعہ بنایا جا سکے۔ حج اور زیارات کو محض رسوم کی حد تک محدود کرنے کے بجائے اسے ایک فکری، اجتماعی، اور عملی انقلاب کے طور پر فروغ دیا جائے، جہاں لوگ نہ صرف اللہ کی عبادت کریں بلکہ امت کی اصلاح اور اتحاد کا عہد بھی کریں۔

تعمیرات اور شہری منصوبہ بندی میں ایسے اصول اپنائے جائیں جو اسلامی طرزِ زندگی کے مطابق ہوں۔ شہروں کو اس انداز میں ڈیزائن کیا جائے جہاں مساجد، تعلیمی ادارے، لائبریریاں، اور عوامی فلاح کے مراکز زیادہ ہوں، اور غیر ضروری تفریحی مقامات یا مادیت پرستی کو فروغ دینے والے مراکز کم سے کم ہوں۔

دفاع اور سیکیورٹی کے میدان میں بھی ہمیں تیاری کرنی چاہیے۔ اسلامی اصولوں کے مطابق ایک ایسا دفاعی نظام تیار کیا جائے جو ظلم اور جارحیت کے خلاف ہو، اور اسلامی اقدار و نظریات کا تحفظ کرے۔ افراد کو جسمانی و روحانی طور پر تیار کرنا ضروری ہے تاکہ وہ امام (عج) کے لشکر میں شامل ہونے کے قابل ہوں۔

فنون لطیفہ اور ادب میں ایسے تخلیقی کام کیے جائیں جو اسلامی تعلیمات اور امام (عج) کے ظہور کی امید کو اجاگر کریں۔ شاعری، نثر، افسانہ، اور ڈرامہ کے ذریعے اسلامی اقدار کو فروغ دیا

جائے۔ موسیقی، مصوری، اور دیگر فنون کو ایسے طریقے سے استعمال کیا جائے جو معاشرتی اخلاقیات کو بہتر بنائے نہ کہ بگاڑ پیدا کرے۔

زندگی کا کوئی بھی میدان ایسا نہیں جہاں ظہور امام (عج) کے لیے کام نہ کیا جا سکتا ہو۔ ہر شعبے میں اپنے کردار کو امام (عج) کے مشن کے مطابق ڈھال کر ہی ہم اس عظیم انقلاب کے حقیقی سپاہی بن سکتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اپنے عمل، سوچ، اور نیت کو اس سمت میں استوار کریں جہاں ہم خود بھی اصلاح پذیر ہوں اور معاشرے کو بھی ظہور کی تیاری کی راہ پر گامزن کریں۔

سماجی علوم کا بنیادی مقصد انسانی معاشرت اور اس کے ارتقا کو سمجھنا اور اس کی اصلاح کرنا ہے۔ اگر ہم ظہورِ امام زمانہ (عج) کے تناظر میں سماجی علوم کا جائزہ لیں تو یہ علوم ایک صالح اور عادلانہ معاشرے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ تاریخ، عمرانیات، نفسیات، سیاسیات، اور معاشیات جیسے شعبوں میں اسلامی اصولوں کی بنیاد پر تحقیق اور اصلاح کی ضرورت ہے۔

تاریخ کو صرف ماضی کے واقعات کے طور پر نہیں، بلکہ عبرت، تجزیے اور مستقبل کی راہنمائی کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے۔ امام (عج) کے ظہور کا ایک بنیادی مقصد تاریخ کی غلطیوں کا ازالہ اور عدل و انصاف کا قیام ہے، لہٰذا ہمیں بھی اپنی تحقیق میں تاریخی حقائق کو درست زاویے سے دیکھنے اور بیان کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ

تاریخ کے اسباق سے سیکھیں اور فرقہ واریت، ظلم، اور فکری غلامی جیسے مسائل کو سمجھیں تاکہ ظہور کے لیے ایک فکری بنیاد رکھ سکیں۔

عمرانیات کے شعبے میں ایسی معاشرتی پالیسیوں کو فروغ دیا جائے جو ظلم، طبقاتی تفریق، اور استحصال سے پاک ہوں۔ اسلامی معاشرتی نظام میں باہمی تعاون، انصاف، اور ہمدردی بنیادی اصول ہیں، جنہیں عملی زندگی میں نافذ کرنا ضروری ہے۔ ہمیں ایسے پروگرام ترتیب دینے چاہییں جو معاشرے میں فلاح و بہبود، تعلیم، اور خود کفالت کو فروغ دیں تاکہ افراد کو امام(عج) کے عالمی نظامِ عدل کے لیے ذہنی اور عملی طور پر تیار کیا جا سکے۔

نفسیات کے میدان میں ایک ایسی سوچ کو پروان چڑھانے کی ضرورت ہے جو افراد کو اندرونی سکون، صبر، اور یقین عطا کرے۔ آج کے دور میں لوگوں میں اضطراب، بے یقینی اور ذہنی الجھنیں عام ہیں، جن کا علاج قرآن و اہل بیت (ع) کی تعلیمات میں موجود ہے۔ ایک ایسے سماج کی تشکیل ضروری ہے جہاں افراد اپنی روحانی و ذہنی تربیت کریں اور نفس کے فتنوں اور شیطانی وسوسوں سے محفوظ رہ سکیں، تاکہ وہ امام(عج) کے سپاہی بننے کے قابل ہوں۔

سیاسیات کے شعبے میں ہمیں ظالمانہ، استحصالی اور غیر اسلامی نظامِ حکومت سے آگاہی حاصل کر کے ایک عادلانہ نظام کی تشکیل کی کوشش کرنی چاہیے۔ امام(عج) کا عالمی نظام عدل و انصاف پر مبنی ہو گا، لہٰذا سیاسی تربیت کا مقصد بھی اسی راہ کی ہمواری ہونا چاہیے۔

مسلمانوں کو ایسی قیادت کو پروان چڑھانے کی ضرورت ہے جو ذاتی مفادات کے بجائے اجتماعی بھلائی کو مد نظر رکھے اور امت کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کر سکے۔

معاشیات کے میدان میں اسلامی اصولوں پر مبنی ایک ایسا نظام قائم کرنا ضروری ہے جو ظلم، استحصال، اور ناانصافی سے پاک ہو۔ سودی نظام کا خاتمہ، دولت کی مساوی تقسیم، اور روزگار کے مواقع فراہم کرنے پر توجہ دی جانی چاہیے تاکہ محتاجی اور غربت کے اسباب ختم کیے جا سکیں۔ امام (عج) کے عادلانہ نظام میں کوئی شخص ناحق دولت جمع نہیں کر سکے گا اور سب کو ان کا جائز حق ملے گا، اس لیے ہمیں بھی ایسی معاشی پالیسیوں کو فروغ دینا چاہیے جو عدل و انصاف کے اصولوں پر مبنی ہوں۔

عائلی زندگی کا استحکام ایک مضبوط اسلامی معاشرے کی بنیاد ہے۔ اگر گھر کا ماحول متوازن، پرامن، اور اخلاقی اقدار پر استوار ہو تو یہی چیز پورے معاشرے میں منتقل ہوتی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق، خاندان ایک مقدس ادارہ ہے جہاں شوہر، بیوی، والدین، اور بچوں کے حقوق اور فرائض کا مکمل تعین کیا گیا ہے۔ ظہورِ امام (عج) کی تیاری کے لیے ضروری ہے کہ گھروں میں دینداری، محبت، اور ایثار کو فروغ دیا جائے۔ والدین کو اپنی اولاد کی ایسی تربیت کرنی چاہیے جو انہیں دین، اخلاقیات، اور سماجی ذمے داریوں سے روشناس کرائے۔ بچوں کو صرف دنیاوی تعلیم تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ ان میں دینی بصیرت اور معرفتِ امام (عج) کا شعور بھی پیدا کیا جائے تاکہ وہ ایک ذمہ دار فرد بن کر معاشرے کی اصلاح میں کردار ادا کریں۔

میاں بیوی کے تعلقات کو بھی اسی زاویے سے دیکھنا چاہیے کہ ایک خوشحال اور پُرامن خاندان ہی ایک بہترین معاشرت کی بنیاد رکھ سکتا ہے۔ ازدواجی زندگی میں صبر، محبت، اور قربانی کا جذبہ ہونا چاہیے تاکہ گھریلو انتشار اور طلاق جیسی برائیوں کا سدباب کیا جا سکے۔ ایک ایسا گھرانہ جو محبت، عدل، اور دینداری کی بنیاد پر استوار ہو، وہی امام (عج) کے عادلانہ نظام کے لیے موزوں ہو گا۔

عورت کی حیثیت اسلامی معاشرے میں ایک بنیادی ستون کی مانند ہے۔ ظہور کی تیاری میں خواتین کا کردار نہایت اہم ہے، کیونکہ وہی آئندہ نسل کی تربیت کی ذمہ دار ہیں۔ ان کا علمی، روحانی، اور اخلاقی طور پر مضبوط ہونا ضروری ہے تاکہ وہ ایسی نسل پروان چڑھا سکیں جو امام (عج) کی حقیقی مددگار بن سکے۔

بچوں کی تعلیم و تربیت میں والدین کو صرف دنیاوی ترقی پر توجہ نہیں دینی چاہیے، بلکہ انہیں اسلامی اقدار سکھانے پر بھی زور دینا چاہیے۔ انہیں چاہیے کہ بچوں کو دعا، قرآن، اور احادیث سے روشناس کرائیں، انہیں حق و باطل کی پہچان سکھائیں، اور ان کے اندر احساسِ ذمہ داری پیدا کریں تاکہ وہ وقت آنے پر امام (عج) کے لشکر میں شامل ہونے کے قابل ہوں۔

عائلی زندگی میں اسلامی اصولوں کو نافذ کر کے ہم ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کر سکتے ہیں جہاں عدل، محبت، اور ہدایت کا چراغ روشن ہو، اور یہی چیز ظہورِ امام (عج) کے لیے زمینہ سازی کا ایک اہم حصہ ہے۔

ہمیں ہر حال میں موجودہ سسٹم میں صبر و استقامت کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اپنے ایمان کو مضبوط رکھنا چاہیے۔ ہمیں یہ یقین رکھنا چاہیے کہ امام زمانہ (عج) کا ظہور قریب ہے اور ہمارے اعمال ان کے ظہور کے لیے زمینہ ہموار کر سکتے ہیں۔ ہمیں اپنی زندگی کے ہر پہلو کو اس عظیم مقصد کے تابع کرنا چاہیے اور ہر قدم پر اللہ کی مدد اور امام زمانہ (عج) کی توفیق کی دعا کرنی چاہیے۔

ہر شعبہ زندگی میں ہمیں اپنے کام کو اللہ کی رضا اور امام زمانہ (عج) کے ظہور کے لیے وقف کرنا چاہیے۔ ہمیں اپنے اعمال میں اخلاص پیدا کرنا چاہیے اور ہر کام کو احسن طریقے سے انجام دینا چاہیے۔ ہمیں اپنے ارد گرد کے لوگوں کو بھی امام زمانہ (عج) کے ظہور کے لیے تیار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور انہیں اس عظیم مقصد کے لیے آمادہ کرنا چاہیے۔

چھوٹے ظالم سے بھاگ کر بڑے ظالم کی پناہ لینا

بعض افراد جو ظلم کے خلاف کھڑے ہونے کی ہمت رکھتے ہیں، کبھی بھی کسی دوسرے ظالم سے پناہ نہیں لیتے، چاہے وہ پناہ کسی اسلامی ریاست میں کیوں نہ ہو، خصوصاً اس وقت جب اس ریاست کی پالیسی ضد استعمار ہو۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ایسے افراد کا ایمان اور ان کا عزم ظلم کے خلاف ہے، اور وہ کسی ایسی جگہ پناہ نہیں لے سکتے جہاں ریاستی جبر موجود ہو اور سامراج دوستی میں اس ریاست میں ایسے مذہبی سیاسی شخصیات کیلئے خطرہ ہو جو عالمی اسلامی نظام کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں۔

اکثر ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ مسلمان، جو اسلام کے نام پر قائم ریاستوں میں ریاستی جبر اور ظلم کا شکار ہوتے ہیں، ان علامتی اور نمائشی اسلامی بیانیوں جو ریاست کی پالیسی ہوتے ہیں، کی مخالفت کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان ممالک میں اسلامی اصولوں کا نفاذ نہیں ہو سکتا۔ اس کے نتیجے میں، وہ ان ممالک کو چھوڑ کر سامراجی یا استعماری ممالک کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں، جہاں وہ بظاہر آزاد خیال اور اظہار رائے کی آزادی کا تصور پاتے ہیں۔ ان لوگوں کے ذہن میں یہ تصور ہوتا ہے کہ وہاں زیادہ آزادی اور بہتر حالات ہوں گے، حالانکہ یہ حقیقت سے بہت دور ہوتا ہے۔ ان استعماری ممالک میں اسلام کی اصل سیاسی تعلیمات کی اشاعت کرنا نہ صرف بہت مشکل ہوتا ہے بلکہ یہ ایک بہت بڑا خطرہ بھی بن جاتا ہے، کیونکہ

یہ ممالک خود سب سے بڑے ظالم اور استعماری قوتیں ہیں جو عالمی سطح پر اپنے مفادات کے لیے جابرانہ ہتھکنڈے استعمال کرتی ہیں اور اس وقت اکّا دکّا کو چھوڑ کر تمام اسلامی ریاستیں استعماری کالونیاں ہیں۔ جن کے بیانیوں سے صرف اسلام اور ظلم کے خلاف کلمات جاری ہوتے ہیں جبکہ یہ بھی علامتی ہوتے ہیں اور عملاً تو وہ عالمی نظام ظلم و استحصال کے خلاف کچھ نہیں کرتے۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ان ممالک میں جہاں یہ لوگ پناہ لیتے ہیں، وہ ریاستیں بھی ان استعماری طاقتوں کی ایجنٹ ہوتی ہیں یا خود ظالم استعمار ہوتے ہیں جو ظلم و جبر کی پرورش کرتی ہیں۔ ایسے افراد جو ظلم کے خلاف کھڑے ہونے کا عزم رکھتے ہیں، ان کے لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ پناہ لینے کی بجائے، انہیں ان جگہوں کو چھوڑ دینا چاہیے جہاں ان کا ایمان، عقیدہ اور اسلامی زندگی خطرے میں ہو۔ قرآن اور اسلام میں بھی اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ اگر کسی جگہ پر ایمان و عقیدے کا خطرہ ہو تو وہاں سے ہجرت کر جانی چاہیے۔ تاہم، یہ بات بہت اہم ہے کہ جب ہجرت کا فیصلہ کیا جائے تو وہ مقام اس سے بھی زیادہ خطرناک نہ ہو، جہاں ان افراد کا ایمان اور اسلامی اقدار مزید ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوں۔

ایسے ممالک جہاں جابرانہ نظام اور سامراجی قوتیں اپنے مفادات کے لیے کام کر رہی ہیں، وہ مسلمانوں کے لیے اسلامی تعلیمات کا فروغ ممکن نہیں رکھتے، بلکہ وہاں کسی بھی قسم کی مزاحمت اور اسلام کی اصل سیاسی تعلیمات کی اشاعت، ظلم اور جبر کا شکار کر دیتی ہے۔ اس لیے، ظلم کے خلاف کھڑے ہونے والے افراد کو اپنی ہجرت کے فیصلے میں انتہائی احتیاط

برتنا چاہیے تاکہ وہ ان جگہوں کا انتخاب کریں جو اسلامی اصولوں اور عقائد کے مطابق ہوں، نہ کہ ایسے مقامات جو دراصل ظلم و جبر کا مرکز ہوں۔

یقیناً ایسے افراد جن کا ایمان کمزور ہو اور جو ظلم برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، ان کے لیے قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی جان و مال کو خطرے میں نہ ڈالیں اور ایسی جگہوں سے ہجرت کریں جہاں ان کی ایمانی زندگی اور عقیدہ محفوظ نہ ہو۔ لیکن، اگر کوئی شخص ایسی جگہوں پر پناہ لے جہاں اس کے ایمان کو مزید خطرہ ہو، تو یہ عمل دراصل ایک بڑی غلطی ہو گا۔

قرآن اور اہلبیت (علیہم السلام) کی تعلیمات میں ظلم کے خلاف جدوجہد اور ایمان کی حفاظت پر بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ اسلام ایک ایسا نظام ہے جو کسی بھی ظلم و جبر کو برداشت نہیں کرتا اور ہمیشہ انسانیت کے حق میں قائم رہنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں ظلم و جبر ہو، وہاں سے ہجرت کرنا ضروری ہو جاتا ہے تاکہ انسان اپنے ایمان اور عقیدے کو بچا سکے، لیکن اس ہجرت کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ فرد ایک بہتر اور اسلامی ماحول میں اپنی زندگی گزار سکے، نہ کہ وہ کسی ایسی جگہ جائے جہاں اس کا ایمان اور عقیدہ مزید کمزور ہو جائے۔

اہلبیت (علیہم السلام) نے ہمیشہ ظلم کے خلاف آواز اٹھائی اور اپنے پیروکاروں کو اس بات کی تعلیم دی کہ اگر ان کا ایمان خطرے میں ہو تو وہ کسی بھی ظالم ریاست سے نکل کر ایسا راستہ

اپنائیں جہاں وہ اپنے عقائد کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ امام حسین (علیہ السلام) کا کربلا میں قیام اسی اصول پر مبنی تھا کہ ظلم کے خلاف آواز اٹھانی چاہیے اور کبھی بھی ظالم کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کرنا چاہیے۔ امام علی (علیہ السلام) نے بھی فرمایا تھا کہ "ظلم کے خلاف جدوجہد کرنا فرض ہے اور کسی بھی جابرانہ حکومت کو تسلیم کرنا گناہ ہے۔"

اسی طرح، معاصر شیعہ علما نے بھی یہ واضح کیا ہے کہ ایسی جگہوں سے ہجرت کرنا جہاں انسان کا ایمان اور عقیدہ محفوظ نہ ہو، ضروری ہے۔ تاہم، ان علما کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہجرت کا مقصد کبھی بھی کسی سامراجی یا استعماری طاقتوں کی پناہ نہیں ہونی چاہیے۔ یہ پناہ لینے والے افراد کو اس بات کا ادراک ہونا چاہیے کہ وہ ایک ایسے نظام میں جا کر اپنی تقدیر کو مزید خراب کر سکتے ہیں جہاں نہ صرف اسلامی اقدار کا احترام نہیں کیا جاتا، بلکہ وہاں کا حکومتی نظام بھی عالمی استعماری طاقتوں کے مفادات کا تابع ہوتا ہے۔

اسلام میں اس بات کی بھی تعلیم دی گئی ہے کہ اسلامی ممالک میں جہاں ظلم و جبر ہو، وہاں کے عوام کا فرض ہے کہ وہ اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے جہاد کریں۔ ایسے حالات میں، یہ انفرادی طور پر بھی ضروری ہے کہ انسان اپنے ایمان کی حفاظت کے لیے محفوظ پناہ گاہ تلاش کرے، لیکن اس پناہ گاہ کا انتخاب اسلام کے اصولوں کے مطابق ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان جب بھی ہجرت کریں، ان کا مقصد ان مقامات کی طرف ہونا چاہیے جہاں اسلامی حکومتیں اپنے اصولوں کے مطابق عمل کر رہی ہوں، نہ کہ جہاں جابرانہ نظاموں کا تسلط ہو۔

لہذا، قرآن و اہلبیت کی تعلیمات کی روشنی میں، ظلم کے خلاف اٹھنے والے افراد کو اپنی ہجرت کے فیصلے میں احتیاط برتنی چاہیے اور اس بات کو یقینی بنانا چاہیے کہ ان کا انتخاب کسی ایسے مقام کا ہو جہاں اسلامی اصولوں کا احترام کیا جاتا ہو، اور جہاں ان کا ایمان، عقیدہ اور اسلامی اقدار محفوظ رہ سکیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ افراد اپنی جدوجہد جاری رکھیں اور عالمی سطح پر استعماری قوتوں کے خلاف آواز بلند کریں تاکہ ایک حقیقی اسلامی نظام قائم کیا جا سکے جو ظلم و استحصال کے خلاف کھڑا ہو۔

یہ ایک نہایت اہم اور غور طلب نکتہ ہے کہ امام حسین (علیہ السلام) کے بعد بھی ائمہ معصومین (علیہم السلام) پر شدید مظالم ڈھائے گئے، انہیں قید و بند کی صعوبتوں میں ڈالا گیا، زہر دے کر شہید کیا گیا، اور ان کے ماننے والوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا۔ لیکن اس سب کے باوجود کسی امام نے ظلم کا بہانہ بنا کر کسی ایسی جگہ ہجرت نہیں کی جو بلادِ کفر یا استعماری طاقتوں کے زیرِ تسلط ہو، حالانکہ اس دور میں بھی سپر پاورز روم اور فارس جیسی سلطنتیں موجود تھیں، جہاں انہیں بظاہر زیادہ آزادی اور آرام کی زندگی مل سکتی تھی۔

اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ائمہ معصومین (علیہم السلام) کا مقصد محض ذاتی بقا یا سہولت نہیں تھا، بلکہ انہوں نے ہمیشہ دینِ اسلام کی بقا اور حق کے قیام کو ترجیح دی۔ وہ جانتے تھے کہ ظلم کے خلاف حقیقی مزاحمت کسی دوسری ظالم قوت کے سائے میں نہیں کی جا سکتی۔ اگر وہ ان استعماری یا کافرانہ حکومتوں میں پناہ لیتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ اپنے اصولوں سے سمجھوتہ کر رہے ہیں اور ظلم کو کسی اور شکل میں قبول کر رہے ہیں۔ ائمہ (علیہم

السلام) نے ہمیشہ اسلام کو محفوظ رکھنے کے لیے قربانی دی، لیکن کبھی بھی ظالم حکومتوں کے آلہ کار نہیں بنے۔

امام سجاد (علیہ السلام) نے اپنی زندگی کے بیشتر حصے میں یزیدی اور اموی جبر کا سامنا کیا، لیکن انہوں نے مدینہ اور مکہ کو نہیں چھوڑا، بلکہ ظلم کو بے نقاب کرنے اور امت کو شعور دینے کے لیے دعا اور تبلیغ کے ذریعے جدوجہد کی۔ امام محمد باقر (علیہ السلام) اور امام جعفر صادق (علیہ السلام) نے علمی تحریک کے ذریعے اسلامی اصولوں کی بنیادیں مضبوط کیں، باوجود اس کے کہ عباسی اور اموی حکمران ان پر ظلم کرتے رہے۔ امام موسیٰ کاظم (علیہ السلام) کو قید میں ڈال دیا گیا، لیکن انہوں نے سامراجی طاقتوں سے مدد نہیں مانگی اور نہ ہی کسی ایسی سرزمین میں جانے کا ارادہ کیا جہاں وہ ظاہری طور پر محفوظ ہوتے، مگر اپنے اصولوں سے محروم ہو جاتے۔

یہی حکمت امام رضا (علیہ السلام) کے زمانے میں بھی نظر آتی ہے، جب مأمون الرشید نے انہیں ولایتِ عہدی کی پیشکش کی تاکہ ان کی مخالفت کو ختم کیا جا سکے۔ اگر امام رضا (علیہ السلام) چاہتے تو وہ کسی غیر مسلم ملک میں جا کر اپنی جان بچا سکتے تھے، لیکن انہوں نے ایسی کوئی راہ اختیار نہیں کی، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اسلام کی بقا کا راستہ قربانی اور استقامت میں ہے، نہ کہ ظاہری امن اور مفادات کی تلاش میں۔

یہی اصول ہمیں قرآن میں بھی ملتا ہے، جہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ

"اور ظالموں کی طرف ہرگز نہ جھکنا، ورنہ تمہیں (بھی) آگ آ لے گی۔" (سورہ ہود: 113)

اسی طرح امام علی (علیہ السلام) نے فرمایا:

الظُّلْمُ أَفْحَشُ الشَّرِّ

"ظلم سب سے بدترین برائی ہے۔"

یہ تمام اصول ہمیں سکھاتے ہیں کہ ظلم کے خلاف حقیقی جدوجہد یہ نہیں کہ ہم کسی اور ظالم کے سائے میں پناہ لیں، بلکہ یہ ہے کہ ہم اپنی جگہ پر کھڑے رہیں، اپنے اصولوں پر مضبوط رہیں، اور حق کی سربلندی کے لیے قربانی دیں۔

لہٰذا، جو لوگ اسلامی ممالک میں ریاستی جبر کے بہانے استعمار کے زیرِ اثر ممالک میں پناہ لیتے ہیں، وہ درحقیقت وہی غلطی کرتے ہیں جس سے قرآن و سنت نے منع کیا ہے۔ ان کا مقصد اگر واقعی ظلم کے خلاف لڑنا ہوتا تو وہ کسی اور ظالم کے دامن میں نہ جاتے، بلکہ اپنے اصولوں پر قائم رہ کر حالات کا مقابلہ کرتے۔ ائمہ معصومین (علیہم السلام) کی سیرت یہی سکھاتی ہے کہ ظلم کے خلاف استقامت ہی حقیقی کامیابی کا راستہ ہے، نہ کہ کسی وقتی سہولت کے لیے استعمار کے ساتھ سمجھوتہ کرنا۔

یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ ظلم و جبر کا خاتمہ اور انسانوں کے حقوق کی حفاظت نیز عدل و انصاف کا قیام کسی فردِ واحد یا ایک محدود جماعت کے ذریعے ممکن نہیں، بلکہ اس کے لیے ایک مستحکم، منظم اور عدل پر مبنی حکومت کا قیام ضروری ہے۔ جب تک دنیا میں ظالم حکمران موجود ہیں، کمزور طبقات کے حقوق پامال ہوتے رہیں گے، اور انصاف کی جگہ استحصال کا نظام چلتا رہے گا۔ اس لیے ایک ایسی حکومت کا قیام، جو حقیقی اسلامی اصولوں پر مبنی ہو، سب سے مؤثر اور بنیادی وسیلہ ہے جو ظلم کے خلاف حقیقی مزاحمت کر سکتی ہے اور عدالت کو عملی شکل میں نافذ کر سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں ہمیشہ حکومت کے کردار کو بنیادی حیثیت دی گئی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"إِنَّ اللهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ"

"بے شک، اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کے سپرد کرو، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔" (سورہ نساء:58)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ حکومت ایک امانت ہے، اور اسے اہل افراد کے سپرد کرنا اور عدل کی بنیاد پر چلانا اسلامی اصولوں کا ایک لازمی تقاضا ہے۔

ائمہ معصومین (علیہم السلام) کی سیرت بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ عدل پر مبنی حکومت کے قیام کے بغیر ظلم کا مکمل خاتمہ ممکن نہیں۔ امام علی (علیہ السلام) نے جب

خلافت سنبھالی تو ان کا بنیادی ہدف ہی عدل و انصاف کا قیام تھا۔ انہوں نے اپنے خطبہ نمبر 40 میں فرمایا:

"لَوْلَا حُضُورُ الْحَاضِرِ وَقِيَامُ الْحُجَّةِ بِوُجُودِ النَّاصِرِ، لَأَلْقَيْتُ حَبْلَهَا عَلَى غَارِبِهَا"

"اگر حاضرین کا اجتماع اور مددگاروں کی موجودگی سے حجت قائم نہ ہو چکی ہوتی تو میں خلافت کو اس کے حال پر چھوڑ دیتا۔"

یہاں امام علی (علیہ السلام) واضح کرتے ہیں کہ اگر امت کے اندر قیامِ عدل کے لیے طاقت اور عوامی حمایت موجود ہو، تو خاموش بیٹھنا جائز نہیں، بلکہ عملی اقدامات کرنے ضروری ہیں۔

اسی طرح، امام حسین (علیہ السلام) نے بھی یزید جیسے ظالم کے خلاف قیام کیا اور فرمایا:

"إِنِّي لَمْ أَخْرُجْ أَشِرًا وَلَا بَطِرًا وَلَا مُفْسِدًا وَلَا ظَالِمًا، وَإِنَّمَا خَرَجْتُ لِطَلَبِ الْإِصْلَاحِ فِي أُمَّةِ جَدِّي"

"میں خروج نہ تو ذاتی مفاد، نہ تکبر، نہ فساد اور نہ ظلم کے لیے کر رہا ہوں، بلکہ میں صرف اپنی نانا کی امت کی اصلاح کے لیے نکلا ہوں۔"

یہ تمام تعلیمات ہمیں یہ سبق دیتی ہیں کہ ظلم کے خاتمے اور عدل کے قیام کے لیے سب سے مؤثر راستہ ایک عادل حکومت کا قیام ہے، جو اسلامی اصولوں پر مبنی ہو اور عوام کے

حقوق کی حفاظت کرے۔ اس کے لیے ہر زمانے میں کوشش اور جدوجہد جاری رکھنی چاہیے۔

اگر کوئی حالات کی مجبوری کی وجہ سے کسی اور سرزمین پر ہجرت کرتا بھی ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے اصل وطن میں عادل حکومت کے قیام کے لیے راستے ہموار کرتا رہے، تاکہ جب حالات سازگار ہوں تو وہاں واپس جا کر عدل و انصاف کا نظام قائم کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں ہجرت ایک وقتی اور محدود حکمتِ عملی ہو سکتی ہے، لیکن اصل ہدف ہمیشہ اپنے معاشرے میں عدل پر مبنی اسلامی حکومت کا قیام ہونا چاہیے۔

سب سے بہترین راستہ یہی ہے کہ انسان وہیں رہے جہاں ظلم ہو رہا ہو اور اسی زمین پر عادل حکومت کے قیام کے لیے ہر لمحہ جدوجہد کرے۔ یہی حقیقی اسلامی اصول ہے، اور یہی قرآن و سنت کا راستہ ہے۔ ظلم سے بچنے کے لیے کسی اور ظالم کے سایے میں پناہ لینا حل نہیں، بلکہ ظالم کے خلاف متحد ہو کر ایک منظم اور مستحکم اسلامی حکومت کا قیام ہی حقیقی حل ہے۔

انگریز چور اچکے اور ہماری معیشت کی تباہی

ہم انہی انگریز چور اچکوں سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن وہ پھر بھی ہمارے قومی خزانے کو لوٹنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں موجود ان کے ایجنٹ، جو ہمارے جیسے ہی پیشے سے وابستہ ہوتے ہیں، اس بڑے فراڈ میں انگریزوں کا پورا ساتھ دیتے ہیں اور بدلے میں اپنا کمیشن وصول کرتے ہیں۔ یہی وہ ایجنٹ ہوتے ہیں جو ہمارے ہی ملک کی دولت کو غیروں کے قدموں میں بچھانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔

یہ انگریز چور اچکے ہماری زراعت کو اپنے قابو میں لے لیتے ہیں۔ وہ ہمارے کسانوں کو ایسے بیج اور کھاد فراہم کرتے ہیں جو مصنوعی اور مہنگے ہوتے ہیں، تاکہ ہماری زمین کی زرخیزی کم ہو اور ہم ہمیشہ ان کے محتاج رہیں۔ یہ ہمارے کسانوں کو ایسے قوانین اور پالیسیوں میں الجھا دیتے ہیں کہ وہ اپنے ہی ملک میں بے بس ہو جاتے ہیں، جبکہ انگریز ہمارے کھیتوں سے سستے داموں اجناس خرید کر اپنی منڈیوں میں مہنگے داموں بیچ کر منافع کماتے ہیں۔ ہمارے زراعت کے ماہرین اور بیوپاری بھی اس گھناؤنے کھیل کا حصہ بن جاتے ہیں اور اپنی جیبیں بھرنے کے لیے اپنے ہی ملک کے کسانوں کو اندھیرے میں رکھتے ہیں۔

یہ چور اچکے ہماری کرنسی کی ویلیو کو کم کر دیتے ہیں۔ وہ ہمارے مالیاتی نظام پر قبضہ کر کے ہمیں ایسے قرضوں میں جکڑ دیتے ہیں جن سے نکلنا ممکن نہیں رہتا۔ عالمی مالیاتی ادارے

انگریزوں کے کنٹرول میں ہوتے ہیں، اور وہ ہم پر ایسے قرضے مسلط کرتے ہیں جو ہماری معیشت کو مزید کمزور کر دیتے ہیں۔ یہ قرضے عوام کے لیے نہیں، بلکہ مخصوص حکمران طبقے اور ان کے ایجنٹوں کے لیے فائدہ مند ہوتے ہیں، جو چند ٹکوں کے عوض اپنی خود مختاری بھی گروی رکھ دیتے ہیں۔ نتیجتاً، ہماری کرنسی کی قدر مسلسل گرتی ہے، مہنگائی بڑھ جاتی ہے، اور عام آدمی دو وقت کی روٹی کے لیے ترسنے لگتا ہے۔

انگریز چور اچکے ہماری صنعت کو بھی تباہ کر دیتے ہیں۔ وہ ہمیں کبھی خود کفیل ہونے نہیں دیتے۔ وہ ہمارے صنعتی ڈھانچے کو کمزور کر کے ہمیں اپنی مصنوعات خریدنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ وہ ہماری فیکٹریوں کو جدید ٹیکنالوجی سے محروم رکھتے ہیں، ہمارے صنعتکاروں پر بے جا ٹیکس عائد کرواتے ہیں، اور مقامی صنعتوں کو ترقی دینے کے بجائے غیر ملکی کمپنیوں کے لیے بازار کھول دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمارے ہنر مند مزدور بے روزگار ہو جاتے ہیں، ہماری صنعت دم توڑ دیتی ہے، اور ہم اپنے ہی وسائل سے محروم ہو کر انہی چور اچکوں سے مہنگی مصنوعات خریدنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

یہ چور اچکے ہمارا خام مال لے جاتے ہیں اور پھر ہمیں مہنگے داموں مصنوعات بیچتے ہیں۔ ہماری زمینوں سے نکلنے والے معدنی وسائل جیسے کوئلہ، سونا، چاندی، تانبا اور لوہا سستے داموں نکال کر یہ اپنے ملکوں میں لے جاتے ہیں اور وہاں ان سے جدید مصنوعات تیار کرتے ہیں۔ پھر یہی مصنوعات ہمیں کئی گنا زیادہ قیمت پر فروخت کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، ہم سوتی کپاس پیدا کرتے ہیں، لیکن یہ انگریز چور اچکے اسے خام مال کے طور پر خرید کر یورپ میں

لے جاتے ہیں، جہاں اسے مہنگے ملبوسات میں تبدیل کر کے ہمیں واپس بیچ دیتے ہیں۔ اس طرح ہماری محنت کا سارا فائدہ وہ اٹھاتے ہیں، اور ہم اپنی چیزوں کو خود استعمال کرنے کے بجائے انہیں خریدنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ہمارے ملک میں بیٹھے ان کے ایجنٹ اور وفادار غلام ان کی ہر سازش میں ان کا بھرپور ساتھ دیتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو عالمی طاقتوں کے سامنے اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہیں، ان سے قرضے حاصل کرتے ہیں، اور بدلے میں ملک کی خودمختاری کو بیچ دیتے ہیں۔ یہ وہی طبقہ ہوتا ہے جو انگریزوں کے ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے لیے پالیسیوں کو اس طرح ڈیزائن کرتا ہے کہ عام آدمی ہمیشہ مشکلات کا شکار رہے، جبکہ ان کے آقاؤں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو۔

یہ انگریز چور اچکے ہمیں ہمیشہ غلام بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ ہماری سیاست، معیشت، زراعت، صنعت، اور تعلیم پر اپنا تسلط قائم رکھتے ہیں۔ ان کے پھیلائے گئے جال میں پھنس کر ہم ہر لحاظ سے کمزور ہو جاتے ہیں، اور پھر ہماری زمینوں، ہمارے وسائل، اور ہمارے خوابوں پر یہی قابض ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم نے ان کی سازشوں کو نہ سمجھا، تو ہماری نسلیں بھی اسی غلامی کی زنجیروں میں جکڑی رہیں گی۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی معیشت، زراعت، صنعت اور تعلیمی نظام کو خودمختار بنائیں، تاکہ ہم انگریز چور اچکوں کے چنگل سے نکل سکیں اور اپنی حقیقی آزادی حاصل کر سکیں۔

S. Jahanzaib Abidi is a notable writer for article writings series who has authored several pieces on diverse topics such as education, epistemology, philosopy, culture, media, politics, economics, and society in Islamic perspective.